مرگِ برگ

تنزیلہ ریاض



مرگِ برگ

تنزیلہ ریاض

علی میاں پبلی کیشنز
20۔عزیز مارکیٹ، اُردو بازار لاہور پاکستان۔فون: 37247414

اشاعت اول ——— جنوری 2016ء
نام کتاب ——— مرگ برگ
مصنفہ ——— تنزیلہ ریاض
ناشر ——— عبدالغفار
علی میاں پبلیکیشنز، لاہور
بااہتمام ——— خالد علی
مطبع ——— حافظ پریس، لاہور
کمپوزنگ ——— زبیر کمپوزنگ، لاہور
قیمت ——— 400 روپے
قیمت بیرون ملک ——— 15 پونڈ
20 ڈالر
ISBN 978-969-517–350-3

ملنے کے پتے

خزینہ علم وادب / الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور
اشرف بک ایجنسی / اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی
رشید نیوز ایجنسی / فریئر مارکیٹ، فریئر روڈ۔ کراچی
ویلکم بک پورٹ / مین اردو بازار، کراچی

مشتاق بک کارنر / الکریم مارکیٹ اردو بازار۔ لاہور
دعا بک کارنر / امین پور بازار، فیصل آباد
علم وعرفان پبلشرز / الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
شمع بک ایجنسی / مین اردو بازار، کراچی

چلڈرن پبلیکیشنز / نزد مسجد مقدس، اردو بازار کراچی
دعا پبلشرز / الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
مکتبہ عمران ڈائجسٹ / مین اردو بازار، کراچی
فرید پبلشرز / مین اردو بازار، کراچی

علی بک سٹال / نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور
Azhar Enterprises / 315, Dickenson Road, Longsight Manchester, M13 ONR (U K)
کلاسک بکس / اندرون بوہر گیٹ، ملتان
مختار برادرز / امین پور بازار، فیصل آباد

انتساب:

ریاض احمد...... میرے پاپا کے نام!

تنزیلہ ریاض

فہرست

مرگِ برگ

ڈرامہ ختم ہوتے ہی پورا ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔

پچھلی نشستوں کے عین اوپر نصب بڑے بڑے بلب روشن ہونا شروع ہوئے۔ تاریکی بہت سُرعت سے روشنی کا لبادہ اوڑھ کر اُجالے کا روپ دھارنے لگی تھی۔ لمحہ بھر میں تمام ہال روشنی کی تیز پھوار سے بھیگ چکا تھا۔ اسٹیج پر لگا بھاری سرخ پردہ تیزی سے برابر ہونے لگا۔ تالیوں کی گونج دھیرے دھیرے دم توڑنے لگی۔ لوگ ایک کے بعد ایک گرتے پڑتے، ہنستے گاتے ایک دوسرے کو دھکا دیتے اس دروازے کی سمت بڑھنے لگے، جہاں Exit لکھا تھا۔ ہال آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا اور ایسے میں دو بھوری بے حس آنکھیں ابھی بھی ٹکٹکی باندھے سامنے کی جانب دیکھنے میں مگن تھیں۔ ان آنکھوں میں نیلگوں شعلوں کی لپک دور سے بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔

روشنیاں جل چکی تھیں۔ ہال خالی ہو چکا تھا۔ پردہ برابر ہو چکا تھا اور ڈرامہ ختم ہو چکا تھا۔ یہ کہانی وہاں سے شروع ہوئی جہاں ڈرامہ ختم ہوا تھا۔

O.....❖.....O

''اب اٹھ جائیں نا...... آٹھ بج رہے ہیں۔'' اس کی سماعتوں نے صبح صبح اسی مخصوص نرم گرم سی آواز کو سنا۔ جس کا وہ گزشتہ کئی سالوں سے عادی ہو چلا تھا۔ حالانکہ اسے یہ آواز و انداز کچھ خاص پسند نہیں تھے۔

''اب اٹھ جائیں۔'' اب کے دوسری بار پکارا گیا۔ اس بار آواز میں لاڈ کی شیرینی پہلے سے زیادہ تھی۔ اس کی ماں اس کے باپ کو اپنے مخصوص انداز میں جگا رہی تھی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی یہ بے سود ہے مگر پھر بھی وہ اپنی عادت سے مجبور تھی۔

اسے اپنی ماں کی اس عادت سے بہت چڑ ہوتی تھی۔ اسے کبھی یہ اچھا نہیں لگا تھا کہ اس کی ماں اس کے باپ کے بے جا لاڈ اٹھائے۔ وہ اپنے باپ کو کسی قسم کی رعایت کا مستحق نہیں سمجھتا تھا۔

''ایک ایسا شخص جو ساری رات گھر سے باہر رہے۔ جو گھر میں صرف سونے کے لیے آئے اور جو عیاشی کے نام پر اتنے روپے لٹائے۔ آپ اس شخص سے اتنی محبت کیسے کر سکتی ہیں؟''

وہ برملا اپنی ماں کے سامنے کہا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا باپ ان لوگوں میں سے ہے جو خود کو اور خود سے وابستہ لوگوں کو محض تنگ کرنے کے لیے ایک الگ ڈھب کی زندگی گزارتے ہیں۔ جب سارا زمانہ سوتا تھا تو اس کا باپ جاگتا تھا اور جب سارا زمانہ جاگنے کی تیاری کرتا تھا تو وہ سونے کے لیے لیٹ جاتا تھا۔

''خدارا! اب اٹھ بھی جائیں۔'' اس کی ماں کی پچکارتی ہوئی آواز پھر سنائی دی۔ اب کی بار اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

اس کی ماں کی آواز میں واضح تبدیلی محسوس ہو رہی تھی

وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کی آواز میں آیا تبدیلی آچکی ہے مگر وہ کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ یا شاید وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ وہ دوبارہ زمین کی جانب دیکھنے لگا۔ کیوں اس کے اندر سامنے دیکھنے کا شوق تھا نہ ہمت۔ وہ اپنی توجہ زمین پر بچھی گھاس کے گیلے فرش اور اس فرش پر دھرے اپنے پاؤں کی جانب مبذول کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

رات کسی پہر ہلکی بارش ہوئی تھی، جس کی وجہ سے گھاس کا قالین نم تھا۔ وہ یہاں سے اٹھنا نہیں چاہتا تھا، کچھ دیر پہلے ہی اس نے اپنے سلیپرز پاؤں سے علیحدہ کیے تھے۔ جو اس کے سامنے ہی پڑے تھے جب کہ وہ خود ٹانگیں پیٹ سے لگائے ان کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے اس طرح بیٹھا تھا جیسے جمعدارنیاں کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد بیٹھتی ہیں۔ اسے جس شخص کی وجہ سے اس طرح بیٹھنا پڑ رہا تھا وہ عین اس کے سامنے کسی نشئی کی طرح بے سُدھ لیٹا تھا۔ اس کے دل میں ایک بار پھر بیزاری کی لہر نے سر اٹھایا۔

"یہ اٹھ کیوں نہیں جاتے؟" اس نے زمین کی جانب دیکھتے ہوئے گہری سانس بھر کر سوچا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ کیا چیز اس کے باپ کو اس طرح ہوش وحواس سے بیگانہ کیے ہوئے ہے مگر وہ اس چیز کو اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے زندگی میں اپنے سوا بھی کسی کو اہمیت نہیں دی تھی۔

"یہ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہیں؟" اس نے کن انکھیوں سے اپنے باپ کی چارپائی کی جانب دیکھ کر سوچا۔ اس کی ماں بھی وہیں موجود تھی۔ ان دونوں کو گرمیوں میں کھلے آسمان تلے سونے کی عادت تھی جب کہ اس کا یہ حال تھا کہ وہ ایک گھنٹہ بھی اس طرح نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ واش روم میں بھی اے سی لگوالیتا۔ اس کی سیاہ قمیص پشت سے پسینے کے باعث بھیگ چکی تھی۔ پسینے کی ایک دھار اس کے بالوں اور کنپٹی سے ہوتی ہوئی گردن تک آرہی تھی۔ اس کے پاؤں پر مٹی اور سیاہ شلوار پر گھاس کی سبز پتیاں چپک گئی تھیں۔ اسے ان سب چیزوں سے وحشت محسوس ہو رہی تھی اور سب سے بڑا درد سر فی الحال اس کی ماں کی لاڈ بھری آواز تھی۔ جس میں لاڈ کے علاوہ بھی کوئی چیز تھی۔

"مجھے کیوں ستاتے ہیں آپ؟" اس کی ماں نے شکوہ کرنے کے ساتھ شاید اب اس کے باپ کے بالوں میں انگلیاں چلائی تھیں۔ یا شاید اس کے کندھے کو ہلایا تھا۔ وہ اب ان دونوں کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔

"آپ دونوں مل کر مجھے کیوں ستا رہے ہیں؟" اس نے دل ہی دل میں ناگواری سے سوچا۔ جھنجلاہٹ اس پر اس لیے بھی سوار تھی کہ اس کے اندازے کے مطابق اس کے ماں باپ اپنے بیڈروم میں سوئے تھے اور اب وہ لان میں تھے۔

"یہ لاؤنج میں بھی تو آرام فرما سکتے ہیں۔" وہ ایک بار پھر بڑبڑایا۔

اس کے سامنے پڑے سلیپرز اسے منہ چڑاتے محسوس ہو رہے تھے۔ بارہ سو کے یہ سلیپرز اس نے مری سے خریدے تھے۔ ان سلیپرز میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیدر کے Patches والے یہ سلیپرز اسے پہلی نظر میں بہت خاص لگے تھے۔ اس نے ہمیشہ کی طرح سوچے سمجھے بغیر انہیں خرید لیا تھا۔ اسے ہر کام اسی طرح بغیر سوچے سمجھے کرنے کی عادت تھی۔

"یہ بارہ سو کے سلیپرز ہیں......؟ غضب خدا کا...... اتنے مہنگے سلیپرز...... تمہیں ان میں روٹی ڈال کر کھانی ہے۔ اتنے مہنگے سلیپرز انسان پاؤں میں نہ ڈالے، بس شیشے کی الماری میں سجا کر رکھے اور آتے جاتے دیکھتا رہے۔ تمہیں سلیپرز چاہیے تھے تو تم مجھے کہتے۔ میں تمہیں لا دیتی۔ صدر میں اسی قسم کے سلیپرز نوے روپے کے مل رہے ہیں۔"

اس کی ماں نے یہ سلیپرز دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ جانتی ہیں اسٹینڈرڈ کس چڑیا کا نام ہے۔ وہ نوے روپے کے سلیپرز جو مستو بھنگی پہنتا ہے، وہ میں پہنوں گا...... اونہہ...... ایسی چیزیں آپ کو اور آپ کے ہسبینڈ کو مبارک ہوں۔"

وہ چڑ کر بولا تھا۔ اسے اپنی ماں کی طرف داری اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس کا باپ عیاشی کے نام پر ڈھیروں روپے خرچ کرتا تھا اور اس کی ماں کوئی استفسار نہیں کرتی تھی۔ جب کہ اس کے ہزار دو ہزار خرچ لینے پر وہ بے تحاشا سوالات کرتی۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آپ لوگوں نے مجھے اسی طرح Brought up (پرورش) کیا ہے۔ اگر آپ مجھے اس طرح پرورش نہ کرتے تو میں اس طرح کا نہ ہوتا، اس لیے آپ مجھے اس معاملہ میں قصوروار مت ٹھہرایا کریں۔"

وہ باپ کے رویے سے عاجز آکر ماں کو بے نقط سناتا۔ ان سلیپرز کے لیے بھی اس نے ہنگامہ برپا کر دیا تھا اور اب یہی سلیپرز اس کے سامنے بے بس پڑے تھے اور اسے اتنے برے لگ رہے تھے کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ انہیں دور پھینک دے۔ وہ اپنے باپ کو مادی اشیاء کے ساتھ تولتا تھا۔ اس کے لیے سامنے پڑا باپ اور سلیپرز ایک برابر تھے۔ وہ ان دونوں کی جانب نہیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن نگاہیں بھٹک بھٹک کر اسی سمت چلی جاتیں۔ وہ اس ساری صورت حال سے زچ ہوا جا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے اس منظر سے ہٹ جانا چاہتا تھا مگر اسے یہ ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ دھوپ کی شدت میں تیزی آرہی تھی۔ سورج نے تلواروں جیسی کرنیں نیاموں سے نکال کر گویا حملہ سا کر دیا تھا۔ اس کے باپ کی چارپائی کے گرد پیڈسٹل فین پوری رفتار سے چل رہا تھا۔

پنکھے کی گھرر گھرر اس کے سر پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگ رہی تھی۔ فضا میں ہوا کی ذرا سی بھی رمق نہیں تھی جس کی وجہ سے کھلی ہوا میں بھی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

"خدا کے لیے اب اٹھ جائیں۔ میرے ساتھ یہ سب مت کریں۔" اس کی ماں کی آواز پر سسکیاں غالب آرہی تھیں۔

اس کا باپ اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا مگر وہ خود جو اپنے باپ کے بستر سے دس قدم کے فاصلے پر بیٹھا تھا، یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے ساتھ بیٹھے صفدر نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا پھر گہرا سانس بھر کر دوبارہ نظریں جھکا لیں۔ صفدر کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کی سرخ آنکھوں سے نظریں چرا کر وہ سلیپرز پہننے لگا۔ صفدر کے ساتھ عمر ربیط اور شاہ نواز اسی پوزیشن میں بیٹھے تھے۔ اسے اکبر کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ سلیپرز پہن کر وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتا سرخ پتھروں کی روش پر آ گیا، روش کی دوسری جانب گھاس کا ایک نسبتاً چھوٹا قطعہ تھا۔ رئیس اور اکبر شامیانہ لگانے میں مصروف تھے۔ ان دونوں کے وجود سے عجیب طرح کا اضطراب ٹپک رہا تھا۔ ایک جانب انکل صدیق ہاتھ باندھے ماموں عنایت اللہ کے پاس کھڑے تھے۔ انکل صدیق جنہیں صرف وہی ان کے اصلی نام سے پکارتا تھا، نہ جانے کب آئے تھے۔

"آج واقعی ہم سب کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔" انہوں نے اسے گلے لگا کر کہا تھا۔ ان سب کو نظرانداز کر کے وہ گیراج کی سمت بڑھا، جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ سلور گرے سوک اس نے کچھ عرصہ پہلے ہی لیز کروائی تھی۔ اس کے عقب میں اس کی ماں کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔

"میرا بچہ۔" اسے یک دم کسی نے گلے لگایا اور اس کی پشت کو سہلایا تھا۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔" کوئی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے اس کے باپ کی موت کا دلاسا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

O......❖......O

شاید 80ء کی بات ہے کہ اس پر لاہور جانے کا جنون سا طاری ہو گیا۔ تب لاہور واقعی ۔''لہور'' ہوا کرتا تھا۔ لہوریوں کو دبئی، سعودیہ جانے اور ریالوں اور درہموں کا نیا نیا چسکا لگا تھا۔ سو طرزِ زندگی تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔

ڈیفنس اور گلبرگ جیسی ہاؤسنگ سوسائٹیوں کی رُونمائی ہو چکی تھی جب کہ ماڈل ٹاؤن، جوہر ٹاؤن اور کینال ویو جیسی سوسائٹیاں تکمیل کے مرحلے سے گزرنے کے لیے حجلۂ عروسی میں پہنچنے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ یہ سب آپس میں اگرچہ دیورانیاں، جیٹھانیاں تھیں مگر ان کی سوکنوں۔ یعنی کرشن نگر، دھرم پورہ، گڑھی شاہو اور اندرون شہر پکے لہوریوں سے آباد وہ تمام علاقے جن کے باسی دھڑلے سے ''ز'' کو ''ژ'' بولتے تھے کا پلڑا زیادہ بھاری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شہر کی سڑکوں پر گاڑیوں کے ساتھ ساتھ تانگے اور رنگین بگھیاں کثرت سے نظر آتی تھیں۔ جب کہ انارکلی بازار میں چست برقعوں میں ملبوس مٹرگشت کرتی خواتین کی تعداد جدید ملبوسات والی خواتین سے زیادہ ہوا کرتی تھی۔ ایسے میں جب اس پر لاہور جانے کا جنون طاری ہوا تو اماں جی نے چولہے کے سامنے بیٹھے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ حیرانی سے تقریباً فوت ہوتی ہوئی بھابی تیزی سے بھینس کا دودھ دوہنے لگی اور ابا جی نے دو دبکے دے کر اس کے اس جنونی غبارے سے ہوا نکال دینا چاہی مگر وہ بھی ابا جی کا ہی بیٹا تھا۔ سو اڑیل گھوڑے کی طرح ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر ہنہنانے لگا لیکن ابا جی نے صاف انکار کر دیا۔

''بیٹے! پردیس بھیجنے کے لیے پیدا نہیں کیا تھا میں نے۔'' انہوں نے کڑکتے ہوئے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ ان کے سخت لہجے سے خائف ہو کر خاموش ہو گیا مگر دوسرے کئی حربے ابھی اس کی زنبیل میں تھے۔ سو وہی آزمانے شروع کر دیئے۔ ایک دن گزرا، دو دن گزرے، تیسرا بھی گزر گیا۔ چوتھے دن اماں جی سے صبر نہ ہو سکا۔

''میں نے کہا جی، وہ تین دن سے کچھ نہیں کھا رہا۔'' وہ ابا جی کی چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ کر از حد پریشانی سے بولی تھیں۔ ابا جی ماچس کی تیلی پر روئی لگائے اسے تیل میں بھگو کر کان صاف کرنے میں مگن تھے۔ اپنے ہی دھیان میں بولے۔

''اسے جو کے آٹے اور گڑ کی میٹھی چُوری بنا کر دے...... دیسی گھی دبا کر (دل کھول کر) ڈالنا...... دیکھنا مزے سے کھانے لگے گا...... گرمی ہو گئی ہے...... چُوری دیکھے گا تو خوشی سے کھا لے گا۔''

اماں جی نے اس آزمودہ نسخے پر سر تو ہلایا مگر دل سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ گرمی ہوتی تو لسی کے گلاس سے دور ہو جاتی۔ ان کا دل تو اس بات پر افسردہ تھا کہ صبح ان کے ہونہار سپوت نے لسی کا ایک ہی گلاس پیا تھا اور دوسرا واپس کر دیا تھا۔ ان کا ممتا بھرا معصوم دل ڈیڑھ لیٹر کی پیپسی جتنے بڑے گلاس کو اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔

''اگر چُوری سے گرمی دور نہ ہوئی؟'' انہوں نے ایک اور سوال کیا۔ کان کھجاتے ابا جی جوش میں آ کر زیادہ زور سے تیلی گھما بیٹھے تھے۔ سو جھنجلا کر اماں جی پر چڑھ دوڑے۔

''اوئے نہ دور ہوئی تو مجھے باندھ کر دے دینا، قصائی کو دے آؤں گا، حلال کر دے گا وہ، ہمیں کس چیز کی کمی ہے اور دلا دوں گا تجھے......''

''ہئے ہئے...... کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ...... یہ عمر ہے آپ کی...... گھر میں بہو ہے، جوان بیٹے ہیں اور آپ کو ہری ہری سوجھ رہی ہے۔''

وہ انگلی منہ میں داب کر لال سرخ ہوتے ہوئے بولی تھیں۔ ابا جی نے ناک چڑھا کر ان کی اس ادا کو دیکھا۔ یہ طعنہ تو ان کی زوجہ محترمہ تب سے دیتی آ رہی تھیں، جب ان کے بیٹوں کو ''جوان'' کا مطلب بھی ٹھیک سے نہیں پتا تھا اور محترمہ بہو ابھی اس دنیا میں تشریف نہیں لائی تھیں۔

''نیا ککڑ (مرغا) لانے کے لیے بھی عمر کا دھیان رکھنا پڑتا ہے کیا...... بتاؤ، ایسا کیا کہہ دیا میں نے...... اونہہ جاہل عورت......''

وہ حد درجہ چڑ کر بولے۔ پرائمری پاس ہونے کا بہت زعم تھا انہیں۔ اماں جی کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لیں۔ ان کا مرغا واقعی کچھ دنوں سے سُست ہو رہا تھا مگر فی الوقت وہ بیٹے کا دکھڑا رو رہی تھیں۔

''میں ککڑ کی نہیں، آپ کے پتر کی بات کر رہی ہوں جو چار دن سے منہ سجا کر پڑا ہے۔ پروا ہے کوئی آپ کو...... اونہہ......''

وہ تعلیم کا طعنہ نہیں دے سکتی تھیں، سو فقط ''اونہہ'' کہہ کر واک آؤٹ کر گئیں مگر ابا جی کو جذباتی کر گئیں۔ اپنے چھوٹے بیٹے سے بہت محبت تھی انہیں۔ اللہ نے سات اولادیں دی تھیں جن میں سے پہلے اور آخری کو چھوڑ کر دو بیٹیاں اور تین بیٹے یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہوتے گئے۔ چھوٹا والا ستوانسا تھا، سو صحت کے معاملے میں باپ اور بھائی سے دبتا تھا پھر ابا جی نے اسے سکول میں ڈال دیا۔ ابا جی کا خیال تھا، یہ ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ سکول کی تعلیم نے اسے صحت کے معاملے میں بالکل ہی ماٹھا کر دیا۔ اس کے اندر مردوں والے کوئی شوق ہی نہ پیدا ہو سکے۔ عجیب زنانہ قسم کے شوق تھے اس کے۔ موٹی موٹی کتابیں پڑھتا رہتا۔ پرائمری تو اپنے گاؤں سے پاس کی پھر قصبے کے سکول سے میٹرک پاس کیا اور دو سال بعد پرائیویٹ بارہ جماعتیں بھی پاس کر لیں۔ بارہ جماعتوں کا یہی غرور اب سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

بڑے والے کو ابا جی نے بیس سال کی عمر میں بیاہ دیا مگر چھوٹا تو پَروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس کی شادی کر کے اس ذمہ داری سے بھی فراغت حاصل کر لیں مگر وہ لاہور جا کر مزید پڑھنا چاہتا تھا۔ انہیں روپے کی کمی نہیں تھی۔ زمین اگرچہ ان کی زیادہ نہیں تھی مگر قسمت کے دھنی تھے جو کاشت کرتے تھے وہ سونا بن کر نکلتا تھا، اسی لیے وہ بیٹے کی مزید تعلیم کے خلاف تھے کہ انہیں افسری تو کروانی نہیں تھی اور پھر جیسی سوکھی سڑی ان کے بیٹے کی صحت تھی، وہ ہمہ وقت انہیں احساس دلاتی تھی کہ مزید تعلیم اس کے لیے مہلک ثابت ہو گی جب کہ وہ ضد لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ انہوں نے اس سے تفصیلی بات چیت کا ارادہ کیا۔ اماں جی کو ایک طعنے سے ناک آؤٹ کر کے وہ عقبی صحن میں آ گئے۔ ان کا لاڈلا اپنی بان والی چارپائی کی پائنتی کی رسی کسنے میں مگن تھا۔ چارپائی کے فریم پر ایک ٹانگ رکھے وہ رسی کو اوپر نیچے، نیچے اوپر دھوبی کے پٹکے دیتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چولہے کے پاس پڑی چوکی پر جا کر بیٹھ گئے۔ دائیں سمت میں ان کا حقہ اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ صحن میں بھوری، سفید، چتری متری مرغیاں اور ان کے چوزے چہل قدمی میں مصروف تھے۔

''اوئے تُو لاہور جا کر کرے گا کیا؟'' اس کی پشت کو گھورتے ہوئے انہوں نے سوال داغا تھا۔

''غلیل بناؤں گا اور چڑیاں ماروں گا۔'' چارپائی کو کستے ہاتھ بس لمحہ بھر کے لیے رکے تھے اور پھر چیختی ہوئی آواز آئی تھی۔ ابا جی نے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔ گویا فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ وہ سنجیدہ ہے یا مذاق کر رہا ہے۔

''کھوتا...... یہیں مار لے...... چڑیاں مارنے کے لیے پردیس جانے کی کیا ضرورت ہے۔''

''یہاں آپ مجھے آنکھ نہیں مارنے دیتے، چڑیاں خاک مارنے دیں گے۔''

وہ منہ بنا کر دھیمی آواز میں بولا۔ دل ہی دل میں ان سے ڈرتا بھی تھا اور خواہش تھی کہ آواز ان تک پہنچ بھی جائے۔ رسیاں کسنے کے ساتھ وہ منتظر سماعتیں لیے ابا جان کی جانب سے کسی کرارے جواب کی توقع کر رہا تھا مگر کافی دیر تک کچھ سننے کو نہیں ملا۔ اس نے ذرا سی گردن موڑ کر کن اکھیوں سے ان کی جانب دیکھا اور جل کر خاک ہو گیا۔ وہ مٹی کے چولہے میں جلتے

اینڈھن سے حقے کی چلم کا پیٹ بھرنے میں مصروف تھے۔ چلم بھرنے کے بعد انہوں نے اسے بہت محبت سے حقے کی گردن پر سجانا شروع کر دیا۔

پھر وہ اپنا کام مکمل کر کے دالان میں پڑے تخت پر جا بیٹھے...... حقہ گڑگڑاتے ہوئے سرخ اینٹوں کے فرش پر دانہ چگتی مرغیوں کو دیکھنے لگے تھے۔ جیسے وہ مرغیاں نہ ہوں بلکہ دربار میں رقص کرتی حسین وجمیل کنزیں ہوں۔

جلتے کلستے ہوئے اس نے چارپائی کس کر...... پچھلی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی اور خود ہینڈ پمپ چلا کر ہاتھ منہ دھونے لگا۔ پھر تار پر لٹکتے تولیے سے ہاتھ صاف کرنے لگا۔

''یار! میں تیری اس عادت سے بہت تنگ ہوں۔ رسی کو ہاتھ لگانے سے میلا ہو گیا تھا تُو جو عورتوں کی طرح ہاتھ منہ دھونے چل دیا۔''

اس نے تولیا رسی پر پھینکا اور آگ بگولا ہوتا ان کے پاس تخت پر آ بیٹھا۔

''مجھے ایک بات بتائیں ابا جی! میں آپ کا بیٹا ہوں یا آپ کے شریکوں کا...... میری ہر بات میں کیڑے نکالنے لگتے ہیں آپ۔''

وہ چڑ کر پوچھ رہا تھا۔ ابا جی نے ایک بار پھر اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا، جب وہ لاجواب ہوتے تھے تو اسی طرح خاموش ہو جایا کرتے تھے مگر ان کی آنکھوں سے شرارت ٹپکنے لگتی تھی جو ظاہر کر دیا کرتی تھی کہ وہ اب کچھ نہیں بولیں گے۔ وہ ان کی جانب دیکھتا رہا جب کہ وہ مزے سے حقہ گڑگڑاتے رہے۔

''تُو نے کبھی حقہ پیا ہے؟'' اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر انہوں نے پوچھا تھا۔

''جی نہیں۔''

''اسی لیے تیرا مزاج اتنا کڑوا ہے۔'' انہوں نے فوراً رائے دی۔

''آپ کے مزاج سے بھی شہد نہیں ٹپکتا...... مجھ سے زیادہ کڑوا مزاج ہے آپ کا۔'' وہ ان ہی کے انداز میں بولا۔ ابا جی کے بازو کے نیچے تکیہ تھا۔ انہوں نے اس کی پوزیشن درست کی پھر ٹانگیں پھیلا کر بولے۔

''اوہ نہیں یار...... تجھے غلط فہمی ہوئی ہوگی...... تیری ماں تو یہی کہتی ہے کہ ہیں جی آپ کا مزاج تو شہد کے جیسا ہے۔''

وہ اماں جی کے لہجے کی ہو بہو نقل اتارتے ہوئے بولے۔ لفظ ''ہیں جی'' پر اسے ہنسی آ گئی۔ اماں جی انہیں مخاطب کرنے کے لیے ''ہیں جی'' ہی استعمال کرتی تھیں۔

''اماں جی کو غلط فہمی ہوئی ہوگی...... ویسے بھی آپ دونوں مسٹر اینڈ مسز ''ہیں جی'' ایک دوسرے کی خوبیوں کے بارے میں مشکوک رہتے ہیں۔''

وہ ٹانگیں سمیٹ کر تخت پر بیٹھ گیا تھا۔ ان کے پاؤں اس کی گود میں گھس رہے تھے۔ وہ چونکہ ان سے ناراضی کا اظہار کر رہا تھا، سو اس نے ان کے پاؤں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اگر اسے یہ نہ ظاہر کرنا ہوتا تو وہ فوراً ان کے پاؤں دبانے لگتا۔

''تیری ماں تیری وجہ سے پریشان ہے...... مجھے تو خیر کوئی فرق نہیں پڑتا مگر اس کی خاطر پیٹ بھر کر روٹی کھایا کر......''

وہ دھیرے دھیرے اصل بات کی طرف آ رہے تھے۔

''میری ماں آپ کی وجہ سے بھی بہت پریشان ہے...... مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا مگر ان کی خاطر یہ حقہ نہ پیا کریں آپ......''

وہ انگلیاں بالوں میں چلانے لگا تھا۔

''یار اب اس بڈھی کی خاطر حقہ پینا چھوڑ دوں میں۔''

وہ بچوں کی سی معصومیت سے بولے تھے۔ انہیں اپنے حقے سے عشق تھا۔ اس کے لیے ان کی یہ معصوم ادا نئی نہیں تھی۔ اس کا دل چاہا، ان سے لپٹ جائے مگر پھر وہی ناراضی آڑے آ گئی۔

''میں بتاؤں اماں جی کو کہ آپ انہیں بڈھی کہہ رہے ہیں؟'' وہ مسکراہٹ چھپا کر بولا۔

''ہئے پاگل نہ ہو تو...... اتنی سیانی ہے تیری ماں...... اسے خود یہ بات پتا ہوگی۔''

وہ سابقہ انداز میں بولے تھے۔ اب کی بار وہ ہنسی چھپا نہیں پایا تھا۔ انہیں اس کو اس طرح ہنستا دیکھ کر کافی طمانیت ہوئی تھی۔

''آپ کی زوجہ محترمہ کو سیانا ہی ہونا چاہیے تھا، ورنہ آپ کا گزارہ کیسے ہوتا۔''

محبت سے کہتے ہوئے اس نے ان کے پاؤں دبانا شروع کر دیئے تھے۔ ابا جی مزید پھیل کر لیٹ گئے۔

''تیری زوجہ بھی سیانی ہوگی...... نسرین ماشاء اللہ بہت سمجھ دار ہے۔''

وہ اس کی خالہ زاد بہن کا نام لے کر بولے جو اس کی منہ بولی منگیتر تھی، یعنی زبانی کلامی۔ سب کا خیال تھا کہ اس کی اور نسرین کی شادی ضرور ہوگی۔ نسرین ان کے خاندان کی واحد لڑکی تھی جو آٹھ جماعتیں پاس تھی جب کہ وہ خود اس رشتے سے دل و جان سے انکاری تھا۔ ابا جی کے منہ سے اس کا نام سن کر اس کی ناک پھولنے لگی۔ یہ اس کی ناپسندیدگی کا واضح اظہار تھا۔

''اگر ایسا کچھ ہوا تو پھر میری زوجہ بیوہ ہی ہوگی۔'' وہ ناراضی بھرے لہجے میں بولا۔

''یار! تیرا دماغ بہت پُٹھا ہے۔ نسرین سے بیاہ نہیں کرے گا تو اور کس سے کرے گا۔ اتنی اچھی ہے وہ...... بڑی سوہنی ہے...... رحمت کے بیاہ پر عنابی شلوار قمیص میں اتنی سوہنی لگ رہی تھی۔ مجھ سے تو پہچانی نہیں جا رہی تھی...... نظر نہیں ہٹ رہی تھی اس پر سے۔'' وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔

''اچھا واقعی...... اتنی خوبصورت ہو گئی ہے وہ؟''

''اور کیا۔'' ابا جی اس کی لہجے میں اشتیاق کی جھلک دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

''تو پھر آپ خود کر لیں اس سے شادی، اماں جی کو میں منا لوں گا۔'' وہ مزے سے بولا۔

''دُر فٹے منہ تیرا...... تُو واقعی کھوتا ہے۔''

وہ چڑ کر بولے تھے۔ وہ سر جھکائے ان کے پاؤں دباتا رہا۔ کچھ لمحے اسی طرح خاموشی سے گزر گئے۔

''ابا جی...... مجھے جانے دیں...... مجھے سولہ جماعتیں کر لینے دیں...... یہ میرا شوق ہے ابا جی!''

ان کے پاؤں دباتے ہوئے اب کی بار وہ خوشامدی لہجے میں بولا تھا۔ حقے کی ایک خوراک اور ناراض بیٹے سے اتنے دن بعد تفصیلی گپ شپ نے انہیں مخمور کر دیا تھا۔ ان کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

''تو چلا جائے گا تو میرے پاؤں کون دبائے گا یار! میں کیسے رہوں گا تیرے بغیر۔'' بند ہوتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ محبت بھرے لہجے میں بولے۔ ان کے لہجے میں ہتھیار ڈال دینے سے پہلے کی بے چارگی تھی۔ ایسی بے چارگی جو حریف کے حوصلوں کو بڑھا دیتی ہے۔ وہ زیادہ جوش سے ان کی ٹانگیں دبانے لگا۔

''دو تین سال کی بات ہے ابا جی!'' وہ اب زیادہ اعتماد سے بات کر رہا تھا کیونکہ ابا جی کے انداز سے نیم رضامندی

[illegible]

''[illegible] بہت دور ہے پتر!'' انہوں نے بازو سر کے گرد پھیلا کر سابقہ انداز میں کہا۔

''چاند سے نزدیک ہے ابا جی! لوگ تو چاند کی زیارت بھی کر آتے ہیں۔''

اس کا منہ پھر سوجنے لگا تھا۔ ابا جی نے اس کے ہاتھوں کے ماند پڑتے لمس کو بخوبی محسوس کیا تھا۔ ان کے دل کو عجیب سے تاسف نے گھیر لیا۔ وہ جانتے تھے۔ بالآخر انہیں ضدی بیٹے کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑیں گے مگر دل میں یہی آرزو موجزن تھی کہ کسی طرح اسے اس کے ارادے سے باز رکھ سکیں۔

''اچھا یار! کر لے اپنے دل کی۔'' لیٹنے سے پہلے انہوں نے رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

''سچ ابا جی...... تھینک یو ابا جی!'' وہ یک دم ان سے لپٹ گیا۔ ابا جی بند آنکھوں کے ساتھ مسکراتے رہے۔

اگلے دن سارے گاؤں میں شور مچ گیا تھا کہ وہ پڑھائی کے لیے ''لہور'' جا رہا ہے۔ مسماۃ نسرین اس بات کی تحقیق کرنے خود ان کے گھر تک آئی تھی۔

''مت جاؤ نا...... میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔''

اس کا راستہ روک کر اس نے آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر کر کہا تھا۔

''ہیں سچ...... بعد میں مکر تو نہیں جاؤ گی؟'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

آگے کا سفر متقاضی تھا کہ وہ پیچھے کو بھول جائے۔ سو وہ صرف تقاضے پورے کر رہا تھا۔ اس کے شوق کی تکمیل اس کے ہاتھوں کی لکیروں میں دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ والدین کی دعائیں سمیٹ کر اس نے منزل کی جانب سفر شروع کیا تھا اور یوں جب 80ء میں وہ لاہور آیا تو ان دنوں لاہور واقعی لہور ہوا کرتا تھا۔

O......❖......O

وہ ایک مہکتا ہوا دن تھا جب وہ گورنمنٹ کالج کے اقبال ہاسٹل کمرہ نمبر 7 میں پہنچا۔ بادامی باغ کے لاری اڈے سے کچہری روڈ اور پھر اقبال ہاسٹل تک اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکتا رہا۔ گاؤں والوں نے اسے راجہ اِندر بنا کر رکھا ہوا تھا، اس لیے اس کے لاشعور میں کہیں یہ خواہش دبی ہوئی تھی کہ جب وہ شہر پہنچے تو لوگ ہار پھول لے کر اس کا استقبال کریں۔ ہاسٹل کی طرف جاتے ہوئے اس کے دل و دماغ میں مسلسل تالیاں بجتی رہیں جو اس کے ہم مکتب اور اساتذہ اس کے لیے بجا رہے تھے۔ وہ شاعر یا ادیب نہیں تھا لیکن المیہ یہ تھا کہ وہ انہی کی طرح سوچتا تھا۔ اندر ہی اندر اسے کہیں غلط فہمی سی ہو گئی تھی کہ وہ ایک منفرد انسان ہے، اسی لیے اس نے اپنا سفر ایک مسافر کے بجائے ایک فاتح کی طرح شروع کیا تھا۔ اس کے ذہن میں کچھ عزائم تھے مگر ان عزائم کو پورا کرنے کے لیے اس نے خاص مقاصد طے نہیں کیے تھے۔ اسے پتا تھا کہ وہ اونچی اڑان بھرنا چاہتا ہے مگر اس کے لیے اسے پروں کو کس طرح استعمال کرنا ہے، اس چیز سے وہ یکسر لاعلم تھا۔ اسی لیے جب اس کا داخلہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوا تو اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کتنا خوش قسمت ہے بلکہ وہ اپنی یہاں موجودگی کو گورنمنٹ کالج کی خوش قسمتی سمجھتا تھا۔

پہلا دھچکا اس کو ہاسٹل پہنچ کر لگا۔ کمرے کے دروازے کے باہر ایک موٹا سا تالا منہ چڑانے کے لیے تیار تھا۔ وہ لیٹ پہنچا تھا، اس لیے کالج جا نہیں سکتا تھا۔ ہاسٹل کے باقی مکین شاید ابھی واپس نہیں آئے تھے، اس لیے کوریڈور میں سناٹا تھا۔ ریسپشن پہ اسے انتظار کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ اپنے ٹرنک پر بیٹھ کر اس کے کمرے کے دوسرے مالک کا انتظار کرنے لگا۔ اسے وہاں بیٹھے بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ پچھلے کوریڈور سے اس سے بھی زیادہ دبلا پتلا لڑکا آتا دکھائی دیا۔ وہ اس کے قریب سے گزر کر آگے کی سمت گیا اور پہلے کمرے میں گھس گیا۔ اگلے دس منٹ میں اس نے اسے دوبارہ کمرے سے نکلتے اور اپنے قریب آتے دیکھا۔

''نئے آئے ہو؟'' چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ سجا کر اس نے پوچھا تھا۔

''کمرہ لاکڈ ہے۔ میں کچھ ہیلپ کروں؟'' اثبات میں جواب پا کر وہ مزید پوچھ رہا تھا۔ وہ بے چارہ دیہاتی دل رکھنے والا اتنی ہمدردی کو ہی بہت سمجھ کر ایک بار پھر ہاں کہہ بیٹھا۔

وہ لڑکا دروازے کے قریب گیا اور تالے کو ہلا جلا کر دیکھتا رہا پھر اس کے پاس واپس آ کر بولا۔

''چائنا کا تالا ہے۔ کسی دوسری چابی سے کھولنا مشکل ہے۔ دراصل یہ سعدی کا کمرہ ہے اور سعدی بہت سڑیل ہے۔ اس کی یہاں کسی سے کم ہی بنتی ہے۔ وہ باہر جاتے وقت اپنے کمرے کی چابی کسی کو نہیں دے کر جاتا، اس لیے توڑنا ہی پڑے گا۔''

وہ خاموشی سے اس لڑکے کی شکل دیکھتا رہا۔ بلاشبہ وہ ہونق لگ رہا تھا۔

''بیس روپے کا نیا تالا آئے گا اور دس روپے اس تالے کو توڑنے کے لگیں گے۔ کل ملا کر ہوئے تیس...... ہیں......؟ توڑ دوں؟''

وہ تخمینہ لگا کر بولا۔ مثبت جواب دینے کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

''تم ریسپشن پر جا کر ہتھوڑا لے کر آؤ۔'' اس سوکھے سڑے لڑکے نے حکمیہ انداز میں کہا، وہ جانے لگا تو پھر بولا۔

''اوئے...... یار...... بات سنو...... تیس روپے تو دے جاؤ...... میں پچھلی طرف سے جا کر نیا تالا لے کر آتا ہوں۔''

اس نئے حکم پر وہ کچھ دیر سوچتا رہا، بونگا یا بدھو نہیں تھا مگر نئے ماحول اور نئے لوگوں نے مل جل کر اس کی عقل کو منجمد سا کر دیا تھا۔ اس نے قمیص کی سائیڈ والی جیب سے والٹ نکالا اور گن کر پانچ روپے کے چھ نوٹ اس کے حوالے کر دیئے اور خود ریسپشن کی سمت چل دیا۔ اسے پانچ منٹ لگے تھے واپس آنے میں اور تب تک تالا کھل چکا تھا۔

''مارشل آرٹس کا نام سنا ہے کبھی...... جاپانی کھیل کا نام ہے...... ای...... آ...... او......'' وہ لڑکا ہوا میں بازو چلا کر منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالنے لگا۔ ''ایک ہاتھ کی مار تھا۔ ہلکی سی ضرب سے کھل گیا۔'' وہ لڑکا کالر پر سے نادیدہ گرد جھاڑ رہا تھا۔ اس اہم فریضے سے فارغ ہو کر وہ اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اپنے کمرے کی سمت چل دیا۔ سامان منتقل کرنے کا مرحلہ اتنا دشوار نہیں تھا۔ ایک ٹرنک، ایک بستر بند، چند ایک ضروری برتنوں کا تھیلا اور دیہاتی سوغاتوں والا مرتبان۔ ایک کے بعد ایک چیزیں اٹھا کر اس کو کمرے میں رکھتے ابھی ساعت ہی گزری ہو گی کہ دروازہ دھاڑ سے کھلا۔ وہ بے چارا ہڑبڑا کر پلٹا۔

''ہائے ابا جی!'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ دروازے پر اونچے ڈیل ڈول والا ایک لڑکا کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ میں رجسٹر پکڑا ہوا تھا۔ ''ہائے ابا جی'' کی بانگ سن کر اس نے رجسٹر چہرے کے سامنے کر لیا پھر لمحہ بھر بعد ہٹا کر بولا۔

''نان سینس...... میں تمہیں ابا جی لگتا ہوں...... بات کرنے کی تمیز نہیں ہے تمہیں...... نام کیا ہے تمہارا؟'' وہ اس کے بالکل...... سامنے آ کر نہایت رعونت بھرے لہجے میں بولا۔

''غلام مرتضیٰ۔'' اس نے پریشانی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''باپ کا نام؟'' وہ شخص اس کے سامان کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''غلام مجتبیٰ۔'' اب وہ بالکل سیدھا کھڑا تھا۔ پریشانی تھی، بے چارگی تھی اور اب اندر ہی اندر خفگی بھی جاگ رہی تھی۔

''کتنے بہن بھائی ہو؟''

''دو۔''

''ذریعہ، آمدنی؟''

''ابا جی۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا تھا۔ وہ شخص اس سے پوچھ پوچھ کر رجسٹر میں لکھ بھی رہا تھا۔

''ابا جی کیا بینک ڈرافٹ ہیں، جنہیں بینک میں لے جا کر جمع کرواتے ہو اور رقم نکلوا لاتے ہو۔''

وہ شخص تنک کر بولا۔ اس تذلیل پر مرتضیٰ کی کانوں کی لویں سرخ ہونے لگی تھیں۔ اپنے باپ کے بارے میں وہ بہت جذباتی تھا۔ اپنے سامنے کھڑے شخص کی وجہ سے وہ پریشان ضرور ہو رہا تھا مگر اتنا نہیں کہ ہر بات برداشت کر لیتا۔

''نہیں...... میرے ابا جی میرے پرائز بانڈ ہیں جو میری ہر ضرورت پر خود بخود نکل آتے ہیں۔ بینک ڈرافٹ جیسے ابا تو اللہ ہمارے دشمنوں کو بھی نہ دے جسے نکلوانے کے لیے ٹوکن کی ضرورت پڑتی ہے۔''

وہ تڑخ کر بولا۔ معاشیات کے مضمون میں کبھی کی پڑھی گئی بات کام آ گئی تھی۔

''بکواس نہیں کرو اور عمر کے بارے میں بتاؤ۔'' وہ شخص چہرے کے تاثرات چھپا کر سابقہ لہجے میں استفسار کر رہا تھا۔

''حضرت عمرؓ دوسرے خلیفہ تھے۔ ان کے عدل کے بہت قصے مشہور ہیں۔''

اب کی بار اس نے جان بوجھ کر حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسے اپنی بات کے جواب میں قہقہہ سنائی دیا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ کیونکہ اس کے سامنے کھڑا شخص سپاٹ چہرہ لیے کھڑا تھا۔

''اوئے پینڈو...... تمہاری عمر کیا ہے......؟ ایج...... خیر سے اس سال کون سی ویں بہار بیگم دیکھنی ہے۔'' وہ اسے گھورتے ہوئے بولا تھا۔

''بیس سال کا ہوں جی، میری منگنی ہو چکی ہے اور میری منگیتر کا نام نسرین ہے۔''

اب کی بار وہ بھی تنک کر بولا تھا۔ ان کے یہاں اس قسم کے انٹرویوز تب ہی کیے جاتے تھے، جب بہن یا بیٹی کا رشتہ دینا ہوتا تھا۔ اس نے اپنی منہ بولی منگیتر کا نام بھی صرف اس لیے لیا تھا کہ اس شخص کو مزید پیش قدمی سے روک سکے۔ دراصل یہ ایک قسم کی پھبتی تھی جو اس نے پوری طاقت سے کسنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ شخص اس کے طنز سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''بلے بھئی...... یعنی کہ منگنی شدہ ہو...... آئے کہاں سے ہو؟'' اب کی بار اس شخص کے لہجے میں ذرا نرمی تھی۔

''سرگودھا۔'' اس نے جان بوجھ کر گاؤں کا نام نہیں بتایا۔

''تمہارا اٹیچی کیس کہاں ہے؟''

''نہیں ہے۔'' اس جواب پر اس شخص نے پھر اسے گھورا۔ مرتضیٰ نے کمرے میں داخل ہو کر وہ ٹرنک چارپائی کے نیچے گھسا دیا تھا۔

''کوئی بکسا وغیرہ؟''

''وہ بھی نہیں ہے۔''

''سامان کس میں رکھ کر لائے ہو؟'' انکوائری ابھی جاری تھی۔

''بس میں۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

''افوہ...... بس میں رکھنے سے پہلے کس میں رکھا تھا؟'' وہ شخص اب زچ ہونے لگا تھا۔

''ٹرنک میں۔'' مرتضیٰ ذرا کی ذرا شرمندہ ہو کر بولا۔

''کہاں ہے؟ دکھاؤ۔'' حکم دیا گیا۔

''دیکھیں جناب! کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ آپ پہلے اپنا تعارف کروا دیں آپ اتنی دیر سے مجھ سے سوال پر سوال کیے جا رہے ہیں۔ مجھے بھی تو بتایئے کہ آپ مجھ سے تھانے داروں کی طرح تفتیش کیوں کر رہے ہیں؟''

مرتضیٰ نے بہت نرمی سے سوال کیا تھا۔ وہ شخص جس طرح انٹرویو کر رہا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ واقعی اتھارٹیز میں سے ہے لیکن مرتضیٰ کو یہ بھی ڈر تھا کہ کوئی واقعی اسے پینڈو سمجھ کر بدھو نہ بنا جائے۔

''ویل...... یو آر رائٹ...... میرا نام وقاص چودھری ہے۔ میں سیکشن انچارج ہوں۔ روم نمبر 1 سے 17 تک میں ہی سب کو ڈیل کرتا ہوں۔ تم نئے آئے ہو، اس لیے صفحہ نمبر 20 پر دیئے گئے ہاسٹل کے ٹائٹل کے اندر دیئے گئے تمام کوڈز آف کنڈکٹ دوبارہ پڑھ لو۔ وہاں سب فیکلٹی کے نام اور ان کو حاصل اتھارٹی کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ میں ہاسٹل پر میسز میں جس روم میں چاہوں جا کر چیکنگ کر سکتا ہوں...... سمجھے پینڈو...... اب کھول ٹرنک......''

وہ نرمی سے بات کرتا پھر سابقہ ٹون میں بولا۔ مرتضیٰ نے یہ ساری باتیں پڑھی تھیں لیکن فیکلٹی کے نام اس کے ذہن میں نہیں تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس نے ٹرنک گھسیٹ کر چارپائی کے نیچے سے نکالا اور اس کے سامنے نامہ اعمال کی طرح کھول کر رکھ دیا۔

''پینٹ شرٹ نہیں پہنتے تم؟'' اس کی سلیقے سے کوئلوں والی استری سے پریس کیے گئے شلوار قمیصوں کو وہ بے دردی سے الٹ پلٹ کرتا بول رہا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔ اس کی نظریں اس کے ہاتھوں کی جانب تھیں جو بے دردی سے اس کی چیزوں کا پوسٹ مارٹم کر رہا تھا۔ نہ جانے وہ کیا جانچنا چاہ رہا تھا۔ وقاص چودھری کے ہاتھ اب ٹرنک کے نچلے حصے کی تلاشی لے رہے تھے۔ مرتضیٰ عجیب سی خجالت محسوس کرنے لگا تھا۔ ٹرنک کے نچلے حصے میں ذاتی ضرورت کی کچھ ایسی چیزیں تھیں جنہیں وہ نہ دیکھتا تو بہتر تھا لیکن چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔

''یہ کیا ہے؟'' بالآخر وہی ہوا جس کا مرتضیٰ کو ڈر تھا۔ اس نے بہت بے چارگی سے نظریں اٹھا کر وقاص چودھری کے ہاتھوں کی جانب دیکھا۔

''کچھا ہے جی!'' وقاص چودھری کے منہ سے قہقہہ اُبلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود وہ کاٹن کی ہاتھ سے سلی ہوئی ''نیکر'' کسی مضحکہ خیز چیز سے کم نہیں تھی۔

''بہت اچھا ہے جی۔'' وہ اس کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔

''اس کا کیا کرو گے؟'' وہ شرارتی انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''اس سے نہاؤں گا۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ اس سے زیادہ شرمندگی اب ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

''تم پانی سے نہیں نہاتے؟'' شرارت اور مسکراہٹ نے مل جل کر رعونت بھرے چہرے کو کافی نارمل کر دیا تھا مگر مرتضیٰ کو اس چہرے سے از حد الجھن محسوس ہو رہی تھی، وہ خاموش رہا۔

''اوئے ہوئے...... کام کی چیز تو اب ملی ہے۔'' اس کے ہاتھ اب ایک استرا لگا تھا۔ مرتضیٰ کو سفر کی تکان بھی تھی اور اس ساری گفتگو نے تو اسے بالکل ہی مضمحل کر دیا تھا۔

''تمہیں پتا ہے یہاں اسلحہ رکھنا منع ہے۔'' اس شخص کے لہجے میں یک دم سختی جھلکنے لگی تھی۔

''یہ اسلحہ کب ہے۔ یہ تو استرا ہے۔'' وہ تڑپ کر بولا تھا۔

''اس کو بھی ہم دیسی اسلحہ ہی کہتے ہیں۔ کیا کیا نہیں ہو سکتا ہے اس سے۔ شاہ رگ پہ محبت سے پھر جائے تو بندہ پہلی فلائٹ میں اللہ کے حضور آن ایئر چلا جاتا ہے اور تم کہتے ہو یہ اسلحہ کب ہے؟''

وہ اب استرے کو ہاتھ پر بہت احتیاط سے پھیر رہا تھا۔ اس کا پھل واقعی بہت تیز تھا۔

''یہ میں نے کسی غلط مقصد کے لیے نہیں رکھا۔ شیو کرنے کے لیے رکھا ہے۔'' وہ صفائی دینے والے انداز میں بولا تھا۔

''اوئے مجھے دغا دینے کی کوشش کرتے ہو، یہ ریزر ہے جو اس سے شیو کرو گے تم...... جھوٹ مت بولو...... سچ سچ بتاؤ اس اسلحے کا کیا کرو گے تم؟ اگر تم نے مجھے سچ بتا دیا تو میں تمہاری شکایت نہیں کروں گا، ورنہ...... شکل سے تو سمجھ دار ہی لگتے ہو۔'' وہ ایک بار پھر اسے گھورنے لگا۔

''میرا یقین کریں چودھری صاحب...... یہ شیو کرنے کے لیے ہی رکھا تھا میں نے۔ مجھے اگر پتا ہوتا......''

وہ منمنا رہا تھا مگر چودھری صاحب نے بات کاٹ دی۔

''اگر پتا ہوتا تو یقیناً تم اسے نائن ٹو الیون یعنی نو دو گیارہ کر دیتے...... ہے نا...... اچھا ہوا جو میری نظر اس پر پڑ گئی۔''

وہ شخص ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔

''میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں...... آپ......'' وہ بے چارا رونکا ہو چلا تھا۔

''ویل...... او کے...... کر لیتا ہوں یقین کہ یہ اسلحہ شیو کرنے کے لیے ہے مگر تم مجھے اس سے شیو کر کے دکھاؤ۔'' ایسے فرمائش کی گئی جیسے بچے لالی پاپ کی کرتے ہیں۔

''یہ دیکھیں، ایسے کرتے ہیں۔'' وہ استرا چہرے پر پھیر کر بولا تھا۔

''ارے یار! گلستان میں گل ہی نہیں تو گل پاشی کہاں سے ہو گی۔ اچھا ٹھہرو، مجھے سوچنے دو...... ہم......''

وہ منہ پر انگلی رکھ کر کھڑا تھا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' وہ قدرے اونچی آواز میں بولا جیسے کسی اور کو سنانا مقصود ہو۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ دروازے سے باہر نکلا۔ مرتضیٰ کو محسوس ہوا جیسے اس نے کسی کے بھاگنے کی آواز سنی ہے مگر اس نے دھیان نہیں دیا۔ صورتِ حال اس کے لیے اتنی عجیب و غریب ہو چلی تھی کہ اس کا دھیان خود بے دھیان ہو چلا تھا۔

''کمرہ نمبر 3 میں گل شیر ہے۔ اس کی داڑھی کافی بڑھی ہوئی ہے۔ اس کی شیو کر کے دکھاؤ۔'' وہ اس کو مطلوبہ کمرے کے سامنے لے جا کر بولا۔

''میں یہیں کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ فوراً واپس آؤ۔'' انداز ایک بار پھر حاکمانہ ہو چکا تھا۔ وہ بے چارا جھجکتے ہوئے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں دو چارپائیاں تھیں جس میں سے ایک خالی جب کہ دوسری پر ایک گورا چٹا لڑکا سو رہا تھا۔ اس کی شیو واقعی بڑھی ہوئی تھی۔

مرتضیٰ نے ڈرتے ڈرتے ابھی اس کے چہرے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اس شخص نے پٹ سے آنکھیں کھول کر اس کا ہاتھ

پکڑ لیا۔ ستم یہ کہ اس ہاتھ میں استرا ابھی موجود تھا۔

''خانہ خراب کا بچی، ہمارا عزت پر حملہ کرتی ہے۔''

انگریز نظر آنے والے اس لڑکے کے منہ سے خالصتاً پشتو لہجہ، اور جملہ بھی ایسا کہ ٹھیک ٹھاک دفعہ لگ سکتی تھی۔

''وہ...... وہ...... میں......'' اس کے منہ سے یہی نکل سکا اور اس نے پوری طاقت سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور دروازے کی سمت بھاگا مگر دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔



''آج پھر جینے کی تمنا ہے، آج پھر مرنے کا ارادہ ہے۔'' خوابیدہ احساسات کو مترنم سی آواز بھی کلی طور پر بیدار نہیں کر پائی تھی۔ یہ سریلی آواز کافی دیر سے اس کی سماعتوں کو سیراب کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کے حواسوں پر نیند کا اس قدر غلبہ تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے سحر سے نکل نہیں پا رہا تھا۔

''یار! اب اٹھ جاؤ، میں کافی دیر سے تمہارے جاگنے کا انتظار کر رہا ہوں۔'' کسی نے بہت محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ سریلی زنانہ آواز جس کوشش میں ناکام ہو رہی تھی، مردانہ کھردری آواز نے چٹکی میں وہ کام کر دکھایا تھا۔ وہ چارپائی پر چت لیٹا تھا۔ حواس بیدار ہوئے تو وہ ساری صورتِ حال بھی ذہن میں گھومنے لگی جو اس کے سونے سے پہلے وقوع پذیر ہوئی تھی۔ اسے ایک دم سے انتہائی ذلت محسوس ہوئی۔ اگر اسے پہلے سے اس کے متعلق کوئی آئیڈیا ہوتا تو شاید وہ اس بے عزتی کو ہنس کھیل کر برداشت کر لیتا مگر اب تو اسے اس تذلیل کو سوچ کر ہی جھرجھری آ گئی تھی۔

''یار! اٹھ جاؤ اب، مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے تمہاری وجہ سے اب تک کھانا نہیں کھایا۔''

وہی میٹھی سی مگر مردانہ آواز اسے پھر سنائی دی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ساتھ والی چارپائی پر لیٹا ہوا وہ لڑکا اسے وقاص چودھری اور گل شیر کا تیسرا بھائی لگا تھا۔ اس نے اس کے چہرے پر پھیلی دوستانہ مسکراہٹ کو بھی یکسر نظر انداز کر دیا۔ وہ کسلمندی سے اٹھنے لگا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر وہ لڑکا بھی چھلانگ مارنے والے انداز میں چارپائی سے اترا تھا۔

دھاریوں والی قمیص کے ساتھ وہ سیاہ رنگ کی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس کا ہیئر کٹ کافی ٹرینڈی اور اسٹائلش تھا۔ مرتضیٰ کو اس سے خوف محسوس ہوا تھا۔ جب ایسے نظر آنے والے لوگ اتنی بے عزتی کر سکتے تھے تو وہ تو حلیے سے بھی بدیسی لگ رہا تھا۔ اس کی شیو ہلکی سی بڑھی ہوئی تھی جو اس کی گندمی رنگت پر بڑی سج رہی تھی۔ اس کی مونچھیں بھی بڑی متناسب سی تھیں جو اگر کسی اور کے چہرے پر ہوتیں تو کبھی نہ سجتیں۔ مجموعی طور پر وہ ایسا لڑکا تھا جس نے مرتضیٰ کے دل میں گڑے احساسِ کمتری کے بیج کو لمحہ بھر میں تناور درخت بنا دیا تھا۔

''ابا جی! آپ مجھے روک نہیں سکتے تھے۔'' اس نے چڑ کر سوچا پھر خود ہی شرمندہ ہو گیا کیونکہ ابا جی کی التجائیں یاد آ گئی تھیں۔

''میرا نام سعدی ہے...... فورتھ ایئر میں ہوں۔'' وہ اس کے بالکل سامنے آ کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ مرتضیٰ نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھانے میں بھی ایک منٹ لگا دیا تھا اور جب تک اس کا ہاتھ سعدی کے ہاتھ میں رہا، اسے یہی خدشہ رہا کہ سعدی نامی وہ لڑکا ابھی اسے دھوبی پٹکا دے کر نیچے گرا دے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس لڑکے نے اپنے ہاتھ سے سہارا دے کر اسے اٹھنے میں مدد دی تھی۔ مرتضیٰ کسی معمول کی طرح اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''میں تمہارا روم میٹ ہوں یار! مگر تم میرے ساتھ اس طرح برتاؤ کر رہے ہو جیسے میں تمہارا سوتیلا بیٹا ہوں...... ایسے تو

گزارا نہیں ہوگا میری جان۔'' وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر کمرے میں لگے آئینے میں دیکھ کر بال بنانے لگا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' مرتضیٰ کو خاموش دیکھ کر اس نے آئینے میں نظر آتے اس کے عکس کو دیکھ کر پوچھا تھا۔

مرتضیٰ کا جی چاہا کہہ دے ''اُلّو کا پٹھا'' مگر دل کی آواز دبا کر اس نے اپنا صحیح نام بتا دیا تھا۔ سعدی نے سر ہلایا پھر اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر کندھے اچکاتے ہوئے دروازے کی سمت بڑھا۔ دروازے کے باہر پہنچ کر وہ مرتضیٰ کا انتظار کرنے لگا تھا۔

اس کے باہر آنے کے بعد اس نے دروازے کو لاک نہیں کیا، بس کنڈی لگا دی تھی۔ مرتضیٰ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ سعدی اس کی حیرت کو بھانپ گیا۔

''یار! یہاں کون سا خزانہ رکھا ہے۔ میں زیادہ تر کمرے کو اسی طرح کھلا چھوڑ جاتا ہوں۔ زیادہ دن کے لیے کہیں باہر جاؤں تب بھی کبھی میں نے کمرہ لاک نہیں کیا۔''

وہ دونوں کوریڈور میں ساتھ چل رہے تھے۔ اتنی بڑی مبالغہ آرائی پر مرتضیٰ نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ خواہش تو یہ تھی کہ کوئی سخت جملہ کہے مگر اسے کوئی مناسب جواب نہیں سوجھا، سو خاموش رہا جب کہ سعدی بہت باتونی معلوم ہوتا تھا۔

''اگر کبھی تمہیں یہ کمرہ لاکڈ ملے تو پریشان نہ ہونا...... وہ آٹو لاک ہوتا ہے، جھٹکا دینے سے کھل جاتا ہے...... یار کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی کہ کمرہ لاک کروں...... یہاں کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ سعدی سے پنگا لے۔ سو کمرہ بند ہو یا کھلا...... اِٹ میکس نو ڈفرنس...... تم میرے روم میٹ ہو، اس لیے تمہارا اور میرا تعلق ذرا مختلف ہوگا۔ ایک بات میں تمہیں واضح بتاؤں کہ یہاں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، کسی سے مرعوب بھی نہیں ہونا، کسی سے متاثر ہونے کی کوشش بھی نہیں کرنی...... سوائے...... میرے۔''

اتنا کہہ کر سعدی نے اس کی جانب دیکھا پھر اس کے چہرے پر پھیلی تشویش دیکھ کر دوبارہ اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

''یار! میں کوئی پرنس چارلس نہیں ہوں بس...... دراصل تھوڑا سا خود پسند ہوں اور موڈی ہوں...... بدتمیز نہیں ہوں...... ویسے تمہیں کیا فیل ہوا، میں کیسا ہوں؟''

وہ کوریڈور کے آخری کنارے پر تھے جب سعدی نے پوچھا۔ مرتضیٰ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

''اچھا یار...... آئی ایم سوری...... اب ایسے مت دیکھو مجھے کہ میں شرمندگی محسوس کرنے لگوں۔'' وہ چڑ کر بولا۔

''مجھے بیت الخلاء جانا ہے۔'' وہ اپنی ہی مصیبت میں تھا، سو شرمندہ لہجے میں بولا۔

''ہیں...... کہاں جانا ہے؟'' سعدی نے حیرانی سے پوچھا۔ مرتضیٰ کو دل ہی دل میں بہت حیرت ہوئی۔ اسے بے وجہ فرنگیوں کی تقلید میں بے حال لوگوں سے ویسے ہی بہت چڑ ہوتی تھی۔

''باتھ روم جانا ہے۔'' اس نے وضاحت کی۔

''اچھا اچھا...... باتھ روم اس طرف ہے...... میں یہیں کھڑا ہوں، تم جلدی سے واپس آؤ۔ ہم اکٹھے ڈائننگ ہال تک چلیں گے۔''

اس نے اشارے سے بتایا۔ مرتضیٰ اسی سمت چل دیا اور دس منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو سعدی سچ مچ وہیں کھڑا تھا۔ ڈائننگ ہال پہنچنے تک ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ البتہ وہاں...... جا کر مرتضیٰ کو کافی حوصلہ ہوا کیونکہ وہاں اسے بہت

سے ایسے نمونے دیکھنے کو ملے جو تقریباً اس کے جیسے ہی تھے۔

کھانا کھانے کے لیے میز کا انتخاب بھی سعدی نے کیا۔ کچھ لمحوں کے بعد تین اور لڑکوں نے ان کی میز کے گرد نشست سنبھال لی تھی۔ وہ سعدی کے اچھے دوستوں میں سے لگ رہے تھے۔ وہ تینوں شخصیت میں مرتضیٰ سے بہتر اور سعدی سے کم تر تھے مگر ان کا اندازِ گفتگو اور کھانا کھانے کا سلیقہ بالکل سعدی کے جیسا تھا۔

''یہ قورمہ پاس کرنا پلیز۔'' ایک لڑکے نے مرتضیٰ سے کہا۔ مرتضیٰ کو خاک سمجھ میں نہیں آیا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ قورمہ پاس کیسے ہوتا ہے اور فیل کیسے ہوتا ہے۔ اس نے آج تک انسانوں کو ہی فیل یا پاس ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے سعدی نے قورمے والا ڈونگا اٹھا کر مذکورہ لڑکے کو تھما دیا۔

''لو جی تو ایسے پاس ہوتا ہے قورمہ...... یعنی اگر یہ سعدی ڈونگا اٹھا کر اسے نہ دیتا تو قورمہ فیل ہو جاتا۔''

اس نے تندوری روٹی کے چہرے پر چمکنے والے بھورے بھورے نشانوں کو دیکھ کر سوچا تھا۔ ڈائننگ ہال میں ہی اسے وہ چہرے یاد آئے، جنہوں نے اس کی درگت بنائی تھی۔ کھانے سے فراغت کے بعد سعدی اور اس کے علاوہ وہ تینوں لڑکے یکے بعد دیگرے اٹھ کر چل دیے تھے۔

''گل شیر لوگوں سے تمہارا کیا پھڈا ہوا ہے؟'' ان کے جاتے ہی سعدی نے پوچھا تھا۔

مرتضیٰ کا دایاں گال یک دم گرم ہو گیا۔ گل شیر کا ہاتھ واقعی پٹھان بچے کا ہاتھ تھا۔ اسے وہ ذلت یاد آئی۔ کتنی مشکل سے وہ گل شیر کو اصل بات سمجھا پایا تھا اور حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اس نے تمہیں مارا ہے؟'' سعدی نے اس کی خاموشی سے خود ہی کسی نتیجے پر پہنچ کر کہا۔ مرتضیٰ کا دل چاہا، ٹیبل ہی الٹ دے۔

''کتنے دیوان شائع ہو چکے ہیں تمہارے؟'' اس بار سعدی نے عجیب و غریب سوال کیا تھا۔

''اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ تم ہر پانچ منٹ بعد کسی شاعر کی طرح عالم استغراق میں گم ہو جاتے ہو۔ اگر ایسے ''جراثیم'' ہیں تو یار! مجھے پہلے ہی بتا دو، مجھے ایسی چیزوں سے الرجی ہے اور ہاں، میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ تم پر خرچ کرتا چلا جاؤں۔ قسمت نے تمہیں میرا روم میٹ بنا دیا ہے تو شکر ادا کرو۔ کالجز میں مذاق وغیرہ کوئی انوکھی بات نہیں لیکن کسی کو کسی پر ہاتھ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ تمہیں اس کے خلاف اسٹینڈ لینا چاہیے۔ دیہاتی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنی عزتِ نفس کو بھول جائے۔ جب میں یہاں آیا تھا تو صرف سولہ سال کا تھا۔ میں نے بھی ایسے مذاق کا سامنا کیا تھا لیکن کسی مائی کے لال میں یہ جرأت پیدا نہیں ہونے دی تھی کہ وہ مجھ پر ہاتھ اٹھائے۔ تمہیں یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم مجھ سے چھوٹے ہو اور قسمت نے تمہیں میرا روم میٹ بنا دیا ہے اور......''

''اور یہ کہ شکر الحمدللہ کیونکہ قسمت نے مجھے تمہارا روم میٹ بنا دیا ہے۔ گل شیر بلکہ گل ہاتھی نے مجھے نا صرف تھپڑ مارا ہے بلکہ گالی بھی دی ہے اور میرا گریبان بھی پکڑا ہے۔ ابا جی کی قسم، بدلہ تو میں ان سب سے ضرور لوں گا مگر وقت آنے پر اور اپنے طریقے سے، ایک بات۔ دوسری بات یہ کہ عزتِ نفس کی یہاں کمی نہیں ہے۔ راجپوتوں کا خون ہوں، کوئی ذلیل کہہ کر جائے گا کہاں، میری لاعلمی کو میری حماقت نہ سمجھا جائے۔ ہوائی جہاز بھی اڑنے سے پہلے جھٹکا کھاتا ہے۔ اس جھٹکے کو اس کی ناکامی سمجھنے والے لوگ دراصل بے وقوف ہوتے ہیں۔ نمبر تین تم کس خوشی میں میری ماں بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ تمہارے مجھ سے کیا مفادات وابستہ ہیں۔ کچھ ان پر بھی تو روشنی ڈالیں سرکار!''

وہ بھنا کر جو بولنا شروع ہوا تو پھر چپ کروانا مشکل ہو گیا۔ سعدی حیرت کے بجائے متاثر ہونے والے انداز میں اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ڈائننگ ہال میں زیادہ لوگ نہیں تھے اور جو تھے، وہ اپنی مصروفیات میں گم تھے، اس لیے ان کی جانب کسی کا دھیان نہیں تھا۔

سعدی کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے حیرت کی رمق چمکی اور پھر غائب ہو گئی۔

''اوہو...... تو تمہیں سب کچھ پتا چل گیا...... اب کیا ہوگا...... تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ یار! میں واقعی ایک کمینہ آدمی ہوں بلکہ جدی پشتی کمینہ ہوں۔ والد ماجد ہیروئن کا کاروبار کرتے ہیں بھائیوں نے اس کاروبار کو ترقی دی میرا ارادہ بھی یہی کرنے کا ہے۔ میرے کمرے میں ہیروئن کی پڑیا بکتی ہیں۔ جی سی کی فیس تو میں نے تم جیسے چغدوں کو ٹریپ کرنے کے لیے بھری ہے لیکن دیکھو خدا کے لیے یہ بات کسی کو مت بتانا، ورنہ میں برباد ہو جاؤں گا۔ میرا ککھ نہیں بچے گا۔''

وہ اتنی سنجیدگی سے بولا تھا کہ مرتضیٰ دل ہی دل میں یقین نہ کرنے کے باوجود اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ اس علاقے سے آیا تھا، جہاں لوگ بھنگ پر اکتفا کرتے تھے۔

''تم مذاق کر رہے ہو؟'' اس نے۔ بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔

''نہیں نہیں، گھاس کھود رہا ہوں۔ ہونہہ...... میرا کیا مفاد وابستہ ہو سکتا ہے احمق آدمی...... شکل سے ہی سردار جی نظر آنے والے پینڈو، تمہارا خود اپنے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہے، تم نے مجھے کیا فائدہ پہنچانا ہے۔''

وہ ذرا چڑ کر بولا تھا۔ مرتضیٰ کو لگا، سعدی کا چہرہ وقاص چودھری کے جیسا ہو گیا ہے۔

''شکل سے تم بھی مونچھوں والی لیڈی ماؤنٹ بیٹن لگتے ہو، میں نے تو نہیں جتایا تمہیں۔ میری طرف سے بھی اونہہ...... اس سے بہتر تو ہم سلانوالی میں تھے۔ لعنت ہے ایسی پڑھائی پر۔''

وہ سعدی کا ہی انداز اپنا کر بولا تھا۔ سعدی نے ملنے والے ''لقب'' کو بہت مشکل سے برداشت کیا تھا۔ اس کے بعد کچھ گہرے سانس بھر کر وہ اس کی جانب دیکھنے لگا۔ مرتضیٰ کے چہرے پر زمانے بھر کی بیزاری تھی۔

''یار! تم نے واقعی میرے اندازے کی تصدیق کی ہے۔ تمہاری آنکھوں کی چمک مجھے بتا رہی تھی کہ ہیں کو اکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ۔ اسے شاعری نہ سمجھنا، میں اسے محاورتاً کہتا ہوں اور یار! تم سے کیا چھپاؤں کیونکہ قسمت نے تمہیں...... اچھا چلو چھوڑو۔ اب ہمیں ڈیڑھ سال تک اکٹھے رہنا ہے۔ بتانا یہ تھا کہ میں اتنا برا انسان نہیں ہوں، بس مجھ میں ایک خرابی ہے۔ میں شاعر ہوں، تم اسے ہی میرا مفاد سمجھ لو۔''

اس نے ایسے کہا تھا جیسے جرم کا اعتراف کر رہا ہو، مرتضیٰ کو اس کا بدلا ہوا یہ روپ زیادہ اچھا لگا تھا۔ اسے لگا وہ دونوں اب بے وقوفی میں ایک مقام پر آ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور پھر سعدی نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ جسے اس نے پورے خلوص سے تھاما تھا۔

''یار! کیا میں واقعی مونچھوں والی لیڈی ماؤنٹ بیٹن لگتا ہوں؟'' اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے سعدی نے پوچھا تھا پھر وہ دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دیئے تھے۔



تین دن بعد جمعہ آ گیا تھا۔

جمعرات کو ویک اینڈ منانے کے چکر میں سب ہی تاخیر سے سوتے تھے۔ سو جمعہ کو جلدی اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

تھا۔ جمعہ کے روز ہاسٹل میں زندگی پہلی انگڑائی دس بجے کے قریب لیتی تھی پھر آہستہ آہستہ بیداری کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔

جن لوگوں کے عزیز و اقارب لاہور میں مقیم تھے، وہ وہاں حاضری لگوانے چلے جاتے۔ کوئی وارڈ روب سیٹ کرنے میں مگن ہو جاتا، کسی کو ہفتہ بھر کے کپڑے استری کرنا ہوتے تھے۔ کسی کو گھر والوں یا محبوباؤں کو خط لکھنے ہوتے تھے۔ سو وہ اس میں مصروف ہو جاتے مگر یہ سب کام دوپہر کے بعد شروع ہوتے تھے۔

چھٹی کے دن ایک بات یقینی تھی کہ کوئی کسی کو جگا کر عتاب مول نہیں لیتا تھا۔

اس جمعہ کو اقبال ہاسٹل کی تاریخ میں شاید پہلی بار ہوا تھا کہ کمرہ نمبر 7 میں دائیں چارپائی پر سوئے لڑکے نے بائیں چارپائی پر سوئے لڑکے کو جگا دیا تھا۔ بائیں چارپائی والا بستر سے اٹھنے میں ذرا نخرے سے کام لے رہا تھا۔

''اگر میراثیوں کی اولاد ہے تو اسی طرح سوتا رہ۔''

اس طعنے پر بائیں چارپائی والا کروٹ بدل کر دوبارہ سے سونے کی تیاری کرنے لگا تھا۔ جس پر دائیں والے نے اس کی پشت پر زوردار دھپ رسید کیا تو بائیں چارپائی والا ناک بھوں چڑھاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ان دونوں نے پاؤں میں ہوائی چپل ڈالے اور کمرے کا دروازہ نہایت آہستگی سے کھول کر کوریڈور میں نکل آئے۔ صبح چھ بجے کے قریب کا وقت تھا، ہاسٹل کے ناصرف مکین بلکہ در و دیوار بھی خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ سردیاں آ نہیں رہی تھیں اور گرمیاں جا نہیں رہی تھیں۔ موسموں کی اس ذاتی چپقلش نے عجب خوشگواریت پھیلا رکھی تھی۔

وہ دونوں نہایت آہستگی سے چلتے ہوئے کمرہ نمبر 21 کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہوائی چپلوں کے باعث ان کے قدموں کی چاپ نہ ہونے کے برابر تھی۔ کمرہ نمبر 21 کے باہر پہنچ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکے۔ یہ کمرہ عباس راہی اور وقاص چودھری کا تھا۔ عباس راہی وہی لڑکا تھا جس نے دائیں چارپائی والے لڑکے سے تالا توڑنے کے تیس روپے اینٹھے تھے۔ یہ دونوں رات کسی پارٹی میں مدعو تھے، جہاں جانے کے لیے انہوں نے بہترین ڈریسنگ کی تھی اور مہنگے فٹ ویئرز پہنے تھے۔ وقاص چودھری کا بڑا بھائی دبئی سے پچھلے مہینے بہت مہنگے لیدر کے بوٹ لایا تھا۔ یہ اسٹائلش سے بوٹ سارے ہاسٹل کو دکھا کر اس نے خوب شیخیاں بگھاری تھیں۔ رات کو پارٹی میں اس نے یہی بوٹ پہنے تھے جب کہ عباس راہی کی پشاوری چپل بھی بہت اعلیٰ تھی اور سب سے بڑھ کر کل رات پہلی مرتبہ پہنی گئی تھیں۔ پارٹی سے لوگ عموماً لیٹ واپس آتے ہیں۔ سو جوتے باہر سے اٹھا کر کمرے کے اندر رکھنا بھول جاتے ہیں۔ شامت کوئی چٹھی دے کر تو آتی نہیں ہے، سو وقاص چودھری اور عباس راہی کے جوتوں کی شامت آ گئی تھی۔

کمرہ نمبر 21 کے باہر موجود ان دونوں لڑکوں نے بہت خاموشی سے وہ جوتے اٹھا لیے۔ اب ان کا رخ کمرہ نمبر 27 کی طرف تھا۔ یہاں بھی دو لڑکے رہتے تھے۔ کمرہ 21 اور 27 کے مکینوں میں خوب دوستانہ تھا، سو وہ پارٹیز پر اکٹھے جاتے تھے مگر کمرہ نمبر 27 کے لوگ کمرہ نمبر 21 کے لوگوں سے زیادہ ذہین تھے۔ انہوں نے اپنے جوتے رات ہی اٹھا کر سنبھال لیے تھے۔ کمرہ نمبر 27 کے باہر عام استعمال والی چپل پڑی تھیں۔ اب قسمت خراب ہو تو ذہانت کہاں کام آتی ہے۔ کمرہ نمبر 27 کے ایک جوان کو جاگنگ کا شوق تھا۔ اس نے کراچی کے کسی جمعہ بازار سے سیکنڈ ہینڈ Adidas کے جوگرز خریدے تھے جن کی قیمت سن کر لگتا تھا کہ فرسٹ ہینڈ تو شاید شادی کے موقع پر دلہن والوں سے جہیز میں ہی مانگے جا سکیں گے۔ وہ جاگرز اب باہر پڑے تھے۔

یہی جاگرز بہت آہستگی سے کمرہ نمبر 7 کے ان دونوں لڑکوں کی زنبیل میں منتقل ہو گئے تھے۔ کمرہ نمبر 27 والوں کی غلطی

یہ تھی کہ انہوں نے کمرہ نمبر 21 والوں کو اسکرپٹ لکھ کر دیا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے کمرہ نمبر 7 کے ایک اکلوتے مکین سے پنگا لینے کی غلطی کی تھی۔

تینوں جوتوں کے جوڑے لے کر وہ لڑکے اسی طرح دبے پاؤں چلتے واپس کمرہ نمبر 7 میں آگئے تھے۔ ان جوتوں کو ایک بڑے شاپنگ بیگ میں بند کر کے ایک سمت میں لگا دیا گیا تھا۔ پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا تھا۔ دوسرا مرحلہ ٹھیک پینتالیس منٹ بعد شروع ہوا۔

کوریڈور کے آخر میں باتھ رومز بنے ہوئے تھے۔ ہر شخص نے ہی عادت سی بنائی ہوئی تھی کہ انہیں کوئی مخصوص باتھ روم استعمال کرنا ہے۔ اس سے شاید ملکیت کی حس کو سکون ملتا تھا۔ اب کمرہ نمبر 7 کے دونوں مکینوں کا رخ ان ہی باتھ رومز کی طرف تھا۔ کمرہ نمبر 3 کے گل شیر کو صبح سویرے نہانے کی عادت تھی۔ جمعہ کے روز وہ علی الصبح نہا کر فارغ ہو جاتا تھا کیونکہ جیسے جیسے ہاسٹل کے مکین بیدار ہونا شروع ہوتے تھے۔ باتھ رومز میں رش لگنے لگتا تھا پھر اپنی باری کے لیے ٹوکن لینے کی نوبت آجاتی تھی، اسی لیے گل شیر یہ کام جلدی کر لیتا تھا۔ اس نے اپنے لیے جو واش روم منتخب کیا ہوا تھا۔ اتفاق سے اس کے اندر کپڑوں کو لٹکانے کے لیے کوئی اسٹینڈ وغیرہ موجود نہیں تھا۔ گل شیر کو کپڑے باتھ روم کے دروازے پر لٹکانے پڑتے تھے جو پہنے ہوتے تھے وہ بھی اور جو پہننے ہوتے تھے وہ بھی۔

باتھ رومز کے دروازے ایسے تھے کہ کوئی بھی باہر سے کپڑے آرام سے اٹھا کر لے جا سکتا تھا۔

کمرہ نمبر 7 کے دونوں مکین اسی باتھ روم کے باہر پہنچ گئے۔ جیسے ہی نلکا چلنے اور پانی گرنے کی آوازیں آنا شروع ہوئیں انہوں نے وہ سارے کپڑے آہستگی سے وہاں سے اٹھائے اور ہنسی دباتے اپنے کمرے میں آگئے۔

کمرہ نمبر 7 کے وہ دونوں لڑکے اپنے کمرے میں واپس آئے۔ گل شیر کے کپڑوں کو بھی شاپنگ بیگ میں ڈال دیا۔

”ٹھہر یار...... یہ بھی اس میں رکھ دے۔“ مرتضیٰ نے اپنے دونوں جوتے سعدی کو دیئے۔ وہ ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگا۔

”رکھ دے یار......!“ وہ مسکرا کر بولا۔ سعدی نے وہ جوتے بھی رکھ دیئے۔ مرتضیٰ کچھ لمحے ایسے ہی کھڑا رہا پھر کچھ سوچ کر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا مگر ایک لمحہ بعد ہی وہ واپس آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جوتے کا ایک جوڑا اور تھا۔ ایک جوتا بھورا تھا جب کہ دوسرا سیاہ۔

”کیا کریں، مجبوری ہے۔ کبھی کبھی گیہوں کے ساتھ گھن کو پسنا ہی پڑتا ہے۔“

اس نے وہ جوتے سعدی کو تھماتے ہوئے کہا تھا۔ سعدی نے وہ جوتے بھی شاپر میں رکھ دیئے۔ اس شاپنگ بیگ کو انہوں نے اس خالی مرتبان میں رکھ دیا جو مرتضیٰ اپنے گاؤں سلانوالی سے بھرا ہوا لایا تھا۔ یہ مرتبان بھی وقاص چودھری نے خالی کیا تھا۔ جب مرتضیٰ گل شیر سے درگت بنوا رہا تھا تو پیچھے سے وقاص چودھری یہی کام کر رہا تھا۔ شاپنگ بیگ کو مرتبان میں رکھنے میں دقت ہوئی مگر انہوں نے کھینچ تان کر اسے مرتبان کے اندر منتقل کر ہی لیا تھا۔ اس کے بعد وہ مسرور اور شاداں اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔

بارہ بجے سعدی کی آنکھ سب سے پہلے کھلی تھی۔ اس نے مرتضیٰ کو جھنجوڑ کر جگایا۔ مرتضیٰ نے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا پھر وہ کوریڈور میں چلا کر بولا۔

اس کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ ہمسائے سن لیتے۔ کمرہ نمبر 5 کا علی سب سے پہلے باہر آیا تھا اور اسے بھی جھٹکا لگا تھا۔

”علی بھائی! میرے جوتے تو نہیں دیکھے آپ نے۔ رات یہیں رکھے تھے؟“

وہ اس کے قریب جا کر نہایت پریشان لہجے میں بولا۔

سعدی کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا، کیونکہ اسے ہنسی بہت آرہی تھی۔ مرتضیٰ کی ایکٹنگ لاجواب تھی۔

”اوہ یار، مجھے کیا پتا...... میرا تو خود ایک جوتا غائب ہے جب کہ دوسرا یہ پڑا ہوا ہے۔“

وہ کمرے کے باہر پڑے پائے دان پر رکھے براؤن جوتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ان کے شور وغل سے کمرہ نمبر 8 کا اطہر بھی باہر آگیا تھا۔

”یار! میرا سیاہ رنگ کا ایک جوتا غائب ہے۔“

وہ بھی اجتماعی ماتم میں شامل ہو گیا۔ ایک گھنٹے کے اندر کمرہ نمبر 21 اور 27 کے لوگوں نے بھی انہیں جوائن کر لیا تھا۔ سب سے برا حال غفار کا تھا جس کے جاگرز غائب ہوئے تھے۔ وہ خود کو کوس رہا تھا کہ جاگنگ کے لیے کیوں نہ اٹھ سکا جب کہ سب سے اونچی آواز غلام مرتضیٰ بھٹی کی تھی جس کے سیل سے خریدے گئے بیس روپے والے پلاسٹک کے جوتے غائب تھے جب کہ وہ سب سے کہہ رہا تھا۔

”میرے بالکل نئے جوتے تھے۔ یہ سعدی سے پوچھ لے کوئی۔ کل اس کے ساتھ جا کر خریدے تھے۔ ہائے میرے جوتے۔“

سعدی اس قابل نہیں تھا کہ گواہی دے سکتا۔ اس کی ہنسی ہی بند نہیں ہو رہی تھی۔ سو وہ کمرے میں سوتا بن گیا تھا۔ اس سارے شور وغل میں ایک شخص الگ ہی راگ الاپ رہا تھا۔

”اوہ، کوئی میری فریاد کیوں نہیں سنتی۔ مجھے باہر نکالو۔ میں یہاں پھنس گئی ہے۔“

کسی کو آواز سنائی دیتی تو پتا چلتا کہ کون چلا رہا ہے اور کہاں سے چلا رہا ہے اس روز مرتضیٰ اور سعدی نے دوپہر کا کھانا ہاسٹل سے باہر کھایا تھا اور بہت ڈٹ کر کھایا تھا۔ جوتے اور کپڑے بیچ کر اتنے روپے تو مل ہی گئے تھے کہ وہ ٹھیک ٹھاک عیاشی کر سکتے۔ پورے ہاسٹل میں جوتوں کے لیے تلاشی لی گئی تھی لیکن جن لوگوں کے جوتے غائب تھے، ان کے کمروں کو چیک نہیں کیا گیا تھا حالانکہ چیک کر لیا جاتا تو ان کے مقدر میں یہ عیاشی نہ آتی۔



آپس کی بات ہے کہ بظاہر اس کی شخصیت بہت عام سی تھی۔ اوسط قد کاٹھ، اوسط رنگ و روپ، اوسط صحت اور اوسط ہی دولت، یعنی کل ملا کر وہ ایک درمیانہ سا شخص تھا۔ اگر زمین پر کوئی مقام اعراف ہوتا اور وہاں ٹھہرائے جانے کے لیے ظاہری شخصیت کو پرکھ کر فیصلہ کیا جاتا تو غلام مرتضیٰ بھٹی اسی مقام پر پایا جاتا۔ وہ ان لڑکوں میں سے تھا جنہیں لڑکیاں تب بھی گھاس نہیں ڈالتیں جب پتا ہو کہ یہ شوق سے کھائیں گے۔ البتہ لڑکوں کی ان سے خوب بنتی ہے۔ کیونکہ ان میں ازل سے رقیب بننے کا مادہ ہی نہیں ہوتا۔ مرتضیٰ میں بھی یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود تھی اس لیے اس کا حلقۂ یاراں شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہو رہا تھا۔ کالج میں بہت زیادہ ڈسپلن کا مظاہرہ کرنے کی وجہ سے ہاسٹل آتے ہی سب کے نٹ بولٹ ڈھیلے ہو جاتے تھے اسی لیے خوب شرارتیں ہوتیں، وہ لڑکے جو کالج میں اساتذہ کے منظور نظر تھے۔ یا اسٹیٹس کونشس تھے۔ وہ بھی ہاسٹل واپس آکر ایک مختلف روپ میں نظر آتے یہی وجہ ہے کہ یہاں کا ماحول زیادہ دوستانہ تھا۔ مرتضیٰ کے جوہر بھی چند دنوں میں کھل کر سامنے آگئے تھے۔

ابتدا میں نئی اور انوکھی نظر آنے والی چیزیں بہت جلد پرانی لگنے لگی تھیں۔ نئے لوگ پرانے لوگوں سے گھل مل گئے تھے۔
غلام مرتضیٰ بھٹی کے ہر انداز میں دیہاتی رنگ جھلکتا تھا مگر خود اعتمادی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جو لاہور جیسے بڑے شہر میں اس کی بقا میں بالکل ایسے مدد کر رہی تھی جیسے گائیڈ بکس، ٹیکسٹ بکس کو رٹنے میں مدد کرتی ہیں۔
وہ جہاں سے آیا تھا وہاں وہ اندھوں میں کانا راجہ تھا۔ جب کہ یہاں سب آنکھوں والوں میں سے وہ گنے چنے کانوں میں سے ایک تھا۔ مگر ہر گزرتا دن اس کی شخصیت کی ایسے قلعی کر رہا تھا جیسے تانبے کے برتنوں کی، کی جاتی ہے۔ وہ چہرے جو ابتداء میں اسے خجالت میں مبتلا کرتے تھے اب انہیں خجل کرنے میں اسے مزہ آنے لگا تھا۔



''اناللہ وانا الیہ راجعون'' کوئی اس کے گلے سے لگا اسے اس کے باپ کی موت کا دلاسا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس شخص کے آنسوؤں سے اس کی سیاہ قمیص کا کندھا بھیگنے لگا تھا۔ وہ بمشکل خود کو اس سے علیحدہ کر کے ابھی اندر جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کسی اور نے آگے بڑھ کر اسے خود سے لپٹا لیا۔
یہ سب اس کے رشتہ دار تھے، لیکن وہ ان میں سے بہت کم لوگوں کو جانتا تھا۔ اس نے کبھی ان سے ملنے یا بات چیت کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ سب تو شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اس سے گلے ملنے کا شرف حاصل کر رہے تھے۔ وہ ایک سے علیحدہ ہوتا تو کوئی دوسرا اس کے چہرے پر پھیلی ناگواری کو اس کا حزن و ملال سمجھتے ہوئے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیتا۔
''صبر بیٹا صبر! یہی زندگی کا اصول ہے۔''
وہ اس شخص کے نام سے واقف تھا۔ ایک آدھ بار تصویر بھی دیکھ رکھی تھی۔ شاید اسی لیے اسے پہچان لیا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ یہ شخص اس کے باپ کے حلقہ احباب میں کب اور کیسے شامل ہوا۔ فی الوقت وہ یہاں سے کچھ دیر کے لیے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ وہ ان تسلیوں اور دلاسوں کو کسی کے ساتھ بانٹنا چاہتا تھا، لیکن اس نے آج تک کسی کے ساتھ کچھ بھی نہیں بانٹا تھا۔ شاید اسی لیے اس کی جھنجلاہٹ میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے اپنے ساتھ گزارنے کے لیے کچھ لمحے درکار تھے تاکہ وہ سود وزیاں کا حساب کر سکے مگر ساری زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کے باوجود اسے فی الحال ایک لمحہ نہیں مل پا رہا تھا۔
اسی دوران مین گیٹ سے دیہاتی رشتہ داروں کی ایک نئی کھیپ اندر داخل ہوئی تھی۔ اب اس کی ناگواری چھپائے نہ چھپ سکی۔ اس نے زچ ہو کر سر جھکا لیا۔ اسے ایک بار پھر آنکھوں میں نمی امڈتی محسوس ہوئی۔
''بیٹا! اپنے کمرے میں جاؤ۔ کب سے یہاں بیٹھے ہو۔ تھک گئے ہو۔ بہت ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں تمہیں۔ کچھ دیر ریسٹ کر لو۔''
انکل صدیق اس کی مشکل سمجھ کر اس کی مدد کے لیے آگے بڑھے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگ بھی ان کی بات کی تائید کرنے لگے۔ وہ فوراً جان چھڑا کر وہاں سے بھاگنے والے انداز میں لابی کے دروازے کی سمت بڑھا۔ چند قدم چل کر ہی اسے اپنا سانس پھولا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ قابل رشک صحت کا مالک تھا۔ اسے اپنا خیال رکھنے کا شوق بھی بہت تھا، لیکن ایک رات نے گویا اس کی ساری توانائیاں چھین لی تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو کبھی اتنا تھکا ہوا محسوس نہیں کیا تھا۔ لابی سے ہو کر وہ لاؤنج میں داخل ہوا۔ جہاں رشتہ دار خواتین بے ترتیب حالت میں بکھری پڑی تھیں۔ وہ ان پر ایک نگاہ ڈال کر فوراً ماسٹر بیڈروم کی جانب بڑھ گیا۔

بیڈروم میں داخل ہو کر اس نے قمیص اتار کر بیڈ پر پھینک دی۔ اور اے سی آن کر کے اس کے بالکل سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی سفید بنیان پسینے سے شرابور تھی۔ چند لمحے اسی طرح اے سی کے سامنے کھڑا گہرے سانس بھرتا رہا۔
کمرے کا گرم ماحول تیزی سے خنک ہونا شروع ہوا تھا۔ اسے چند لمحوں کے لیے واقعی بہت سکون محسوس ہوا۔ اے سی کے سامنے سے ہٹ کر وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں بیڈ سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ وہ کافی دیر تک اسی پوزیشن میں پڑا رہا۔ پسینہ خشک ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے حواس بھی بحال ہو رہے تھے۔
وہ جس حالت میں لیٹا تھا اس کے بالکل سامنے ڈرائنگ روم سے ملحقہ دیوار تھی اس کی ٹانگیں تقریباً اسی سمت میں تھیں۔ اسے یک دم یاد آیا کہ اس کا باپ اس کے اس طرح سے لیٹنے پر بہت غصہ کرتا تھا۔
''اس طرف کعبہ شریف ہے، تمہاری ماں اس سمت رخ کر کے نماز پڑھتی ہے۔''
وہ اسے اس طرح لیٹے دیکھ کر ہمیشہ ٹوکتا تھا اور وہ بڑبڑاتے ہوئے اس کمرے سے چلا جایا کرتا۔ یہ کمرہ اس کے باپ کا بیڈروم تھا۔ اس کا بیڈروم بھی ساتھ ہی تھا۔ اس کے ماں باپ جب اس کمرے میں باتیں کرتے تھے تو ملحقہ کمرے میں اسے ان کی باتیں واضح سنائی دیا کرتی تھیں۔ اس انداز میں لیٹے لیٹے اس کے جی میں جانے کیا سمائی کہ اس نے لیٹے لیٹے ہی رخ تبدیل کر لیا۔ اب اس کی ٹانگیں شمال کی جانب تھیں باپ کی زندگی میں وہ ہر چیز سے اختلاف کیا کرتا تھا جو اس کا باپ اسے کہتا اور اگر آج وہ اسے اس طرح سے رخ بدلتا دیکھ لیتا تو آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لیتا۔ اس نے بے وجہ آنکھیں جھپکیں اور ماتھے پر دو انگلیاں پھیرنے لگا وہ لمس جس سے وہ ساری زندگی جھنجلاتا رہا تھا اسی لمس کی خواہش نے اس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ خواہش ایسی منہ زور تھی کہ وہ ''واٹ ربش'' کہہ کر اسے جھٹک بھی نہیں پا رہا تھا۔
اسے اپنے آرٹسٹک ذہن پہ بہت ناز تھا۔ ہر کمرے کے ایلیمل و کرٹنز و فلورل ماربل ٹائلز سے لے کر واش روم اسیسریز تک ہر چیز اس نے خود پسند کی تھی۔
جو دیوار اس کی نظروں کے سامنے تھی اس پر گل جی کے ہاتھ کا ایک بہت خوبصورت آرٹس پیس آویزاں تھا۔ کیلی گرافی کا یہ شاندار نمونہ جو سورہ رحمٰن کی آیت پر مشتمل تھا۔ یہ اس کمرے کی واحد چیز تھی جو اس کے باپ نے اپنی مرضی سے یہاں لگائی تھی۔
اس کے باپ کو کہیں سے گل جی کی بنائی ہوئی پینٹنگز والا ایک جرنل ملا تھا، جس کے ایک چھوٹے پیج کو انلارج کر کے اس کے باپ نے کہیں سے پرنٹ آؤٹ نکلوایا تھا پھر اسے بے حد شاندار سنہری فریم کروا کر دیوار پر آویزاں کیا گیا تھا۔ اس کے باپ کے ذہن کی رسائی یہاں تک کیسے ہوئی، یہ سوال تو اکثر اسے تعجب میں ڈال دیتا تھا۔ وہ آیت جو اس آرٹ پیس میں جگمگا رہی تھی اس آیت کے متعلق اس کا باپ اسے اکثر کچھ قصے سنانے کی کوشش کرتا تو وہ مذاق میں بات کو ٹال دیتا تھا۔ اسے اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظرانداز کرنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ اس نے آیت کے ترجمے کو پڑھنے کی کوشش کی۔
''اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔''
اس نے دو تین بار خالی الذہنی کی کیفیت میں ان الفاظ کو دہرایا۔ اسے محسوس ہوا اس کے دل میں جھکڑ سے چل رہے ہیں۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ سوچتا اس کے موبائل کی بیپ بجنے لگی۔ اس کا موبائل اس کی قمیص کی جیب میں تھا جو اس نے اتار کر بیڈ پر پھینک دی تھی۔ وہیں لیٹے لیٹے اس نے قمیص کو اپنی جانب گھسیٹا اور اس میں سے سیل فون نکالنے لگا۔
اس کی ننھی اسکرین پر ''ارحم کالنگ'' کے الفاظ دیکھ کر وہ شاید زندگی میں پہلی بار تذبذب میں گھر گیا۔ اس کی سمجھ میں

نہیں آ رہا تھا کہ آیا اسے کال ریسیو کرنی چاہیے یا نہیں۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔

"ارحم! میرے ڈیڈ مر گئے۔"

اس نے ارحم کی بات سنے بغیر کہا تھا۔ اسے خود لفظ "ڈیڈ" پر حیرت ہوئی۔ اس نے پہلے کبھی اپنے باپ کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ ارحم چند لمحے کے لیے خاموش رہ گیا تھا۔

"آر یو شیور؟" ارحم کی مدہوش آواز سنائی دی تھی۔ وہ اس وقت بھی نشے کی حالت میں تھا۔

"پریشان نہ ہو یار......! میرا باپ ہر رات کسی...... نہ کسی کتیا پر مرتا ہے...... میں تو کبھی پریشان نہیں ہوا۔ اِٹس اے پارٹ آف لائف...... مرنے دو۔"

وہ رک رک کر بول رہا تھا۔ وہ واقعی نشے میں تھا۔ وہ جب نشے میں نہیں ہوتا تھا تو اپنے باپ کے لیے اس سے زیادہ گندے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ اس نے کال ہی منقطع کر دی۔

وہ اس کمرے میں سکون کی خاطر آیا تھا مگر یہاں آ کر بھی اس کی جھنجلاہٹ لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی تھی۔ اس کمرے میں اس شخص کی یادیں ماتم کناں تھیں جو اس کا باپ تھا۔ اس نے اپنے باپ کی محبت کو ہمیشہ پرائز بانڈ میں نکلا انعام سمجھ کر استعمال کیا تھا۔ انعام میں نکلی رقم جتنی مرضی خطیر ہو بالآخر اسے ختم ہونا ہوتا ہے۔ اس کا باپ بھی ختم ہو چکا تھا۔ افسوس ناک بات یہ تھی کہ پرائز بانڈ خریدا جا سکتا ہے مگر باپ خریدنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ سو وہ حالت افسوس میں تھا۔ اسے خبر بھی نہیں تھی کہ زندگی کتنی تیزی سے اپنے لبادے اتار کر اپنی برہنہ حقیقتیں اس کے سامنے لا رہی ہے۔



"یار! تم لائٹ بند کر کے کیوں نہیں سوتے؟" وہ چڑ کر بولا۔

کب سے تکیہ آنکھوں پر رکھے سونے کی کوشش کر رہا تھا مگر ٹیوب لائٹ کی روشنی سونے نہیں دے رہی تھی۔ کالج میں پڑھائی زوروں پر تھی اور وہ بہت ذہین نہیں تھا، اس لیے اسے کافی محنت کرنا پڑتی تھی اور اس چیز کا وہ عادی تھا۔ محنت کے ساتھ سحر خیزی اس کی دیہاتی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہاں پر نظام ذرا الٹا تھا۔ سب ہی لڑکے تاخیر سے سوتے تھے، اور تاخیر سے بیدار ہوتے تھے۔

"سونے کے لیے لائٹ نہیں آنکھیں بند کرنا ضروری ہوتا ہے بچے۔" سعدی کی آواز میں قطعیت تھی۔ وہ چت لیٹا تھا۔ سر کے نیچے تکیے کے علاوہ موٹا سا فلور کشن بھی رکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ خود بھی صوفہ کم بیڈ لگ رہا تھا۔

"تمہیں ہوا کیا ہے...... تم سوتے کیوں نہیں؟" مرتضیٰ جھنجلا کر اٹھ بیٹھا۔

"مجھے لگتا ہے مجھے عشق ہو گیا ہے۔ میں اختر شماری کی کوشش کر رہا ہوں۔" وہ چھت کو تکتے ہوئے بولا تھا۔

"یہ ذلیل کام تم کمرے سے باہر جا کر کیوں نہیں کرتے؟" اس نے تپائی پر پڑا گلاس کھینچ کر اسے مارا جسے سعدی نے کیچ کر لیا۔

"میں ہوں ذرا مختلف مزاج کا آدمی۔ مجھے انوکھے کام کرنا اچھا لگتا ہے۔ اس لیے میں کمرے میں رہ کر اختر شماری کر رہا ہوں۔"

اس کے انداز میں لاپروائی کا عنصر نمایاں تھا۔

"اچھا تو کتنے اختر گن لیے؟" وہ زچ ہو کر بولا۔

"افسوس...... صرف ایک...... ہاسٹل میس کا کک...... اختر عباس۔"

اس کے لہجے میں افسوس گھلا ہوا تھا۔

"اختر عباس!" مرتضیٰ نے دہرایا۔ اس کے لہجے میں کڑواہٹ تھی۔ اختر عباس کسی کو بھی پسند نہیں تھا۔ سب اسے الٹے سیدھے مختلف ناموں سے پکارتے تھے۔ سعدی اسے "چپلی کباب" کہتا تھا۔

"میری بات مانو مسٹر سعدی! اختر شماری چھوڑ کر دختر شماری شروع کرو۔ ایک ہاتھ نبض پر رکھو، دوسرے ہاتھ کو بازو کے ساتھ لگا رہنے دو۔ اور پھر ایک ایک کر کے ارد گرد رہنے والوں کی دختران نیک اختروں کو یاد کرنا شروع کرو جس دختر کے نام پر دل کی دھڑکن اور نبض ایک ساتھ دوڑیں کل صبح اسی کو پرپوز کر دو۔ صبح ہونے میں بارہ گھنٹے ہیں۔ اس لیے ابھی سو مر جاؤ۔ اس منحوس ٹیوب لائٹ کو بھی سونے دو اور مجھ معصوم پر بھی رحم کرو۔"

"ابھی صرف ساڑھے آٹھ ہوئے ہیں۔ مجھے نیند نہیں آ رہی یار۔ اتنی جلدی کیسے سو جاؤں۔" وہ بے بسی سے بولا تھا۔

"میرا کل مطالعہ پاکستان کا ٹیسٹ ہے...... میں نے کچھ یاد نہیں کیا۔ سوچا تھا صبح اٹھ کر یاد کر لوں گا۔"

مرتضیٰ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔

"مطالعہ پاکستان بھی بھلا یاد کرنے والا مضمون ہے۔ دو قومی نظریہ، چودہ نکات، قرارداد مقاصد و مسئلہ کشمیر اور خارجہ پالیسی، یہ سب میں نے 8th اسٹینڈرڈ میں یاد کیے تھے۔ اب تک اسی کے سہارے پاس ہو جاتا ہوں اور مارکس بھی کبھی نائنٹی پرسنٹ سے کم نہیں آئے۔"

مرتضیٰ ہی کے انداز میں بیٹھ کر مونچھوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے وہ اپنے متعلق بتانے لگا۔ مرتضیٰ نے خود کو اُس کے ساتھ ملانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا سعدی ایک آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ ہے۔ وہ جس چیز کے لیے بہت پریشان ہوتا تھا سعدی کو اسی چیز پر دسترس حاصل تھی۔ بلکہ وہ کمبخت چیز یعنی انگریزی اس کا پسندیدہ مضمون تھا۔ سعدی کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کا دھیان اپنے گاؤں کی سمت چلا گیا۔ وہاں وہ اچھا خاصا پڑھا لکھا لڑکا تھا لیکن یہاں آ کر اپنے ارد گرد بسنے والے ذہین و فطین لوگوں کو دیکھ کر اسے احساس ہوا تھا کہ آگے بڑھنے کے لیے اسے زیادہ سے زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔

اسے ایک دم سے اماں جی کی یاد آ گئی۔ جو یہ سمجھتی تھیں کہ ان کے بیٹے سے زیادہ کوئی پڑھتا ہی نہیں ہو گا۔ ایک بار وہ ہائی سکول کی لائبریری سے بہت منت سماجت کر کے انگلش کی ڈکشنری لے آیا تھا۔ اماں جی اور ابا جی اس ڈکشنری کو ہاتھ میں لے کر تولتے اور ہولتے رہے تھے۔

"اتنی وزنی پڑھائی، توبہ توبہ......!" توبہ استغفار کرتے رہنا اماں جی کا تو من پسند مشغلہ تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" سعدی نے اس کی محویت کو توڑا۔

"یاد کر رہا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"کسے؟" سعدی نے چونک کر پوچھا۔ انداز میں اشتیاق بھی تھا۔

"اماں جی کو۔" مرتضیٰ کے چہرے پر مسکراہٹ کی پرچھائیں گہری ہوئی۔

"دھت تیرے کی۔ میں تم سے عشق و عاشقی کی باتیں کر رہا ہوں اور تم ماں جی کو یاد کرنے لگے۔ اس سے بہتر ہے بندہ کامن روم میں جا کر ٹی وی دیکھ لے۔" وہ چارپائی سے ٹانگیں لٹکا کر چپلیں پہننے لگا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' وہ بھی فٹافٹ چپل پہن کر ساتھ ہولیا۔

کوریڈور میں اتنی گہما گہمی نہیں تھی۔ ابھی زیادہ ٹائم بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ دونوں کامن روم کی طرف بڑھنے لگے۔ مرتضیٰ کے دل میں جانے کیا آئی کہ چلتے چلتے ایک کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اس نے بہت آہستگی سے یہ کام کیا تا کہ اندر موجود رضوان کو احساس نہ ہو کہ وہ قید کیا جا چکا ہے۔ رضوان اسی کا کلاس میٹ تھا اور کافی ہنس مکھ سا لڑکا تھا۔

دروازے کی کنڈی لگا کر وہ سیدھا ہی ہوا تھا کہ آواز آئی۔

''لاک بھی لگا دو۔''

''نہیں یار! رضوان غصہ کرے گا۔ میں نے اس سے انگریزی کے نوٹس لینے ہیں۔'' اس نے اپنی طرف سے سعدی کو جواب دیا تھا۔ مگر جب غور سے دیکھا تو چہرے پر کھسیانی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''وہ...... میں دیکھ رہا تھا کہ کنڈی خراب تو نہیں ہے۔''

کھسیاہٹ چھپانے کو کچھ تو کہنا ہی تھا۔ رضوان نے زوردار قہقہہ لگایا۔ وہ ایسے خوش ہو رہا تھا جیسے کسی چور کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

''اچھی طرح سے دیکھ لے لالے! ڈرنے کی کیا بات ہے۔ میں یہاں تیری حفاظت کے لیے ہی کھڑا ہوں۔''

وہ اس کا کندھا تھپتھپا کر بولا۔ مرتضیٰ بھی خجالت سے ہنس دیا۔

''اس شرارت سے انگریزی کے نوٹس کا کوئی تعلق نہیں ہے سمجھے۔'' رضوان ہنستا رہا پھر اسے کمرے کے اندر آنے کی دعوت دی۔

''نہیں یار! میں اور سعدی ذرا کامن روم میں جا رہے تھے۔ میں ادھر رک گیا یہ سعدی کہاں گیا؟''

اسے اچانک احساس ہوا تھا کہ سعدی منظر سے غائب ہے۔

''وہ کامن روم میں چلا گیا ہوگا۔ وہ تو بہت مغرور بندہ ہے بھئی!'' رضوان نے وہی رائے دی جو تھرڈ ایئر کے اکثر طالب علم سعدی کے بارے میں دیتے تھے۔ وہ رضوان کو ٹال کر کامن روم کی طرف آ گیا۔ وہاں خوب رش لگا ہوا تھا۔ ٹی وی پر آٹھ بجے کا ڈرامہ دیکھنا بہت سے لڑکوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ مرتضیٰ کو ٹی وی دیکھنے کا شوق تو بہت تھا مگر وہ کمرے میں رہ کر سعدی کے ریڈیو سے جی بہلا لیتا تھا۔ سعدی کامن روم میں اپنے فورتھ ایئر کے گروپ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ مرتضیٰ، طلحہ وغیرہ کے ساتھ براجمان ہو گیا۔ سب انتہائی خشوع وخضوع سے ٹی وی کی جانب دیکھ رہے تھے۔

''سب کے سب آٹھ بجے سے نو بجے تک نماز ڈرامہ ادا کرتے ہیں۔ اللہ انہیں معاف کرے اور مجھے بھی۔ جماعت کی امامت تو میں ہی کرواتا ہوں۔'' طلحہ نے اس کے بیٹھتے ہی چٹکلا چھوڑا۔

''کرن کہانی ٹیلی کاسٹ ہو رہا ہے۔'' دوسری طرف بیٹھے عاطف نے خوشی سے بھرپور لہجے میں بتایا۔ سارا زور کرن کہانی کے بجائے صرف ''کرن'' پر تھا۔

''کرن کو کیا ہو رہا ہے؟'' پیچھے سے راشد جو شاید ابھی ابھی آیا تھا تڑپ کر پوچھنے لگا۔

''کرن سب کے خوابوں کی ملکہ ہے۔'' اس بار بھی طلحہ نے معلومات بہم پہنچائی تھی۔

اشارہ ڈرامہ کے مرکزی کردار کی جانب تھا۔ جس کا مرتضیٰ کو نہیں پتا تھا۔ ''یارو! کرن کو اتنے غور سے نہ دیکھا کرو۔ یہ تمہاری ہونے والی بھابی ہے۔''

یہ آواز کامن روم کے ایک کونے سے آئی تھی۔ وقفہ ہو چکا تھا اور ٹی وی پر اب اشتہار دکھائے جا رہے تھے۔

''پرسوں تُو نے بشریٰ انصاری کو ہماری بھابی بنا دیا تھا۔ آج روحی بانو ہماری بھابی بن گئی۔ کل بابرہ شریف پر بھی قبضہ کر لے گا۔''

یہ شکوہ بھی باآواز بلند پیچھے سے آیا تھا۔ پچھلی طرف فورتھ ایئر کے لڑکے بیٹھے تھے۔

''ایک کی گنجائش پھر بھی باقی ہے۔ اسلام میں چار کی اجازت ہوتی ہے نا۔''

فورتھ ایئر کا ایک اور لڑکا بولا تھا۔ کامن روم کشتِ زعفران بن گیا تھا۔

''نرا نقصان کا سودا ہے۔ ہم نہیں کھیلتے۔ سارے اچھے مال پر تو فورتھ ایئر نے قبضہ کر لیا ہے۔''

اس بار طلحہ نے اعتراض کیا۔

''لڑو نہیں بیٹا! ٹاس کر لو۔ مالِ غنیمت میں بزرگوں کا خیال ضرور رکھنا۔''

یہ فورتھ ایئر کا وہی لڑکا تھا جس نے شکوہ کرنے میں پہل کی تھی۔ اسی دوران وقفہ ختم ہوا اور ڈرامہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

''شی...... شہ...... شہ...... شہ اب کوئی نہیں بولے گا۔'' ڈرامہ شروع ہوتے ہی سب باری باری سب کو تلقین کرنے لگے۔

مرتضیٰ نے پہلے بھی اس سیریل کی کچھ قسطیں دیکھ رکھی تھیں۔ اسے بھی اس میں بہت دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ ڈرامے کا ہیرو بھی اسکرین پر نمودار ہو چکا تھا۔

''یہ ہیرو ہے؟'' اس نے اسکرین پر نظر آنے والے لمبے، دبلے پتلے لڑکے کو دیکھتے ہوئے طلحہ سے پوچھا۔

کرن کا ہیرو تو ان شاء اللہ میں بنوں گا...... طلحہ نیازی...... بی اے ایل ایل بی...... یہ جاوید شیخ ہے۔''

طلحہ نے بہت آہستگی سے کہا تھا اور پیچھے بیٹھے لڑکے سے ایک کرارا مکا کھایا تھا۔ آواز ذرا سی بھی بلند ہوتی تھی تو پیچھے بیٹھے لڑکے تھپڑ اور مکے مارنا شروع کر دیتے تھے۔ سب کی توجہ اسکرین کی جانب تھی۔ جاوید شیخ کی روحی بانو کے ساتھ مزے مزے کی اٹھکیلیاں شروع ہو چکی تھیں۔ کامن روم میں بیٹھا ہر لڑکا خود کو جاوید شیخ اور روحی بانو کو باقی سب کی بھابی سمجھ رہا تھا کہ یک دم بجلی چلی گئی۔

''ہاہ...... ہاہ...... ہائے...... اوہو...... بیڑا غرق۔''

جیسی آوازیں چاروں طرف سے بلند ہوئی تھیں۔ اچھی خاصی ہاہا کار مچ گئی تھی۔ پھر کسی نے اٹھ کر سوئی گیس سے چلنے والے لیمپ روشن کر دیئے۔ لڑکے اٹھ کر باہر جانے لگے۔ جن کی امید ابھی عالم نزع میں تھی وہ وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ مرتضیٰ کے دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ وہیں بیٹھے بیٹھے روحی بانو کی نقل اتارنے لگا۔ وہ وہی ڈائیلاگ بول رہا تھا جو چند لمحے پہلے ''کرن'' ٹی وی اسکرین پر بول رہی تھی۔ سناٹا تھا سو آواز کی گونج بھی زیادہ تھی۔

''یہ کون بولا؟'' کسی نے پوچھا۔

''سلانوالی کے پہلوان۔'' طلحہ، مرتضیٰ کی پشت تھپتھپاتے ہوئے سراہنے والے انداز میں بولا۔

''واقعی؟'' ملی جلی آوازیں آئی تھیں۔

''یار...... پھر کر کے دکھاؤ۔'' اب کی بار فرمائش آئی۔ مرتضیٰ جھینپا ضرور مگر پھر دوبارہ سے ویسی ہی نقالی کرنے لگا جیسے پہلے کی تھی۔

"جاوید شیخ کی نقل کرو یار......! بھابی جان کو بخش دو۔" طلحہ کا انداز شرارتی تھا۔

"مرتضیٰ کو جاوید شیخ کے ڈائیلاگ یاد نہیں تھے، مگر انداز از بر تھا اسی لیے لیمپ کی روشنی میں وہ وہاں موجود لوگوں کو رنگ اور قد کے علاوہ جاوید شیخ ہی لگا تھا۔

"اس سے کہو ہیڈ کلرک نفیس صاحب کی کاپی کر کے دکھائے۔ بہت زبردست کرتا ہے۔" سعدی نے پہلی بار اس ساری گفتگو میں حصہ لیا تھا، مرتضیٰ نے ایک دفعہ کسی بات پر غصے میں آ کر اسے نفیس صاحب کی نقل کر کے دکھائی تھی۔ پُرزور فرمائش پر اسے کامن روم میں یہ بھی کرنا پڑا۔ سب نے تالیاں بجا کر داد دی تھی۔

"واہ یار! تم تو چھپے رستم نکلے۔ کمال کر دیا۔ زبردست......"

ہر طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ مرتضیٰ کو اس پذیرائی پر دل ہی دل میں بہت خوشی ہوئی تھی۔ اسے کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ کسی کی نقل کرنا اتنا دلچسپ بھی ہو سکتا ہے۔ اس دن کے بعد سے اس کے دوستوں کے ہاتھ یہی مشغلہ آ گیا تھا، وہ سب جب بھی فراغت سے بیٹھتے۔ اس سے یہی فرمائش کی جاتی کہ "کرن بن کر دکھاؤ۔"

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا راز داں اپنا

سعدی نے لہک کر شعر مکمل کیا اور داد طلب نظروں سے مرتضیٰ کی جانب دیکھنے لگا۔ جس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

"یہ شعر تمہارا اپنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں......"

"تم نے خود لکھا ہے۔" مرتضیٰ نے گھور کر پوچھا تھا۔

"ہاں......" سابقہ بے نیازی سے جواب دیا گیا۔

"لیکن...... یہ تو غالب کا ہے۔" مرتضیٰ اس کے پُر یقین لہجے سے دھوکا کھا گیا تھا مگر یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ غالباً اس نے یہ شعر پہلے کہیں پڑھ رکھا تھا۔ سعدی نے اس کی بات پر حیرانی سے اسے دیکھا پھر ڈھٹائی سے بولا۔

"میں غالب کو غیر نہیں سمجھتا۔ وہ بندہ پرور بھی تو اپنا ہے۔"

"تم نے کہا تھا، تم نے خود لکھا ہے۔" وہ دوبارہ سے کتاب پر نظریں جما کر بولا۔

"قسم سے میں نے خود لکھا ہے۔ غالب کا دیوان کھولا اور اپنے ہاتھوں سے غالب کی کئی غزلوں کو لکھ لیا۔"

وہ اب بھی شرمندہ نہیں تھا۔ مرتضیٰ کچھ بولے بغیر کتابوں کی جانب متوجہ تھا۔ اس کا پوئٹری کا ٹیسٹ تھا۔ سعدی کافی ذہین اسٹوڈنٹ تھا۔ مگر اسے پڑھنے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ یا کم از کم مرتضیٰ نے اس کو کتابی کیڑے کی طرح کبھی پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہترین اسکوائش پلییئر اور سوئمنگ کا چمپئن تھا۔ لکھنے لکھانے سے بھی شغف تھا۔ اور انگریزی بھی کمال کی بولتا تھا۔ کالج میں اس کی کافی دھوم تھی۔ مرتضیٰ نے کالج میں ہی سینئرز سے سنا تھا کہ سعدی کی نظر رول آف آنر پر ہے۔ جب کہ سعدی اپنے منہ سے اپنے بارے میں بہت کم بات کرتا تھا۔ کالج میں اس کی واہ واہ تھی تو ہاسٹل میں اس کو ناپسند کرنے والے بھی بہت تھے۔ مرتضیٰ کو اس بات سے غرض نہیں تھی کیونکہ سعدی اس پر بہت مہربان تھا۔ اس نے واقعی اسے بڑا بھائی بن کر بہت ساری باتوں کی اچھائی برائی کے متعلق بتایا تھا۔ اس بات سے انکار نہیں کہ اس کے مزاج میں بے نیازی تھی۔ جو دوسروں کو نخرہ اور غرور محسوس ہوتا تھا، مگر مرتضیٰ اس چیز کو ہنس کھیل کر برداشت کرتا تھا۔ اسے لگتا یہ بے نیازی

سعدی کا حق ہے، کیونکہ یہ اس پر جچتی تھی۔

"کس سوچ میں گم ہو؟" سعدی نے اسے کھویا ہوا دیکھ کر پوچھا۔

"پڑھ رہا ہوں۔ ٹیسٹ ہے کل۔" کتاب کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔ اسے یہ تو کہہ نہیں سکتا تھا کہ تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں اور رشک کر رہا ہوں۔

"میری مدد کی ضرورت تو نہیں؟" سعدی نے پیش کش کی۔ وہ چارپائی پر لیٹا تھا۔

مرتضیٰ نے اس کی جانب دیکھا پھر مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ دل سے اس بندے کے خلوص کی قدر کرتا تھا۔

"میں ذرا ہادی سے مل کر آتا ہوں۔" سعدی نے چارپائی سے اترتے ہوئے بولا۔

"ان کو بھی اپنے تازہ اشعار سنا کر آتا ہوں۔" اب وہ سلیپرز پہن رہا تھا۔

"لازمی تو نہیں یار کہ غالب کو سب نے ہی پڑھ رکھا ہو۔" دروازہ کھلنے سے پہلے مرتضیٰ نے سعدی کو ہنس کر کہتے ہوئے سنا تھا، پھر وہ باہر نکل گیا۔ ہاسٹل میں چند گنے چنے لڑکے تھے، جن کی سعدی سے خوب بنتی تھی، ہادی انہی خوش قسمت لڑکوں میں سے ایک تھا۔

اکتوبر کے بعد نومبر آ پہنچا۔ موسم کی تبدیلی زندگی کے معمولات پر معمول کی طرح اثر انداز ہونا شروع ہوئی۔ لڑکے چونکہ لڑکیاں نہیں تھے اس لیے گرم شالیں اور کپڑے وغیرہ نکالنے میں جلدی نہیں مچی تھی۔ مگر پنکھے چلنے بند ہو گئے تھے۔ سونے جاگنے اور اٹھنے بیٹھنے کے معمولات میں خاطر خواہ تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ گرمیوں میں دوپہر سے شام گئے تک سب سوتے رہتے تھے۔ اب چونکہ شام کو خود سونے کی جلدی ہوتی تھی اس لیے شام کی نیند اکثر لوگوں نے ترک کر دی تھی۔ یا پھر دورانیہ کم ہو گیا تھا۔

سردی کے آتے ہی شام کی طبیعت میں خنکی اور اداسی کا عنصر بڑھ گیا تھا۔ کالج میں پڑھائی کی مصروفیات بھی ٹھیک ٹھاک تھیں، لیکن پھر بھی ایک چھٹی کر کے مرتضیٰ گاؤں کا چکر لگا آیا تھا۔

سردیوں کے کپڑے، مخصوص سوغاتیں اور روپے اس کے پاس گاؤں جانے کے بہت سے جواز تھے، ایک دن بعد ہی وہ واپس آ گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس کا دل گاؤں میں نہیں لگا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اسے لگا وہ ایک دن سے زیادہ یہاں رہا تو یہاں سے کبھی واپس نہیں جا سکے گا۔ ابا جی اس کے لیے اتنے اداس تھے کہ ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ اسی لیے اسے خدشہ لاحق ہوا کہ یہ جذباتی بلیک میلنگ اس کے ارادے میں دراڑ نہ ڈال دے۔ آنے کو تو وہ گاؤں سے آ گیا تھا مگر پھر بہت دن اداس رہا۔

ایسی ہی ایک خنک اداس شام میں سعدی کی تازہ غزلیں سن کر وہ باتھ روم جانے کا بہانہ کر کے کمرے سے نکل آیا، اس کا ارادہ تھا کہ ذرا باہر کا چکر لگا آئے یا کسی اور کے کمرے میں بیٹھ کر گپ شپ لگا لے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر فرسٹ فلور پر آ گیا۔ سردی کی وجہ سے سب کے کمروں کے دروازے بند تھے۔ وہ کوریڈور میں چہل قدمی کر رہا تھا جب عقب میں کسی کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

"جاپان!" وہ منہ لٹکا کر بولا۔ طلحہ اسی کا کلاس فیلو تھا۔

"اچھا فیصلہ ہے۔ تمہارے جیسے بونے کو وہیں ہونا چاہیے تھا۔" اتنا کہہ کر رمیز نے ٹھک سے دروازہ بند کر لیا۔ اس کا قد کاٹھ اونچا تھا اور وہ مرتضیٰ کو اکثر مذاق میں بونا کہتا تھا۔

طلحہ کے اس طرح کہنے پر کچھ لمحے اسی طرح کھڑا سوچتا رہا پھر واپس مڑ کر دستک دے کر انتظار کیے بنا دروازہ کھول کر منہ ڈالا اور تڑپ کر بولا۔

''ویوین رچرڈز کے ماموں زاد بھائی! تمہیں بھی ویسٹ انڈیز میں ہونا چاہیے تھا۔''

''میری معلومات میں اس گرانقدر اضافے کے لیے شکریہ۔ توقیر صاحب نے معاشیات کا ٹیسٹ نہ لینا ہوتا تو پہلی فلائٹ سے ویسٹ انڈیز چلا جاتا۔ ویسے ٹھنڈ پڑ گئی بدلہ لے کر؟''

اسی دوران ناصر بھی آ گیا تھا۔ رمیز اور ناصر شام میں کچھ بچوں کو ہوم ٹیوشن دیتے تھے، اسی لیے انہیں جانا تھا۔ مرتضٰی بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ کر باہر آ گیا۔ اقبال ہاسٹل کے لان میں بھی خوب رونق رہتی تھی۔ اس نے عقبی لان میں تھرڈ ایئر کے کچھ اسٹوڈنٹس کو بیٹھے دیکھا، وہ ان کی طرف آ گیا۔ وہ سب دائرہ بنا کر بیٹھے تھے، جب کہ اسفر درمیان میں کھڑا کچھ عجیب و غریب حرکتیں کر رہا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اپنے ساتھ بیٹھے رحیم سے کچھ پوچھا تھا، جس نے سردی کی وجہ سے ہاتھ جیکٹ کی جیب میں دے رکھے تھے۔

''پریکٹس کر رہا ہے...... کل Annual Play کے لیے آڈیشنز ہو رہے ہیں، بخاری آڈیٹوریم...... میں......''

مرتضٰی نے سر ہلایا۔ وہ بہت دلچسپی سے اسفر کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''تم آڈیشن دو گے نا؟'' رحیم نے پوچھا۔ مرتضٰی نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ دراصل اس نے اس بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ کسی بھی Annual Play کے متعلق وہ جانتا ہی نہیں تھا، اس لیے دل و دماغ میں مچتی خوشگوار سی ہلچل کو چھپا کر وہ اسفر کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''اوئے لالے...... آڈیشن دے گا؟'' رضوان جو اس کے بالمقابل دائرے کی دوسری سمت میں بیٹھا تھا، اس کی جانب دیکھ کر استفسار کیا۔

''مرتضٰی! تم آڈیشن ضرور دینا۔'' اس نے ابھی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ عاطف بول پڑا۔ سب ہی واقف تھے کہ وہ بے حد اچھا نقال ہے۔

''اس کو آڈیشن کی کیا ضرورت...... یہ اس کے بغیر بھی سلیکٹ ہی سمجھو۔'' یہ نہ جانے کون بولا تھا پھر وہاں بیٹھے سب ہی لڑکے اسے مشورے دینے لگے۔ وہ کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے سر جھکا کر ''نہیں، نہیں'' کہتے ہوئے انہیں ٹالتا رہا مگر دل میں کتنے ہی بڑے بڑے غبارے اوپر سے اوپر اٹھ رہے تھے۔

''میں Annual play کے لیے آڈیشن دے رہا ہوں۔'' اس نے رات کو پُر جوش انداز میں سعدی کو بتایا۔

''ہوں...... That s good...... تمہیں دینا چاہیے۔'' سعدی کسی اسائمنٹ میں الجھا تھا مگر پھر بھی وہ اسے وِش کرتے ہوئے بولا۔



دھوکا دہی کوئی ایسی انوکھی بات بھی نہیں تھی کہ وہ یہ کام کرتے وقت جھجک محسوس کرتا مگر مسئلہ یہ تھا کہ یہاں اس کا مقابلہ موت جیسے بڑے عفریت سے پڑا تھا، وہ اس لیے تذبذب میں گھر گیا تھا کہ اسے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے احساسات کو کس طرح کیموفلاج کرے، وہ کس طرح لوگوں کا سامنا کرے۔ اس کے دل میں جھنجلاہٹ کے سوا کوئی جذبہ یا احساس اُبھر ہی نہیں رہا تھا۔

وہ مرنے والے کے لیے محبت محسوس کر رہا تھا نہ نفرت۔ سو اسے باہر جا کر لوگوں کے سامنے کس طرح بیٹھنا ہے، کیا کہنا ہے، کیا نہیں کہنا ہے۔ فی الحال اسے یہ مسائل لاحق تھے اور اگر لمحہ بھر کے لیے بھی وہ ان مسائل کی جکڑن سے سکون پاتا تھا تو اس کا دل عجیب سی لاچار کیفیت میں گھر جاتا تھا۔ افسوس اور ملال صرف لمحہ بھر کے لیے اس کے دل میں ابھر رہا تھا اور پھر اپنا اثر چھوڑے بغیر ڈوبتا جا رہا تھا۔ اسے بالکل خبر نہیں تھی کہ اگلا لائحہ عمل کیا ہوگا۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ انسان کو اس کی آخری منزل تک پہنچانے کے لیے دعائے مغفرت کے علاوہ کن کن چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔

وہ انسان جو ہمہ وقت ''سوچ'' کو کوستا ہے کہ یہ تکلیف دہ کیفیت اسے کیوں ودیعت کی گئی یا وہ انسان جو اس امر کو اپنی بدنصیبی قرار دیتا ہے کہ اسے سوچنے والا دل کیوں دیا گیا۔ اگر وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس خالی الذہن کیفیت کی تکلیف کو محسوس کرے تو ساری زندگی شکر کرتا نہ تھکے۔ کم از کم اپنے باپ کے کمرے میں بیٹھے اس نوجوان کی تو یہی حالت تھی۔

''اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' یہ وہ سوال تھا جو اس کے ذہن میں کبوتر کی طرح چک پھیریاں لے رہا تھا۔ اس سوال میں فی الحال رنج تھا۔ ایسا رنج جو یک دم ایک نئی اور تکلیف دہ صورتِ حال کو محسوس کرنے کی ابتدائی کیفیت میں ہو سکتا ہے۔

وہی رنج اس کو لاحق تھا۔ اس کی توانائیاں مضمحل ضرور ہوئی تھیں مگر ختم نہیں ہوئی تھیں، اس لیے وہ یہی سوچ رہا تھا۔

''اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

اس کے ذہن کو ابھی کوئی راہِ فرار نہیں ملی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی پھر کوئی اندر داخل ہوا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بے وجہ چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

''گھر میں برف بالکل نہیں ہے...... گرمی زیادہ ہو گئی ہے...... برف چاہیے۔'' اکبر نے جھکی آنکھوں سے مدعا بیان کیا۔

''برف کا کیا کریں گے؟'' اس نے حیرانی سے استفسار کیا۔

''میت کو ٹھنڈا رکھنا ضروری ہے اور پھر گھر میں اتنے لوگ بھرے ہیں، سب کو منٹ منٹ بعد پیاس محسوس ہونے لگتی ہے۔ بہت ساری برف کی ضرورت ہے۔''

وہ سابقہ انداز میں بولا۔ اس کے لہجے میں بہت سے آنسوؤں کی نمی گھلی تھی لیکن یہ نمی باسی ہو چکی تھی۔ وہ شاید بہت پہلے بہت سا رو چکا تھا۔ اکبر ان لوگوں میں سے تھا، جو اس کے باپ کے آخری سفر کی پہلی دستک پر اس کے ہمراہ تھا۔ اس کے باپ نے اکبر کے ہاتھوں میں زندگی کو آخری سلامی پیش کی تھی۔

''میت'' اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

''ایک ہچکی انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی، میت بنا دیتی ہے۔''

''میت کو ہال میں لے آتے ہیں...... ہال میں انٹرل کولنگ سسٹم ہے...... وہاں...... بہت......''

وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔

''وہاں میت ٹھیک رہے گی...... جنازہ تو عشاء کے بعد ہے نا......''

اب وہ اکبر کی جانب سے رخ پھیر کر اپنی قمیص پہن رہا تھا۔

''مامی کہہ رہی ہیں، ہال میں میت کو نہلانے کے بعد رکھیں گے، وہاں اتنی جگہ نہیں کہ سب لوگ سما سکیں۔ اگر ایسا کریں گے تو اے سی کی کولنگ بھی بے کار ہو جائے گی اور حبس بڑھنے سے خواہ مخواہ لوگوں کا دم گھٹے گا۔''

اکبر اسے پیغام پہنچانے آیا تھا، پہنچا کر چلا گیا۔

''میت...... مگر...... موت...... میں...... ہمت...... مدد...... میرے خدا......'' وہ ایک بار پھر گرنے کے سے انداز میں بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہا، وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تکیہ سر پر رکھے اور کم از کم پورے چوبیس گھنٹے کے لیے سو جائے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا، اسے نیند کی اشد ضرورت ہے مگر وہ سو کیسے سکتا تھا۔

''برف چاہیے......'' اس کے کانوں میں اکبر کی آواز گونجی۔ اس نے سلیپر میں پاؤں ڈالے اور باہر کی جانب چلا۔ دروازے تک پہنچ کر اسے کچھ یاد آیا۔ ساڑھے انیس سو کے یہ سلیپر جب پہلی مرتبہ اس کے باپ نے دیکھے تھے تو اس کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہو گئے تھے۔ اسے یاد تھا، وہ تاثرات کیسے تھے۔ اس نے ان تاثرات کو اپنے چہرے پر طاری ہوتا محسوس کیا اور پھر اس کے بائیں پہلو میں درد کی ایک لہر اٹھی۔

''کیا انہوں نے یہی درد محسوس کیا ہوگا؟'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔ درد کی کوئی تشریح یا وضاحت کہاں ہوتی ہے کہ کوئی اس کے متعلق کسی کو توضیح پیش کر سکے مگر اس کا دل چاہا کہ وہ کیفیت جو اس نے محسوس کی ہے، وہ اسے مجسم دیکھ پاتا۔ وہ اس درد کی ہیئت کا اپنے باپ کے درد سے موازنہ کرتا اور پھر دیکھتا کہ ساڑھے انیس سو کا وہ چمڑا جو اس نے پاؤں میں پہن رکھا تھا، وہ ان دونوں میں سے کس کے لیے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا تھا۔ اسے لگا وہ سلیپرز پوری قوت سے اس کے سر پر بج رہے ہیں۔ ایک جھٹکے سے اس نے انہیں اپنے پاؤں سے علیحدہ کر دیا اور واش روم کے باہر پڑے ہوائی چپل پاؤں میں ڈال لیے۔ یہ اس کا ایک انتہائی اضطراری عمل تھا۔ یہ سب اس نے کیسے اور کیوں کیا اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

ان ہی سلیپرز کو پہنے وہ باہر آ گیا تھا۔ اب کی بار وہ لاؤنج سے گزرا تو وہاں بیٹھی خواتین نے اسے بہت غور سے دیکھا اور پھر دیکھتی رہی تھیں۔ اسے ان کی نگاہوں سے از حد الجھن ہوئی۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے وہ کوئی ہیرو ہو۔ ان کی نگاہوں نے اس کے تاسف اور ملال کو بڑھا دیا تھا۔ وہ اس کیفیت سے دامن چھڑاتا ایک بار پھر کار پورچ کے سامنے گھاس کے قطعے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ دھوپ کی شدت میں تیزی آ چکی تھی اور واقعی سارا گھر سسکیوں، آہوں اور لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔

لان کا پچھلا مین حصہ جہاں اس کے باپ کی میت رکھی تھی، وہاں کسی بوڑھی عورت کے کُرلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گاؤں سے شاید گاڑی بھر کر غریب دیہاتی رشتہ دار آ چکے تھے۔

''برف لانے کے لیے پیسے دے دیں۔''

ان کا ملازم اس کو دیکھتے ہی بھاگا آیا تھا، اسے نہیں پتا تھا کہ برف لانے کے لیے کتنے روپے درکار ہوتے ہیں۔ اس نے قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کا والٹ بیڈ روم میں رہ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ، والٹ منگوانے کے لیے ملازم کو دوڑاتا۔ انکل صدیق نے اپنے والٹ سے روپے نکال کر اسے دے دیئے۔ شرمندگی کی ایک اور لہر اس کے گرد ہلکورے لینے لگی۔ وہ اس کے قریب چلے آئے اور انہوں نے ایک بار پھر اسے خود سے لپٹا لیا۔ ان کے وجود سے امپورٹڈ پرفیوم کی مہک اٹھ رہی تھی۔ ان کی شخصیت یہاں موجود سب لوگوں سے شاندار تھی۔ اسے ان ہی سے سب سے زیادہ خوف محسوس ہوا۔

''زندگی ریورس ہو سکتی تو میں اسے دس سال پیچھے لے جاتا...... دس سال پہلے حالات اتنے تکلیف دہ نہیں تھے...... حقیقت یہ ہے کہ میں انہیں ابھی بھی تکلیف دہ نہیں سمجھتا تھا...... مجھے...... پتا ہی نہیں چلا...... کہ...... وہ...... تمہارا باپ......

اتنے مصائب سہہ رہا ہے...... بہت اچھا انسان تھا وہ۔''

انکل صدیق اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے دھیمے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ وہ انہیں انکل صدیق ہی کہتا تھا۔ حالانکہ اس کے باپ کی خواہش تھی کہ وہ انہیں چچا کہے مگر وہ شروع سے ہی ان کی مرضی کے خلاف کام کرتا تھا۔

''میری اس سے آخری ملاقات...... پانچ سال پہلے ہوئی تھی...... میں اس پر بہت غصہ ہوا مجھے پتا تھا، وہ گاؤں چھوڑ چکا ہے...... مگر...... میں نے اسے...... بہت ڈانٹا...... وہ ہنستا رہا...... وہ شروع سے...... ایسا ہی تھا۔'' انکل صدیق کا لہجہ بدل رہا تھا۔ ان کی آنکھیں گیلی گیلی سی لگنے لگی تھیں۔

''مجھے...... اس کے...... ہنسنے پر بہت غصہ آیا۔''

''مجھے بھی آ جایا کرتا تھا۔'' ان کے منہ سے یہ سب سنتے ہوئے اس نے سوچا۔

''میں نے...... اس...... کی بہت...... بے عزتی کی...... وہ کچھ نہیں بولا...... میں نے...... اسے...... بے حد برا بھلا کہا...... جتنا کہہ سکتا تھا...... اتنا ہی کہا...... میں نے اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی...... میں......''

وہ خاموش ہو گئے تھے۔ اس نے انہیں آنکھوں کو صاف کرتے دیکھا۔ ان کی باتوں کے جواب میں اسے کیا کہنا چاہیے، اسے نہیں پتا تھا۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح خاموش کھڑے رہے۔

''میں...... جانتا ہوں...... وہ مجھ سے بہت...... محبت کرتا تھا...... میں نے...... اس...... کی محبت کی...... قدر ہی نہیں کی...... گاؤں سے شہر آ جانے کے بعد...... وہ جب بھی مجھے ملا...... میں نے اسے اور اس کی محبت کو ایکسپلائٹ کیا...... وہ کچھ نہیں کہتا تھا، کچھ بھی نہیں...... اسے تم سے...... بہت محبت تھی...... میری ہر پھنکار کے جواب میں مسکرا کر کہتا...... انسان کب تک اپنے لیے جیے...... اسے اولاد کے لیے جینا پڑتا ہے۔ کہتا، میں واپس نہیں جاؤں گا...... میرا بیٹا گاؤں میں نہیں رہ سکتا...... اور میں اسے مزید برا بھلا کہتا...... وہ واقعی بہت اچھا...... انسان تھا...... اس کا چہرہ دیکھو...... ایسے پُرسکون ہو کر لیٹا ہے، جیسے اس دنیا سے چلے جانا اس کی سب...... سے بڑی...... خوش قسمتی ہو۔''

وہ ایک بار پھر آنکھوں کے کنارے صاف کر رہے تھے۔ انہوں نے اسے ایک بار پھر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ انہوں نے اس کی پیشانی کو چوما۔ ان کی آنکھوں میں ملال کے رنگ تھے۔ ان کے وجود سے اٹھتی امپورٹڈ پرفیوم کی مہک یک دم کافور کی مہک میں تبدیل ہو گئی تھی۔

O......❖......O

O that this too solid flesh would melt. thaw and resolve itself into a dew or that the everlasting had not fixed his conon against self slaughter.

O God O God.

اس نے ابھی یہاں تک ڈائیلاگز ادا کیے تھے کہ واسع نے اسے روک کر ہاتھ کے اشارے سے اسے سامنے سے ہٹ جانے کے لیے کہا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ بغور واسع کی جانب دیکھا۔

''آپ اِدھر بیٹھو...... ہاں جی نیکسٹ پلیز۔'' اس نے اُکتا کر کہا۔ مرتضٰی منہ لٹکا کر دھیمی چال چلتا اس سمت میں کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہاں پہلے سے کچھ اور لڑکے بھی براجمان تھے۔ وہ سب آڈیشن دے کر فارغ ہو چکے تھے۔ مرتضٰی نے سب

کے چہروں کی جانب بغور دیکھا۔ کسی چہرے پر ویسی مایوسی نہیں تھی جیسی وہ محسوس کر رہا تھا۔ مایوسی کے ساتھ ساتھ خفت بھی تھی جو اس کے دل و دماغ کا گھیراؤ کر رہی تھی۔ وہ جانتا تھا اس نے ڈائیلاگ کی ادائیگی میں گڑ بڑ کی ہے۔ یہ کسی بھی قسم کا آڈیشن دینے کا پہلا تجربہ تھا، سو وہ کافی گھبرایا ہوا تھا لیکن اس نے اس گھبراہٹ کو چھپانے کے لیے کافی کوشش کی تھی۔ اس کا ذاتی خیال تھا کہ اس نے ابتدا اچھے طریقے سے کی تھی، مگر درمیان میں اس کی نظر سامنے کھڑے کچھ لڑکوں پر پڑ گئی تھی جن کے چہروں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ نے اس کے اعتماد کو متزلزل کر دیا تھا پھر واسع کے چہرے پر پھیلی بیزاری بھی اسے جتا رہی تھی کہ وہ یہ کام نہیں کر سکتا۔ واسع کالج کا بیسٹ ایکٹر تھا۔ وہ گزشتہ تین سال سے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتا رہا تھا اور اب جس پروفیشنل انداز میں وہ آڈیشن لے رہا تھا، یہ بھی ثابت کرتا تھا کہ وہ اپنے کام میں واقعی منجھا ہوا ہے۔

''ہمیں یہاں کیوں بٹھایا ہے؟'' اس کے ساتھ بیٹھے اکبر نے کرسی پر بیٹھے ٹانگیں ہلاتے ہوئے سوال کیا۔

''ہمیں بے عزتی سے بچانا چاہتے ہیں، اس لیے۔'' طلحہ نے جواب دیا۔

''ہمیں سلیکٹ نہ کر کے انہوں نے ہماری جو بے عزتی کی ہے، اس کا ازالہ اس طرح کرسی پر بٹھا دینے سے تو نہیں ہو گا۔ مرتضٰی تجھ سے بھی کچھ نہیں کہا اس نے؟'' اکبر پھر بولا۔ ان سب کو حیرانی تھی کہ مرتضٰی بھی ریجیکٹ ہو چکا ہے۔

''ہاں، انہیں کم از کم ایک آر سی کولا تو ہمیں پیش کرنی ہی چاہیے۔'' سفیر کی چہچہاتی ہوئی آواز بھی نکلی تھی۔ وہ سب ہنسنے لگے۔

''یہاں بٹھانے کا مطلب یہ کہ ہمیں ریجیکٹ کر دیا گیا ہے۔'' مرتضٰی نے اکبر کی جانب دیکھا۔

''شاباش اے بادشاہو! ایہہ داہور کی مطلب ہو سکدا اے۔'' وہ کان کھجا کر بولا۔ ''ویسے تجھے reject نہیں کرنا چاہیے تھا اس لمبو کو۔'' اشارہ واسع کی جانب تھا۔

''تو پھر ہم یہاں کیوں بیٹھے ہیں۔ ایسی کی تیسی ہیملٹ اور اس کے ہوتے سوتے واسع کی...... ہم جا رہے ہیں۔'' سب سے پہلے طلحہ اٹھا تھا پھر اکبر بھی اٹھ گیا۔

سفیر اور وہ کچھ دیر بیٹھے رہے پھر سفیر بھی چلا گیا۔ اب اس کے جاننے والوں میں سے سوائے اس کے کوئی موجود نہیں تھا۔ اردگرد دوسرے سیکشنز کے سینئرز، جونیئرز تھے جو اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ ان لوگوں کی جانب دیکھنے لگا جو یکے بعد دیگرے سامنے آ رہے تھے اور پرفارم کر رہے تھے۔ بہت سے لڑکے بہت اچھا بھی پرفارم کر رہے تھے۔ مرتضٰی کافی دیر تک ان ہی کی جانب متوجہ رہا۔ اسے یہ سب دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔ اسی دوران ایک لمبا مگر دبلا پتلا لڑکا آ کر پرفارم کرنے لگا تھا۔ اس کے ایک بار پرفارم کرنے پر ہی سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

''یہ ڈائیلاگز ریپیٹ کرو۔'' اس نے واسع کو کہتے سنا۔ اس لڑکے نے واسع کے لہجے سے حوصلہ پکڑ کر دوسری بار پہلے سے بھی زیادہ بہترین انداز میں پرفارم کیا تھا۔ واسع کے چہرے پر پسندیدگی بڑھی۔ وہ لڑکا وہی ڈائیلاگز بول رہا تھا جو مرتضٰی کو دیئے گئے تھے۔ مرتضٰی کو دکھ سا ہوا۔ اسے لگا یہ اس کے ساتھ حق تلفی ہو رہی ہے۔ کیونکہ وہ اسی انداز میں ڈائیلاگز ادا کر رہا تھا جس میں کہ وہ لڑکا ادا کر رہا تھا۔

''اب یہ والے ڈائیلاگز ادا کرو۔'' واسع نے اس لڑکے کو ایک کاغذ تھمایا تھا۔

وہ لڑکا بغور کاغذ کی جانب دیکھنے لگا۔ اس نے دوبار اونچی آواز میں ان ڈائیلاگز کو پڑھا اور پھر وہی کاغذ واسع کو واپس

پکڑایا وہ درمیان میں آ کھڑا ہوا۔ اس نے چند لمحے ایسے ہی کھڑے گزار دیئے جیسے کچھ سوچ رہا ہو پھر وہ یک دم دو قدم دھیرے سے آگے بڑھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بالکل بدل چکے تھے۔

Me by the wrist and held me hard

he took

goes he to the length of all his arm:

then

his other hand thus ever his brow.

and with

اس نے ابھی یہاں تک ہی کہا تھا کہ واسع نے تالیاں بجا کر اسے داد دی۔ پاس کھڑے لڑکے بھی اسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مرتضٰی بھی اس کے انداز سے کافی متاثر ہوا مگر دل ہی دل میں جلن بھی ہوئی۔ وہ لڑکا شاید کسی لڑکی کے ڈائیلاگ بول رہا تھا کیونکہ اس نے آواز کو بے حد باریک اور مترنم بنا کر ڈائیلاگز ادا کیے تھے۔

''تم ہی ہماری Ophelia بنو گے۔'' واسع نے اس لڑکے سے ہاتھ ملا کر کہا۔ مرتضٰی کا دل جل کر خاک ہو گیا تھا۔ وہ اب یہاں مزید نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اٹھتے اٹھتے اس کے دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ واسع سے اپنے متعلق پوچھنے کھڑا ہو گیا۔

''آئی ایم سوری یار! میں بندہ بہت اسٹریٹ فارورڈ ہوں۔ تمہارا خیال اگر ایکٹنگ کا ہے تو اسے دل سے نکال دو...... یہ تمہارے جیسے پینڈو کا کام نہیں ہے۔ میرا تمہیں مخلص مشورہ ہے، اپنا ٹائم ضائع کرو نہ توانائیاں...... یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے، میری صاف گوئی کا برا مت ماننا...... اگر تم مجھ سے خود نہیں پوچھتے تو میں تمہیں کبھی نہ بتاتا...... تم کبڈی شبڈی کھیلنے کی طرف دھیان دو قادر!''

واسع نے بہت محبت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دھلائی کا آغاز کیا۔

قادر کے نام پر مرتضٰی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اتنی دیر میں واسع آگے بڑھ چکا تھا۔ اسے مرتضٰی کا نام یاد نہیں تھا، اداکاری خاک یاد رہتی۔ مرتضٰی کو اس کے الفاظ فقط برے لگے تھے مگر انداز اور نام بھول جانے کی ادا تو بے حد بری لگی۔ وہ بوجھل قدم لیے بخاری آڈیٹوریم سے باہر آ گیا۔

○......❖......○

''تم نے ہیملٹ پڑھا ہے؟'' سعدی نے اس کے لٹکے منہ کو دیکھ کر نرم لہجے میں پوچھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے کارڈز سے نظریں ہٹا کر اس کی جانب دیکھا پھر فلور کشن پر پڑا کوئین کا کارڈ اٹھا لیا۔

''نہیں!'' کارڈز کو سیٹ کرتے ہوئے وہ بے دلی سے بولا۔ اس کا کھیلنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا مگر سعدی کا موڈ تھا، سو اس کے اصرار پر اب وہ دوسری باری کھیل رہے تھے۔ پہلی باری مرتضٰی ہی لیتا تھا مگر روز کی طرح اس نے جیت پر بھنگڑا نہیں ڈالا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سعدی جان بوجھ کر ہارا ہے۔

''ہیملٹ کون تھا، یہ پتا ہے؟'' سعدی نے اس کی بے دلی کو اہمیت دیئے بغیر دوسرا سوال پوچھا۔

''شیکسپیئر کے ڈرامے کا نام ہے۔'' اس نے دس کا کارڈ رکھتے ہوئے سابقہ انداز میں جواب دیا۔

''ڈرامے کے بچے! پلے میں ہیملٹ کون تھا۔ یہ پتا ہے؟'' سعدی نے وہی دس کا کارڈ اٹھا کر یکہ پھینکا تھا۔

"ہاں پتا ہے، بادشاہ تھا۔" وہ غرا کر بولا۔ سعدی اس کے تند لہجے پر چند لمحے اسی کی جانب دیکھتا رہا۔ مرتضیٰ کو احساس تھا کہ وہ اپنے لہجے سے سعدی کو ہرٹ کر چکا ہے۔

"مجھے نہیں کھیلنا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے سارے کارڈز پھینک دیئے۔

"ہارنے کے ڈر سے گیم چھوڑ دینے والے لوگ ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔" سعدی نے ابھی بھی تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔

"میں نے ہارنے کے ڈر سے گیم نہیں چھوڑا...... مجھے اس طرح کے کسی گیم میں حصہ لینا بھی اچھا نہیں لگتا جس میں میرے ساتھ جانبداری برتی جائے۔ تم جان بوجھ کر گیم ہار رہے ہو۔ پہلے تم نے کنگ پھینک دیا پھر یکہ بھی پھینک دیا۔ مجھے اس مہربانی کی ضرورت نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول نے صلہ رحمی کی تلقین کی ہے مگر یہ نہیں کہا کہ گیمز میں صلہ رحمی کی خاطر جان بوجھ کر ہار جاؤ۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"تمہیں کس نے کہا۔ میں گیم ہار رہا ہوں۔ یہ یکہ میں نے اس لیے پھینکا تاکہ تم اسے اٹھا کر کنگ کا کارڈ پھینک دو اور کنگ کا کارڈ میں نے اس لیے پھینکا تھا تاکہ تمہیں ڈاج دے سکوں۔ تم یکہ اٹھا کر کنگ پھینکتے تو میں اسے اٹھا لیتا اور اپنے پتے شو کر دیتا۔"

اس نے مرتضیٰ کے پھینکے ہوئے کارڈز میں سے کنگ اٹھا کر اپنے چاروں پتے شو کروا دیئے۔ وہ چاروں کنگ تھے۔ مرتضیٰ نے پہلے چاروں پتوں کی جانب دیکھا پھر اس کی شکل کی جانب اور اس کے بعد دل میں امڈنے والی شرمندگی کو چہرے پہ ظاہر نہ ہونے دینے کے لیے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"تمہاری زبان بہت چلنے لگی ہے لیکن پھر بھی تمہیں موقع محل کے مطابق ری ایکٹ نہیں کرنا آیا۔ جس بات پر غصہ آرہا ہے، اسی بات پر غصہ نکالو۔ کسی چیز کا غصہ کسی دوسری چیز پر نکالو گے تو صرف خسارہ ہوگا۔"

اب کی بار سعدی بھی اونچی آواز میں بولا۔ مرتضیٰ نے گہری سانس بھری۔

"آئی ایم سوری...... تم ٹھیک کہہ رہے ہو......" وہ اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ سعدی نے اسے ٹوک دیا۔

"ہیملٹ کی بات کرتے ہیں۔" وہ اسے گھیر گھار کر اس موضوع پر لا رہا تھا۔

"دفع کرو یار......! مجھے اس ٹاپک پر کوئی بات نہیں کرنی۔" وہ افسردگی سے بولا۔

"ایسے کیسے دفع کر دیں یار...... ایک پتے کی بات بتاؤں تمہیں۔ جس چیز کو آپ خود ریجیکٹ کر دیتے ہیں، وہ اگلے دن آپ کو بھول جاتی ہے لیکن جو چیز آپ کو ریجیکٹ کر دیتی ہے، اسے آپ ساری زندگی نہیں بھلا پاتے۔ آڈیشن میں ناکام ہو جانا اتنی بڑی بات نہیں کہ اس کے لیے خود کو مینٹلی ٹارچر کیا جائے اور اگر تم اس ٹاپک پر بات نہیں کرو گے تو تمہیں کیسے پتا چلے گا کہ تم آڈیشن میں کیوں ناکام ہوئے۔"

سعدی نے کہتے ہوئے فلور کشنز پر بکھرے کارڈز سمیٹ کر پھینٹنے شروع کر دیئے تھے۔ مرتضیٰ نے شاکی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"تو تمہیں پتا چل گیا۔" اس نے سادہ سے انداز میں کہا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے منہ سے کچھ نہیں کہے گا تو شاید اردگرد والوں کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ کیا ہوا ہے حالانکہ آڈیشن سے پہلے وہ جتنا پُرجوش تھا، اب اس کے لٹکے چہرے نے ہر ایک کو اس کی ناکامی کا اشارہ دے دیا تھا۔

"ظاہر ہے مجھے بھی پتا ہی چلنا تھا۔ تم نے شکل ہی میرے جنازے والی بنا رکھی ہے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی ہے

کہ ایک آڈیشن میں فیل ہو جانا اتنا اہم ہوتا ہے کہ انسان ڈنر ہی نہ کرے، دوستوں سے منہ پھلا کر بیٹھ جائے اور پھر......"

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا، پھر شرارتی انداز میں بولا۔

"اور پھر دفع کرو یار......! تمہیں پتا ہے، وہ طلحہ اور زبیر وہاں کامن روم میں کیا کر رہے ہیں۔ زبیر واسع بنا ہوا ہے جب کہ طلحہ آڈیشن دینے والا۔ وہ مختلف لوگوں کی نقل کرنے کی کوشش کر رہا ہے، جب کہ زبیر بالکل اسی طرح ری ایکٹ کر رہا ہے جیسے واسع کر رہا تھا۔ تم جا کر دیکھو تو سہی، وہ اپنی ناکامی کو کس طرح سیلیبریٹ کر رہے ہیں جب کہ تم یہاں ماتم کر رہے ہو۔"

کارڈز کو سعدی نے سائیڈ میں رکھ دیا تھا۔ مرتضیٰ نے کوئی رسپانس نہیں دیا۔ وہ اسی انداز میں بیٹھا رہا۔

"اچھا چلو، میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس پلے میں ہوتا کیا ہے۔ ہیملٹ کا نام تم نے پہلی بار سنا ہے، اس لیے تم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ یہاں تک کہ تمہیں یہ بھی نہیں پتا کہ ہیملٹ بادشاہ نہیں بلکہ شہزادہ تھا۔ میں جو کچھ تمہیں بتاؤں گا، اس سے تم یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں جاہل یا دیہاتی کا طعنہ دے رہا ہوں۔ اب پلیز اس بات کی وضاحت مت دینا۔ میں جانتا ہوں کہ میں جب بھی تمہیں کوئی بات بتانے کی کوشش کرتا ہوں جس کے متعلق تم پہلے سے نہیں جانتے تو تم سمجھتے ہو، میں تمہیں پینڈو سمجھ رہا ہوں۔"

مرتضیٰ نے بہت مشکل سے خود کو چونکنے سے بچایا۔ وہ یہ بات محسوس ضرور کرتا تھا مگر اپنے منہ سے اس نے سعدی کو کبھی ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ سعدی اسے کچھ بتانے لگتا تو اسے برا محسوس ہوتا مگر جب سعدی کی بات مکمل ہوتی تو اسے احساس ہوتا کہ یہ اس کے فائدے کی بات تھی۔ سعدی کی وجہ سے ہی وہ دوسرے کالج میٹس اور ہاسٹل میٹس کے ساتھ زیادہ پُراعتماد طریقے سے بات کرنے کے قابل ہوا تھا۔

"شہزادہ ہیملٹ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا ہے کیونکہ اسے ابتدا میں شک اور پھر یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے باپ کو اس کی ماں نے اپنے عاشق کے ساتھ مل کر قتل کیا ہے۔ اوفیلیا اس کی منگیتر کم محبوبہ ہے۔ بہرحال کہانی کی تھیم "انتقام" ہی ہے۔ ہیملٹ اس میں ڈبل کیریکٹر ادا کرتا ہے۔ کچھ سین میں یہ ذہین و فطین جب کہ کچھ میں پاگل کا کردار نبھاتا ہے۔ سارے پلے میں یہی کچھ چلتا رہتا ہے۔ تم خود سوچ لو، ایک ایسا شخص جو اپنی ماں کو ہی اپنے باپ کے قتل کی وجہ گردانتا ہو کس قسم کا ری ایکشن شو کرے گا۔ زیادہ تر پلے ہیملٹ کے گرد ہی گھومتا ہے۔ اب ہیملٹ کے لیے واسع جس لڑکے کو چنے گا، اسے یقیناً ایکسٹرا آرڈنری ہونا چاہیے، ورنہ وہ سارے پلے کو تباہ کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔ واسع کو میں فرسٹ ایئر سے جانتا ہوں۔ اس کی ججمنٹ غلط نہیں ہو سکتی، اس نے بہتر......"

سعدی بہت نرم لہجے میں اسے بتا رہا تھا۔ آخری بات پر مرتضیٰ نے شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھا، پھر اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اس کی ججمنٹ غلط ہے۔ اس نے مجھے پورا ٹائم بھی نہیں دیا کہ میں ٹھیک طریقے سے اپنے ڈائیلاگز بول پاتا اور مجھے سامنے سے ہٹ جانے کے لیے کہہ دیا...... میں لیڈنگ رول نہ سہی، کوئی اور چھوٹا موٹا رول تو کر سکتا تھا نا......"

سعدی نے ہونٹ بھینچ کر اس کی جانب دیکھا۔

"تمہارے گھر میں ٹی وی ہے؟" سعدی نے پوچھا۔

"نہیں" اس نے کہا۔

''ریڈیو تھا لیکن وہ اماں جی کی ایک مرغی کی وجہ سے آج کل مرحومین کی فہرست میں شامل ہوتا ہے۔''

''تم نے کبھی کوئی انگلش مووی بھی نہیں دیکھی ہوگی۔'' مرتضیٰ کے جواب کا انتظار کیے بغیر سعدی نے فلور کشن سائیڈ میں کیا اور پھر اس پر بیٹھ کر مرتضیٰ کے لیے جگہ بناتے ہوئے بولا۔

''مجھے وہی ڈائیلاگ سناؤ جو تمہیں آڈیشن کے دوران بولنے کے لیے دیئے گئے تھے۔''

''تم میرے ساتھ کیا کر رہے ہو؟'' مرتضیٰ چڑ گیا۔

سعدی نے اس کے انکار کو اہمیت دیئے بغیر اس کی جانب بغور دیکھا۔ مرتضیٰ بھی کچھ لمحے ہونٹ بھینچ کر اس کی جانب دیکھتا رہا، پھر جیسے زچ ہو کر اٹھا۔

اس نے کمرے کے درمیان کھڑے ہو کر اسی انداز میں ڈائیلاگز ادا کرنے شروع کیے۔ جیسے صبح واسع کے سامنے کیے تھے۔ ڈائیلاگز تو اسے صبح ہی ازبر ہو گئے تھے، اس لیے وہ بھولے تو نہیں تھے مگر صبح کی نسبت انداز مزید برا ہو گیا تھا، کیونکہ وہ ذہنی طور پر بھی کچھ اب اَپ سیٹ تھا۔

''او کے......اب تم میری طرف دیکھو۔'' اس کے خاموش ہوتے ہی سعدی اٹھا اور بالکل اس مقام پر آ کھڑا ہوا، جہاں مرتضیٰ کھڑا اداکاری کر کے دکھا رہا تھا۔ اس نے وہی ڈائیلاگز بول کر دکھائے۔ اس کا لہجہ اور انداز واقعی مرتضیٰ کو کافی متاثر کن لگے۔

His eanon gainst self sluaghter کہتے ہوئے تمہیں ہاتھ نیچے رکھنے چاہیے تھے۔ جب کہ 'O God" کہتے ہوئے دوبارہ اوپر اٹھا کر اشارہ کرنا چاہیے تھا۔ ایکٹنگ صرف ڈائیلاگز بولنے کا نام نہیں ہے۔ آپ کو سر کے بالوں سے پاؤں کی چھوٹی انگلی ہر ہر عضو کو استعمال میں لا کر اپنا پوائنٹ آف ویو واضح کرنا پڑتا ہے۔ آپ اپنی باڈی لینگویج سے ہی ثابت کر دیتے ہیں کہ ڈائیلاگز کیا ہیں۔''

وہ پورے کمرے میں گھوم کر اپنی بات کی وضاحت کر رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ دو چارپائیاں بچھا کر کمرے میں گھومنے کی زیادہ گنجائش نہیں رہتی تھی۔

''تمہارا تلفظ بھی بہت پوور ہے۔ دیکھو مرتضیٰ! ہر زبان کی اپنی حاجات اور جذبات ہوتے ہیں۔ ایک بات جو اردو زبان میں ایک انداز سے کہی جاتی ہے اور جب انگلش میں وہ بات کرتے وقت وہی انداز اپنایا جاتا ہے تو اچھی بھلی بات اپنے معنی و مطالب کھو دیتی ہے۔ انگلش کے ایموشنز اردو میں اور اردو کے انگلش میں شو کرو تو مزہ نہیں آتا۔ انگریز ایموشنز کے معاملے میں ذرا ماٹھے ہوتے ہیں۔ وہ دھاڑیں مار کر رو سکتے ہیں، نہ قہقہے لگا کر ہنس سکتے ہیں۔ کسی بھی چھوٹی بات پر خوشی سے بھنگڑے ڈالنا ہم ایشینز کو ہی سوٹ کرتا ہے۔ وہ انتہائی دکھ اور انتہائی خوشی کے درمیان میں رہ کر زندگی گزارتے ہیں۔ اس لیے اگر تم ہیملٹ کے ڈائیلاگز کو ایسے ادا کرو گے جیسے تمہارے سلانوالی میں تمہارے بال کاٹنے والا نائی بولتا ہے تو پھر یہی ہوگا میرے دوست جو آج تمہارے ساتھ ہوا ہے۔''

وہ سانس لینے کو رکا پھر چارپائی پر بیٹھ کر باری باری دونوں شانے سہلانے کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''اس لیے میں تو یہی کہوں گا کہ تمہاری آج کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ تم نے آڈیشن دیا۔ وہ تو شیکسپیئر کا ہیملٹ تھا۔ اگر اردو کا کوئی ڈرامہ ہوتا تو میں تب بھی تمہیں کبھی سلیکٹ نہ کرتا۔ اگر میں واسع ہوتا تو......''

اتنا کہہ کر سعدی نے ایک بار پھر رک کر اس کی جانب دیکھا۔

''دراصل تمہارا لہجہ فی الحال ان دونوں زبانوں کے لیے ناموزوں ہے۔ پہلے اپنی زبان کو اردو لہجے کا بگھار لگاؤ پھر انگلش کا لگانا اور اس کے بعد جس مرضی پلے رائٹ کے پلے کے لیے آڈیشن دے دینا۔ کوئی تمہیں ریجیکٹ نہیں کرے گا، کیونکہ بہر حال اداکاری کے جراثیم تم میں ہیں۔ مایوسی ان جراثیم کے لیے مہلک ثابت ہوگی۔'' وہ اب چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔

''میں کیا کروں۔ آئی ایم سوری سعدی! مگر میں ایسا ہی ہوں۔ مجھ سے ناکامی برداشت نہیں ہوتی۔ گھر میں کبھی ابا جی کے ساتھ لڈو کھیلتے ہوئے میں ہار جاتا تھا تو سارا دن ابا جی سے بات نہیں کرتا تھا اور اس روز مجھ سے روٹی بھی نہیں کھائی جاتی تھی۔ اب بڑا ہو گیا ہوں تو اس قسم کی چھوٹی موٹی شکست تو برداشت کر لیتا ہوں، آڈیشن میں ریجیکٹ ہو جانا چھوٹی شکست نہیں ہے۔''

انگلیاں مسل کر بات کرتے ہوئے وہ پھر اسی مقام پر آ کھڑا ہوا تھا۔ سعدی نے زچ ہو کر اسے دیکھا۔

''اوئے چھوٹی ہی ہے خبیث انسان!'' وہ اُکتا کر بولا۔ مرتضیٰ بھی اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

''ایک بات کہوں مرتضیٰ!'' چند لمحوں بعد اس نے سعدی کی آواز سنی تھی۔

''تم اس بات کو بہت سیریس لے رہے ہو۔ یہ تمہارا کیریئر یا زندگی بھر کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ تمہارا مشغلہ ہے، اس کو مشغلہ ہی سمجھو۔ تم ایک اچھے نقال ہو۔ تم لوگوں کی بہت اچھی کاپی کرتے ہو۔ یار دوستوں میں بیٹھ کر جب تم ایسا کرتے ہو تو وہ خوش ہوتے ہیں، تمہیں سراہتے ہیں۔ یہ تمہاری ایک کوالٹی ہے جس کی وجہ سے تم کچھ دیر کے لیے خود انجوائے کر سکتے ہو اور دوسروں کو کروا سکتے ہو اور بس......اس سے زیادہ اہمیت مت دو اس چیز کو......اور مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔ مرتضیٰ......مجھے امید......ہے......تم......میری بات......گڈ......نائٹ......الارم لگا دینا......یاد......سے۔''

واقعی اس کی آواز پہ غنودگی چھانے لگی تھی اور پھر اس کی آواز معدوم ہو گئی تھی۔ مرتضیٰ چارپائی پر چت لیٹا چھت پر لگے پنکھے کو گھور رہا تھا۔



''اسیسی نیشن (Assassination) کے اسپیلنگ بتا دو۔'' بہت دھیمی آواز میں پوچھا گیا تھا۔ کلاس روم میں گہرا سکوت تھا، سب ہی اپنے اپنے فولڈرز پر جھکے قلم چلانے میں مصروف تھے۔ پلٹ کر دیکھے بنا بھی وہ سمجھ گیا تھا کہ پوچھنے والا طلحہ ہے۔ سر رضوی کی کلاس میں اور وہ بھی ٹیسٹ کے دوران اس طرح سے پوچھنے کی ہمت طلحہ ہی کر سکتا تھا۔ وہ سر رضوی کے چند لاڈلے شاگردوں میں سے ایک تھا۔ جب کہ مرتضیٰ سے دونوں ہی برداشت نہیں ہوتے تھے۔ وہ انگلش سے خائف اور سر رضوی سے خوفزدہ رہتا تھا، اس لیے اس میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ پلٹ کر طلحہ کو اشاروں میں ہی اسپیلنگ بتا پاتا۔

''مرتضیٰ کے بچے......بتا دے نا۔'' طلحہ نے پھر پکارا۔ مرتضیٰ جواب دینے کے بجائے سر جھکا کر تیز تیز قلم چلانے لگا۔

''دیکھ لے......پلیز بتا دے۔'' اب کی بار طلحہ کی آواز زیادہ اونچی تھی۔ شاید وہ اس کی پشت کے قریب ہو کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے کیا اسپیلنگ لکھے ہیں۔

مرتضیٰ کی جان ہی نکل گئی، اس نے سامنے کھڑے سر رضوی کی جانب دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ اس نے سٹپٹا کر نظریں چرائیں اور قلم کی رفتار تیز کر دی۔

''پرسوں میں نے تجھے پورا کوسچن بتایا تھا......بتا دے......بھائی نہیں ہے میرا۔'' وہ بچوں کی طرح جتا کر بولا۔

''نہیں۔'' وہ چڑ کر بولا۔ ابھی ایک سیکنڈ بھی نہیں گزرا تھا کہ عقب سے کوئی نوکدار چیز اس کے کندھے میں چبھوئی گئی۔

''اوئی......'' وہ تڑپ کر اٹھا۔ ٹیسٹ مشکل تھا اور سب بے حد انہماک سے لکھنے یا نقل کر کے لکھنے میں مگن تھے۔ اس زنانہ پکار پر سب نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر سب ہی ہنس دیئے۔ سب سے اونچا قہقہہ طلحہ کا تھا۔

''واٹ ربش!'' سر رضوی نے پلٹ کر گھر کا۔ مرتضٰی کندھے سہلاتا ہوا بیٹھ چکا تھا۔ سر رضوی اگرچہ کلاس سے بے حد بےتکلف تھے مگر جہاں ڈسپلن کا مظاہرہ کروانا ہوتا تھا، وہاں وہ کسی قسم کی لچک کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی گھرکی پر سب ہی دوبارہ سے فولڈر کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اگلے سات منٹوں میں ٹیسٹ مکمل ہوا اور جوابی کاپیاں سر رضوی کے لیدر بیگ میں منتقل ہو چکی تھیں۔

''اُلو کے پٹھے......تُو واقعی غدار ہے......انڈیا کا ایجنٹ......ایک اسپیلنگ نہیں بتا سکا، یہ ہے تیری دوستی۔...... میں تجھے طلاق دیتا ہوں......طلاق......طلاق......طلاق......اور ہاں......یاد رکھنا میں تجھ سے بدلہ لوں گا۔''

طلحہ اپنی کرسی اس کی کرسی کے ساتھ جوڑ کر دھمکا رہا تھا۔ مرتضٰی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یہ لڑکیوں کی طرح گیدڑ بھبکیاں بلکہ گیدڑنی بھبکیاں کسی اور کو دینا۔'' اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔

سر رضوی ہاتھ میں چاک لیے بورڈ پر کچھ بنانے لگے تھے۔ ساری کلاس ان کی جانب متوجہ ہو چکی تھی۔

''سر سے کہو سکلپچر ز ہی ٹھیک ہیں۔ تصویر کیوں بنا رہے ہیں اپنی؟'' پچھلی رو میں زبیر کی سرگوشی سنائی دی ''اور میرا پیغام ہے مسکراہٹ، جہاں تک پہنچے۔'' کے مصداق اس کی سرگوشی جس جس کو سنائی دی، اس کے چہرے پر واقعی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کیونکہ سر نے بورڈ پر ایک گدھے کی تصویر بنائی تھی۔ اس گدھے کے پیچھے انہوں نے ایک اور گدھا بنا دیا اور اسی لائن میں تیسرے پر Nation لکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ کلاس کی جانب متوجہ ہو کر پوچھ رہے تھے۔

''گدھا۔'' یک زبان ہو کر جواب دیا گیا۔

''غلط۔'' انہوں نے روزِ روشن کی طرح عیاں حقیقت کو رد کر دیا تھا۔

''گینڈا!'' سر کا مزاج کچھ زیادہ خوشگوار لگ رہا تھا، اسی لیے آخری نشستوں سے کسی چلبلے لڑکے نے کہا۔ سب ہنس دیئے، پھر جیسے یہ سلسلہ چل نکلا۔

''ہاتھی!'' ایک اور آواز آئی۔

''نو۔'' سر نے مسکرا کر نفی میں گردن ہلا کر کہا۔

''چیونٹی!'' طلحہ بولا۔

''گوبھی کا پھول۔'' عاطف کی آواز آئی۔

''ہنری کسنجر۔'' مرتضٰی نے بھی کھاتا کھولا اور سر رضوی کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔

''یہ گدھا نہیں، گدھی ہے۔'' زبیر نے آنکھیں گھما کر کہا جیسے بہت پتے کی اور دلچسپ بات بتا رہا ہو۔ بھانت بھانت کی آوازوں میں سر خوب ہنس رہے تھے پھر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش کروایا۔

''اوئے پاگلو...... یہ گدھے ہیں۔'' وہ بورڈ پر بنے دو گدھوں کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

''واقعی......؟ اولاد کو باپ ہی پہچان سکتا ہے۔'' مرتضٰی نے سر جھکا کر کہا تھا تا کہ آواز ساتھ بیٹھے طلحہ کو ہی سنائی دے۔

وہ خوب ہنسا۔ ویسے بھی طلحہ ہنسنے کے لیے موقع تلاش کرتا تھا۔

''اس کا مطلب کیا ہے؟'' انہوں نے یک دم ہی مرتضٰی کی جانب دیکھا۔ اس کا ٹیسٹ کافی اچھا ہوا تھا، اس لیے وہ خود کو کافی پُراعتماد سمجھ رہا تھا۔ سر کے اشارے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''اس کا مطلب یہ ہے سر! کہ آپ جیک آف آل ٹریڈز (ہرفن مولا) ہیں۔ آپ نا صرف انگلش بلکہ فائن آرٹس بھی پڑھا سکتے ہیں۔ آپ کی ڈرائنگ بہت اچھی ہے۔''

اس کے لہجے میں مخصوص شرارت تھی۔ سب ہنس دیئے۔

''برخوردار! میں انگلش اور فائن آرٹس ہی نہیں، نمازِ جنازہ بھی بہت اچھی طرح پڑھا سکتا ہوں۔ آزمائش شرط ہے۔''

سر رضوی کے جواب نے مرتضٰی کو مکمل طور سے ناک آؤٹ کر دیا۔ سب کو لگا تھا کہ مرتضٰی کو سر نے لاجواب کر دیا مگر وہ سابقہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''آزمانے کی کیا ضرورت ہے سر جی...... مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے۔ ویسے اگر آپ کبھی نکاح پڑھانے میں انٹرسٹڈ ہوئے تو میں بخوشی قربانی کا بکرا بن جاؤں گا۔''

اس نے ثابت کیا کہ وہ چوکنے والوں میں سے نہیں ہے۔ سب تو ہنسے ہی تھے، سر کا قہقہہ کافی بلند تھا۔

''ویل سیڈ...... سلانوالی والوں کو بڑی لمبی زبان لگ گئی ہے۔'' وہ ستائشی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ سب ہوسٹلائٹ لڑکوں سے واقف تھے۔

''یہ چھپا رستم ہے سر! آپ اس کو معصوم نہ سمجھیں۔ یہ آپ کی بہت اچھی نقل کرتا ہے...... اس نے ہمیں ہاسٹل میں آپ کی نقل کر کے دکھائی تھی۔ ہو بہو آپ کی کاپی لگ رہا تھا۔''

طلحہ کھڑا ہو کر آنکھیں گھماتے ہوئے بتا رہا تھا۔

''بیڑا غرق...... یہ واقعی کمینہ ہے۔'' مرتضٰی نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ سراسر مبالغہ آرائی تھی۔ اس نے کبھی سر رضوی کی کاپی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''اچھا......؟ واقعی......؟ آجاؤ یار...... سامنے آجاؤ...... آج تمہاری کارکردگی بھی دیکھ لیں۔''

وہ اسے باقاعدہ دعوت دیتے ہوئے بولے۔ ساری کلاس کے مزے ہو گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا۔ انگلش کا نہیں ڈرامیٹکس کا پیریڈ چل رہا ہے۔

''یہ مذاق کر رہا ہے سر! جھوٹا ہے ایک نمبر کا۔'' وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلا تھا جب کہ طلحہ نے واقعی بدلہ لیا تھا۔ اب وہ مرتضٰی کو آنکھیں گھما گھما کر دیکھ رہا تھا۔

''ارے آجاؤ بھئی...... میں واقعی دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم یہ کیسے کرو گے؟'' ان کے انداز میں دلچسپی تھی۔

''سر جی! اس گدھے سے پہلے ہمیں بورڈ پر بنے گدھوں کے متعلق تو بتا دیں۔'' رضوان جو واقعی پڑھائی کے لیے سنجیدہ رہتا تھا، نے سر کو یاد دلایا۔

''ارے ہاں۔'' سر کو یاد آیا، وہ بورڈ کی طرف متوجہ ہوئے۔ مرتضٰی دل ہی دل میں شکر ادا کرتا اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ سر رضوی اب گدھوں کی تصویروں کے نیچے کیپشن دے رہے تھے۔ انہوں نے پہلے گدھے کی تصویر کے نیچے Ass لکھا، پھر دوسری تصویر کے نیچے بھی Ass لکھ دیا اور دونوں الفاظ کے درمیان (+) جمع کا نشان ڈال دیا۔

''Ass کا مطلب ہوتا ہے گدھا اب ایک لطیفہ سن لو۔ ایک سردار جی اپنے بچوں کو Assassination کے اسپیلنگز ایسے یاد کروا رہے تھے۔ پہلے ایک گدھا پھر دوسرا گدھا اور اس کے پیچھے ساری قوم۔ یعنی پہلے Ass پھر Ass اور پھر پوری Nation یعنی assassination طلحہ! کچھ آیا عقل شریف میں۔'' انہوں نے طلحہ کو بطور خاص دیکھ کر استفسار کیا۔ وہ جھینپا ضرور کہ سر کو اس کی بے ایمانی کی سمجھ پہلے ہی آ گئی تھی مگر کھڑے ہو کر ڈھٹائی سے بولا۔

''جی سردار جی! میرا مطلب سر جی!''

ایک بار پھر سب ہنس دیئے۔ سر نے ہاتھ میں پکڑا چاک اسے دے مارا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے مرتضیٰ کو کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔

''آ جاؤ میدان میں۔''

وہ پہلے تو انکار میں گردن ہلاتا رہا پھر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اٹھا اور روسٹرم کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ سر رضوی نے پہلی رو میں بیٹھے اصغر کو اٹھ کر پیچھے جانے کا اشارہ کیا اور خود اس کی جگہ پر بیٹھ گئے۔

اب چونکہ شامت آ ہی چکی تھی، سو مرتضیٰ نے ذہن میں جلدی جلدی سوچنا شروع کیا کہ سر کن مخصوص اشاروں کا بار بار استعمال کرتے ہیں یا بار بار کون سے الفاظ بولتے ہیں۔ وہ بائیں ہاتھ سے اپنی بائیں آنکھ کھجا کر کوئی بھی نکتہ سمجھاتے تھے اور ''اوئے پاگلو'' ان کا اپنے شاگردوں کے لیے مخصوص پیار بھرا اندازِ تخاطب تھا۔ اس نے سر کے ساتھ بیٹھے راشد سے اس کی عینک لی، پھر سر کا چرمی بیگ اٹھا کر کلاس روم کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''وری گڈ مارننگ اسٹوڈنٹس۔''

سر رضوی کلاس میں آتے ہوئے یہی کہتے تھے۔ اس نے اپنی طرف سے انہی کے انداز کو کاپی کرنے کی کوشش کی تھی۔ چرمی بیگ کو روسٹرم کے اندر بنے خانے میں رکھ کر وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر سب لڑکوں کو گھورنے لگا کیونکہ سر رضوی ایسے ہی کرتے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ساری کلاس ان کی نظروں سے خائف ہو کر اپنی اپنی جگہ سنبھال لیتی تھی اور خاموشی چھا جاتی تھی۔ مرتضیٰ نے یہی حرکت کی تو جیسے کلاس میں بھونچال آ گیا۔ اس کا انداز اتنا فطری تھا کہ سب نے تالیاں بجانا شروع کر دی تھیں۔ طلحہ کا منہ تو حیرت سے کھل گیا تھا۔ وہ جانتا تھا، مرتضیٰ اچھا نقال ہے مگر اسے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی اچھی نقالی بھی کر سکتا ہے۔ مرتضیٰ سر کے انداز میں کلاس روم میں راؤنڈ لے کر لیکچر دینے لگا۔ دس منٹ تک اس نے خود کو واقعی سر رضوی ثابت کر کے دکھا دیا تھا۔ ساری کلاس نے تالیاں بجا بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

دس منٹ بعد جب وہ اپنی جگہ پر بیٹھا تو سر رضوی تالیاں بجاتے اور ہنستے ہوئے روسٹرم کے پیچھے جا کر کھڑے ہوئے۔ انہوں نے روسٹرم کے اندر پڑے چرمی بیگ کو کھولا، پھر اس میں سے پچاس کا نوٹ نکالا اور پوائنٹر سے اس پر کچھ لکھنے لگے۔ اس کے بعد انہوں نے وہ نوٹ دست بستہ مرتضیٰ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

''یہ تمہارا انعام ہے۔'' اس کی ٹال مٹول کو نظر انداز کر کے انہوں نے نوٹ اس کی بوشرٹ کی جیب میں رکھ دیا جس پر انہوں نے دعائیہ ریمارکس دیئے تھے۔

''یار! ایک بات بتاؤ، کیا میں لیکچر کے دوران واقعی اتنی بار آنکھ کھجاتا ہوں، جتنی بار یہ مرتضیٰ کھجا رہا تھا۔''

کلاس روم سے جانے سے پہلے یہ ان کی آخری پھلجھڑی تھی۔ سب لڑکے ہنس دیئے اور اس روز مرتضیٰ نے دونوں ہاتھوں سے دادوتحسین کے ٹوکرے بھرے تھے۔

O......❖......O

''یارو! ایک خوشخبری ہے۔'' خاور نے قریب آتے ہوئے پُرجوش انداز میں کہا تھا۔ آف پیریڈ کی وجہ سے وہ سب دوست گراؤنڈ میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

''تم پاپا بننے والے ہو...... مبارک ہو......'' ارباب نے کھلے دل سے مبارک دی۔ سب کے لبوں سے بے ساختہ قہقہہ ابلا تھا۔ سب ہی نوجوان تھے۔ بے فکری کا زمانہ تھا، سو بات بے بات قہقہے گونجتے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ واقعی کوئی خوشخبری سناتا، ایک لڑکا مرتضیٰ کو ڈھونڈتا ان تک آ گیا۔

''سر رضوی، مرتضیٰ بھٹی کو اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔'' وہ پیغام دے کر چلتا بنا مگر مرتضیٰ کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ وہ خود کو سنبھالتا ان کے آفس کی جانب چل دیا۔ انہوں نے ایک اسائنمنٹ دے رکھا تھا مگر اس کی پریزنٹیشن اور سمٹ کروانے کی تاریخ ابھی دور تھی۔ وہ قیاس کے گھوڑے دوڑاتا ان کے کیبن میں آ گیا تھا۔

''آؤ ینگ مین...... کلاس چھوڑ کر آئے ہو یا فری تھے۔'' ان کا مزاج آج بھی خوشگوار لگ رہا تھا۔ فری کلاس کے متعلق بتا کر وہ ان کے اشارے پر سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کبھی ایکٹنگ کے متعلق سوچا ہے؟'' وہ چند ایک غیر ضروری باتوں کے بعد وہ اصل موضوع پر آ گئے۔ مرتضیٰ کو واسع اور اس کا مغرورانہ انداز یاد آ گیا۔ اس کے لیے ایک آڈیشن ہی کافی تھا، سو اس نے سر رضوی کو نفی میں جواب دیا۔

''کیوں...... گھر سے اجازت نہیں ہے؟'' انہوں نے میز پر جھک کر اپنائیت سے پوچھا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں سر......! میں نے کبھی سوچا نہیں اس کے متعلق۔'' اس کے لہجے میں عدم دلچسپی نہیں تھی مگر وہ اپنے الفاظ سے یہی ثابت کرنا چاہتا تھا لیکن رضوی صاحب کوئی ٹین ایجر نہیں تھے کہ یہ سب محسوس نہ کر پاتے۔

''جھجکنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں تم کر سکتے ہو۔ تم میں انرجی ہے، پوٹینشل ہے اور سب سے بڑھ کر میں چاہتا ہوں کہ تم اداکاری کرو۔ کسی کا ٹیلنٹ ضائع ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ایک آدھ پلے کرنے سے فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری پڑھائی ڈسٹرب نہیں ہو گی بلکہ مجھے یقین ہے تمہاری صلاحیتیں مزید پالشڈ ہوں گی۔ ایک چانس مل رہا ہے تو اس کو Avail کر و یار!''

وہ بے تکلفی سے اس کے کندھے کو تھپتھپا کر بولے۔ مرتضیٰ کو دل ہی دل میں بہت خوشی ہوئی۔ انکار کون کم بخت کرنا چاہتا تھا۔ مسئلہ صرف پہلے آڈیشن کی ناکامی کا تھا، جو اس کے سارے شوق پر جھاڑو پھیرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سر رضوی کی باتوں نے واقعی اسے پمپ کر دیا تھا۔

''ہاشمی صاحب ڈرامیٹکس کے انچارج ہیں، تم ان سے جا کر مل لو۔ میرا ریفرنس دے دینا۔ وش یو بیسٹ آف لک۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔ مرتضیٰ اٹھا اور دروازے کی سمت چل دیا۔

''اور ہاں سنو۔'' دروازے تک پہنچا تھا کہ عقب سے ان کی آواز سنائی دی۔ وہ مڑا اور ان کی جانب دیکھنے لگا۔

''ایک آڈیشن میں فیل ہو جانے سے ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ تم کبھی فراغت میں میرے پاس بیٹھنا، میں تمہیں بہت سے ایسے کامیاب لوگوں کے متعلق بتاؤں گا جنہوں نے کامیابی کا سفر ناکامی کے جوتے پہن کر کیا تھا۔''

اپنی بات مکمل کر کے وہ دوبارہ میز پر پڑے کاغذات کو دیکھنے لگے۔ مرتضیٰ سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔

ڈرامیٹکس کے ہاشمی صاحب اپنی لمبی مونچھوں اور آدھے گنجے سر کے ساتھ واسع سے باتوں میں مصروف تھے۔ مرتضیٰ کا

حلق تک کڑوا ہو گیا۔ اس کی واسع سے کوئی دشمنی نہیں تھی مگر نہ جانے کیوں اسے وہ بے حد برا لگنے لگا تھا۔ سعدی کی باتیں اس کی سمجھ میں آ گئی تھیں مگر پھر بھی وہ اپنی ناکامی کی وجہ واسع کو ہی سمجھتا تھا۔

"پہلے کبھی ایکٹنگ کی ہے؟" ہاشمی صاحب اپنے مخصوص انداز میں پوچھ رہے تھے۔

"سکول میں یا کالج میں۔ کوئی چھوٹا موٹا رول؟" ان کے استفہامیہ انداز میں ناگواری کی جھلک تھی۔

"اگر پہلے کبھی ایکٹنگ نہیں کی تو اب کیسے کرو گے؟" اسے دونوں مرتبہ نفی میں گردن ہلاتا دیکھ کر وہ لہجے میں مزید ناگواری سمو کر بولے۔ مرتضٰی کے چہرے پر بھی اسی قسم کے تاثرات چمکنے لگے۔ وہ کچھ سوچ کر خاموش رہا۔ یہ جتانے کی ضرورت بھی کیا تھی کہ سر رضوی نے اس پلے کو کرنے کے لیے بصد اصرار سے یہاں بھیجا تھا۔

"آزمانے میں کیا حرج ہے سر!" واسع نے انہیں کول کرنے کی کوشش کی۔

"رضوی اس کو Recommend کر رہا ہے تو آزمانا تو پڑے گا۔ بہر حال وہ بندہ بھی ٹیلنٹ کی ٹھیک ٹھاک پرکھ رکھتا ہے۔ ایسا ہے بچے ہم Samvel beckett کا پلے waiting for Godot اسٹیج کر رہے ہیں۔"

وہ اس کو پُرسوچ انداز میں گھورتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ مرتضٰی کے فرشتوں نے بھی اس سے پہلے کبھی یہ نام نہیں سنے تھے۔ انگلش پلے کا نام سنتے ہی اس کا منہ تو منہ دل بھی لٹک گیا۔ اس کا جی چاہا فی الفور انکار کر کے وہاں سے اٹھ جائے۔ جس چیز نے بے عزتی ہی کرنا تھا، اسے کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا جب کہ ہاشمی صاحب مسلسل اسے گھورتے ہوئے مزید کہہ رہے تھے۔

"یہ ایک Absurd play ہے۔ مجھے یقین ہے تم نے اس قسم کا پلے پہلے کبھی دیکھا یا پڑھا نہیں ہو گا۔ خیر! یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں۔ یہاں بہت سے لوگوں کے لیے یہ چیز نئی ہو گی۔ اس میں تم جتنا Clumpsy نظر آؤ گے، اتنا ہی کامیاب ہو گے۔ تمہیں لکی کا کردار ان ایکٹ کرنا ہے جو بلا کا حاضر جواب اور مزاحیہ شخصیت کا مالک ہے۔ دوسرے ایکٹ میں Dump ہو جاؤ گے۔ اصل اداکاری وہی ہے کیونکہ تب تمہیں ثابت کرنا ہو گا کہ خاموش رہ کر کیسے اداکاری کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر تم ایک ظالم قسم کے لینڈ لارڈ کے غلام ہو۔ یہ سب باتیں میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ یہ پلے صرف چار کریکٹرز پر بیسڈ ہے۔ ہر کریکٹر بے حد اہم ہے اور مشکل بھی ہے۔ میں تمہیں اسکرپٹ دے رہا ہوں، اسے لے جاؤ۔" انہوں نے ایک فائل اس کے سامنے میز پر رکھی۔ واسع لاتعلق بیٹھا تھا۔ اس نے دوبارہ ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

"میں تمہیں دو دن دے رہا ہوں، دو دن کے بعد یہ سارا اسکرپٹ یاد کر کے تم نے مجھے پرفارم کر کے دکھانا ہے۔ اس کے بعد میں فیصلہ کروں گا کہ تم یہ کر سکتے ہو یا نہیں۔ میرے پاس اس کریکٹر کو کرنے کے لیے بہت سے لڑکے ہیں۔ وہ تو رضوی نے تمہارے لیے کہہ دیا...... چلو خیر۔"

انہیں احسان جتانے کا زیادہ ہی شوق لگ رہا تھا۔ مرتضٰی کو بہت برا لگا۔ دل چاہا اسکرپٹ والی فائل ان کے سامنے پھینک کر کہے۔

"مٹی ڈالیں مجھ پر اور کسی اور لڑکے سے ہی کروا لیں یہ رول۔"

استاد کا احترام مانع تھا، سو وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔

"یہ قادر تو نہیں کر پائے گا...... دو دن میں اسے اپنے ڈائیلاگز ہی یاد نہیں ہوں گے۔" واسع کی آواز نے دروازے کے باہر تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

"اس کا نام قادر ہے؟" ہاشمی صاحب نے پوچھا۔

"ایسی کی تیسی۔" مرتضٰی ناک چڑھا کر بولا۔ اب یہ اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ کالج ٹائم ختم ہونے کے بعد وہ ہاسٹل واپس آنے کی بجائے لائبریری چلا گیا۔ Absurd plays کے متعلق بہت مشکل سے دو ایک کتابیں مل سکی تھیں۔ انہیں ایشو کروا کر وہ واپس ہاسٹل آ گیا۔ اس میں سے ایک کتاب اس ڈرامے کی مکمل کہانی کا احاطہ کر رہی تھی۔ اس نے ڈکشنری کی مدد سے اسے پڑھنا شروع کیا۔ صد شکر کہ یہ ڈرامہ شیکسپیئر کے ڈرامے کی طرح بہت زیادہ لمبا نہیں تھا مگر بہر حال کسی بھی انگلش ڈرامہ کو اس طرح سے پڑھنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ سو اسے دقت ہو رہی تھی۔ جیسے تیسے کر کے اس نے شام تک وہ سارا پلے ایک مرتبہ پڑھ لیا تھا لیکن تب تک اس کے سر میں انتہائی درد ہونے لگا تھا اور اس نے کھانا کھانے کا تردد بھی نہیں کیا اور افسوس ناک بات یہ تھی کہ ڈرامہ اس کی سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا۔

ہر چیز پر فاتحہ پڑھ کر وہ اٹھا۔ پہلے اپنے لیے چائے بنائی پھر آدھے درجن کیک رس کے ساتھ نوش فرما کر معدے کو آسرا پہنچایا۔ اس سارے عمل کے دوران واسع کی باتیں اس کے خون کو جلانے کا کام کرتی رہیں۔ سعدی آج کل کسی دوست کے گھر جا کر کمبائن اسٹڈی کرتا رہتا تھا، سو اس کی واپسی رات کو ہوتی تھی۔ وہ واپس آیا تو مرتضٰی نے اپنا دکھڑا رونا شروع کر دیا تھا۔

"Waiting for Godot by Samuel Backett" اس نے نام سن کر چند لمحے سر کھجانے میں صرف کیے۔

"ہاں میں نے پڑھا ہے یہ پلے۔ پر یار! مجھے یاد نہیں آ رہا۔" وہ بے چارگی سے بولا۔

مرتضٰی نے اس کو اسکرپٹ والی فائل اور وہ دونوں کتابیں دکھائی تھیں۔

"ڈنر کر لیں پھر اس کے بعد دیکھتے ہیں۔" وہ ساری چیزیں چارپائی پر پھینک کر ڈائننگ ہال میں آ گئے۔ کھانا کھانے سے واقعی اسے اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس ہوئی تھی۔

کمرے میں واپس آ کر وہ دونوں واقعی پلے کی تیاریوں میں جت گئے تھے۔ پہلے دو ایک صفحات پڑھ کر ہی سعدی کو یاد آ گیا کہ یہ کون سا پلے ہے۔

"یار! یہ چار بونگوں کا ڈرامہ ہے جس میں سے ایک بونگا تجھے بنانا چاہ رہے ہیں ہاشمی صاحب، اس قسم کے ڈرامز میں مزاح حرکتوں سے پیدا کیا جاتا ہے۔ تم نے کبھی چارلی چیپلن کا نام سنا ہے۔ بس سمجھو چھوٹا موٹا چارلی چیپلن بننا ہے۔"

وہ مفصل انداز میں اسے سمجھا رہا تھا مگر اس کے چہرے کی جانب دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔

"چارلی چیپلن کا نہیں پتا تمہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا مرتضٰی نے نفی میں سر ہلایا۔

"اوہ بھلا ہو جائے تیرا...... یار! تجھے کچھ پتا بھی ہوتا ہے۔" وہ ناگواری کا کوئی تاثر چہرے پر لائے بغیر بولا۔ اس کے بعد اس نے اپنی قمیص اتار کر دوسری چارپائی پر پھینکی اور چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"مجھے سردی لگتی ہے تو میرا دماغ زیادہ تیزی سے چلتا ہے۔" مرتضٰی کو جواز پیش کر کے وہ اسے دوبارہ سے سمجھانے لگا۔

اس نے لکی کے سارے ڈائیلاگز ایک دفعہ سادہ انداز میں اسے ادا کر کے دکھائے تا کہ وہ تلفظ اور ادائیگی کے طریقے کو دیکھ لے۔ کافی دیر تک وہ اسے اس کھیل کے اسرار و رموز سمجھاتا رہا اور پھر تھک ہار کر وہ سو گیا مگر مرتضٰی کافی دیر تک جاگ کر ڈائیلاگز یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کافی دیر تک جاگنے کے بعد بھی وہ لکی کے ڈائیلاگز کا چوتھا حصہ یاد کر پایا تھا۔ سونے سے

پہلے اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس کام کے لیے قطعاً ناموزوں ہے۔

○......❖......○

اگلی صبح اس نے بہت دن کے بعد نماز فجر ادا کی اور اسکرپٹ لے کر سر کانوں کو مفلر سے ڈھک کر وہ گراؤنڈ میں آ گیا۔ اس نے پاؤں میں جرابیں جان بوجھ کر نہیں پہنی تھیں۔ وہ تجربہ کرنا چاہتا تھا کہ کیا واقعی سردی لگنے سے دماغ کی چستی پر فرق پڑتا ہے یا نہیں۔ ماربل کے بینچ پر بیٹھ کر اس نے ڈائیلاگز یاد کرنے شروع کیے تھے اور صرف بیس منٹ بعد ہی اسے احساس ہوا تھا کہ وہ ڈائیلاگز بالکل بھی مشکل نہیں ہیں۔ وہ کل بھی اپنے ڈائیلاگز کو اسی ہمت و حوصلے کے ساتھ یاد کر رہا تھا مگر کل وہ اسے یاد ہو کے نہیں دے رہے تھے اور اب وہ آنکھیں بند کر کے انہیں فر فر دُہرا سکتا تھا۔

اسے دل ہی دل میں کافی خوشی ہوئی۔ آدھا مرحلہ تو سر ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اس کام سے فراغت کے بعد وہ دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ پہلے اس کا ارادہ تھا کہ کالج سے چھٹی کرے گا مگر پھر اس کا دھیان رضوی صاحب کی طرف چلا گیا۔

''انہوں نے میری صلاحیت پر بھروسا کیا ہے تو یقیناً میری مدد بھی انہیں ہی کرنی چاہیے۔''

یونیفارم پریس کرتے ہوئے وہ سوچ کر خود کو تسلیاں دیتا رہا تھا۔ کالج پہنچ کر پہلی کلاس لینے کے بعد وہ رضوی صاحب کے آفس پہنچ گیا۔

''اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں، تمہیں ہاشمی صاحب نے پریشرائز کرنے کی کوشش کی ہے۔ تم ان کے خلوص پر شک مت کرو، وہ اپنے کام سے بے حد مخلص ہیں۔ دراصل خود بھی بہت اچھے اداکار ہیں۔ ٹی وی پر کافی عرصے اداکاری کرتے رہے ہیں۔ ابھی بھی کبھی کبھار نظر آ جاتے ہیں۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ پرفیکشنسٹ ہیں۔ شکر کرو، انہوں نے تم سے اتنی بات کر لی ہے، ورنہ تو وہ ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جن کی بیویاں خاموش رہ کر یہ دعائیں کرتی ہیں کہ وہ بولیں۔''

وہ اسے تسلی دیتے رہے تھے مگر وہ ان کے پاس صرف تسلی کی طلب میں نہیں آیا تھا۔

''مجھے ڈائیلاگز یاد ہیں۔ میں نے اپنے لہجے کو بھی امپروو کیا ہے مگر مجھے کس قسم کے جیسچرز شو کرنے ہیں، مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

اس نے روہانسے لہجے میں انہیں اپنا مسئلہ بتایا۔

''آدھے سے زیادہ کام تو کر چکے ہو، اب یہ تو اتنا بڑا مسئلہ ہے نہیں۔ اچھا ٹھہرو، مجھے چیک کرنے دو۔ میرے پاس اس ڈرامے کا پورا ٹیکسٹ ہے۔ میں تمہیں وہ دکھاتا ہوں۔''

وہ کرسی سے اٹھ کر پیچھے بنی الماریوں میں الٹے سیدھے ہاتھ مارنے لگے تھے۔ مرتضٰی نے دوبارہ سے فائل کھول لی۔ اسکرپٹ میں واضح طور پر ان موومنٹس کے بارے میں لکھا تھا جو اسے اسٹیج پر کرنا تھیں مگر اس عقل کے اندھے کو یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''یہ مل گئی کتاب......'' سر رضوی کی چہکار سنائی دی۔ وہ ایک کتاب لے کر اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کتاب کھلتی، انہیں یک دم ایک اور بات یاد آ گئی۔

''مرتضٰی! میرے پاس اس پلے کی ویڈیو ہے۔ میرا بھائی ہے نا وہاں یو کے میں۔ پی ایچ ڈی کر رہا ہے...... اس نے

مجھے بھجوائی تھی...... تیرا کام بن گیا بیٹا!''

وہ مرتضٰی سے بھی زیادہ پُر جوش ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے کیبنٹ میں دوبارہ ایک دو ہاتھ مار کر ایک ویڈیو کیسٹ نکال لی تھی۔

''یہ میں ہر کسی کو نہیں دیتا مگر تمہیں دے رہا ہوں۔ آج شام کو مجھے واپس کر دینا۔'' انہوں نے ویڈیو کیسٹ اسے تھماتے ہوئے کہا۔ وہ بے چارا کیسٹ ہاتھ میں لیے ان کے کیبن سے نکل آیا۔ ابھی دس قدم ہی چلا ہو گا کہ دوبارہ سر رضوی نے بلوا لیا۔

''گھامڑ! تمہارے پاس وی سی آر ہے؟'' انہوں نے اس کی شکل دیکھتے ہی پوچھا اور پھر نفی میں جواب پا کر انہوں نے اسے ڈرامیٹک آرٹ کا آفس کھلوا کر وہ مووی دکھانے کا بندوبست کیا تھا۔ لکی نامی اس نیم پاگل ملازم کو ایک بار ہی اسکرین پر دیکھ کر اسے تسلی ہوئی تھی کہ وہ خوامخواہ گھبرا رہا تھا۔

''مرتضٰی! ایکٹنگ کوئی دو کا پہاڑہ نہیں ہے کہ جو بزرگ ہمیں تیار کر کے دے گئے تھے، بس اسی کو ساری زندگی رٹنا ہے۔ یہ بہتا پانی ہے، اسے ہر لحہ جدت کی ضرورت ہے۔ تم ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والے اس لکی کو ذہن میں مت بٹھاؤ، بلکہ خود سوچو کہ تمہیں خود کو اس کردار میں کیسے ڈھالنا ہے۔ یہ سوچو کہ اگر تمہارا جابر لینڈ لارڈ تمہارے گلے میں رسی ڈال کر اس طرح سے لیے پھرے جیسے نامی لینڈ لارڈ لکی کو لیے پھرتا ہے تو تم کس طرح پرفارم کرو گے۔ بے شک تمہیں ایک نیم پاگل کی طرح پرفارم کرنا ہے مگر تم اپنے ڈائیلاگز تو دیکھو، کس قدر سنجیدگی لیے ہوئے ہیں۔ اس پلے کو اگرچہ سب Absurd play کہیں گے مگر تم اس کے ٹائٹل پر غور کرو ویٹنگ فار گوڈو...... غور کرو تو کتنی اہم تھیم ہے یہ...... ہم سب کسی نہ کسی مسیحا کے انتظار میں ہی تو ہیں...... لکی کے انتظار کو کس طرح پیش کرو گے تم...... جب یہ سب سوچ کر پرفارم کرو گے تو مجھے یقین ہے بہت اچھا پرفارم کرو گے۔''

سر رضوی نے اسے سمجھایا تھا۔ اتنا تو وہ لیکچر دیتے وقت نہیں بولتے تھے، جتنا انہیں اب اس کے ساتھ بولنا پڑ رہا تھا۔

سعدی اور سر رضوی کی مہربانی سے وہ اس اسائنمنٹ کو مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مقررہ مدت پر اس نے ہاشمی صاحب کو ان کی منشاء کے مطابق کارکردگی رپورٹ پیش کر دی تھی۔ وہ متاثر ہوئے تھے یا نہیں مگر انہوں نے اسے سلیکٹ کر لیا تھا یہ پلے دراصل گورنمنٹ کالج کے طلباء نے برٹش کونسل میں ماڈرن ڈرامہ کی ترقی و ترویج کے ایک سیمینار میں پیش کرنا تھا۔ پندرہ دن کے بعد یہ ڈرامہ اسٹیج پر پیش کیا جانا تھا اور ان پندرہ دنوں میں مرتضٰی نے ہر چیز پس پشت ڈال کر اس ڈرامہ کی تیاری کی تھی۔

سیمینار والے روز ٹیچرز کے ساتھ منتخب طلباء ہی برٹش کونسل گئے تھے۔

''مجھے سب پر بھروسا ہے۔ تم سارا کھیل نہ خراب کر دینا۔''

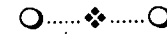
ہاشمی صاحب اسے بار بار سمجھاتے رہے تھے۔ کاسٹیوم پہننے اور میک اَپ کروانے تک وہ اس جملے کو سن سن کر تنگ آ گیا تھا۔ جب ڈرامہ پرفارم کرنے کی باری آئی تو وہ ہو گیا جو مرتضٰی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اسے پہلی انٹری پر اتنی تالیاں سننے کو ملیں کہ وہ حیران رہ گیا۔ تالیوں کی یہ آوازیں اس میں جوش بھر رہی تھیں۔ "Waiting for God" نامی اس ڈرامہ میں بنیادی کردار چار تھے جس میں سے سب سے کم اہم کردار اس کے حصے میں آیا تھا مگر اس نے اپنی اداکاری سے اس کردار میں واقعی جان ڈال دی تھی۔

سر رضوی تو خوش ہوئے ہی تھے۔ ہاشمی صاحب نے بھی دل کھول کر داد دی۔ سیمینار کے بعد ڈنر تھا جس میں GC کے طلبہ کو فرداً فرداً بہت سے قابل لوگوں سے ملنے اور داد سمیٹنے کا موقع ملا۔

''ہیلو...... مائی نیم از ملیحہ!'' کسی نے بہت گرم جوش لہجے اور سراہتی آنکھوں سے اسے مخاطب کیا تھا۔ گریس فل سی وہ لڑکی اسے بہت اچھی لگی کیونکہ اس نے نا صرف اس کی اداکاری کی تعریف کی، بلکہ اسے اس کی ایک دو خامیوں کے متعلق بتا کر بہت اچھی طرح سے گائیڈ کیا۔

''یہ GC کی اولڈ اسٹوڈنٹ ہیں۔ تھیٹر ڈائریکشن میں لندن سے ماسٹرز کر کے لوٹی ہیں۔ یہ اور ان کے شوہر دونوں ہی بہت ٹیلنٹڈ ہیں۔ GC کی پکچر گیلری میں ان کی بہت تصویریں ملیں گی تمہیں...... بہت اچھی اداکارہ ہیں۔ تھیٹر اور ٹی وی دونوں میں کامیابی سے کام کر رہی ہیں۔''

ہاشمی صاحب نے واپسی پر اسے بتایا۔



''ہر جگہ سے وِکس کے جیسی سمیل آ رہی ہے۔'' انکل صدیق کے سامنے سے ہٹتے ہی اس نے ناک پر ہاتھ رکھ کر گویا خود کلامی کی تھی۔ اس کے ساتھ ربیط کھڑا تھا، وہ کچھ دیر اسے حیرانی سے دیکھتا رہا، پھر شاید اس کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے بولا۔

''یہ کافور کی خوشبو ہے۔'' یہ سن کر وہ اسی پوزیشن میں کھڑا رہا۔ وہ جانتا تھا یہ کافور کی خوشبو ہے۔ وہ اسی خوشبو کے تاثر کو زائل کرنے کے لیے ہی تو اِدھر اُدھر کی ہانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر لان میں آ گیا۔ شامیانہ ٹھونکا جا چکا تھا۔ اکبر نے گھر میں موجود تینوں پیڈسٹل فین مختلف جگہوں پر رکھ کر چلا دیئے تھے مگر گرمی زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ پنکھے کام نہیں کر رہے تھے۔ ہمسایوں کا ملازم بھی دو پیڈسٹل فین دے گیا تھا جو اس سمت میں لگائے گئے تھے، جہاں خواتین میت کو گھیرے بیٹھی تھیں۔

اس نے وہیں کھڑے ہو کر اپنی ماں کو تلاش کرنے کی کوشش کی، وہ انہیں بمشکل ڈھونڈ پایا تھا۔ ملگجی سی سفید چادر اور سفید ہی چہرہ لیے الجھے بالوں کے ساتھ وہ اب خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھیں اتنی سوجی ہوئی تھیں کہ ان کی لالی اسے دور سے ہی نظر آ رہی تھی۔ اس نے ماں کے چہرے سے نظر ہٹالی اور پھر خود بھی پیچھے ہٹ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ماں اس کی جانب دیکھے۔ اسے ڈر تھا کہ وہ اپنی ماں کی نظروں کا سامنا نہیں کر پائے گا۔ وہ ان کی جانب دیکھے گا تو اس پر جادو ہو جائے گا۔ وہ جادو اسے پتھر کا کر دے گا اور وہ پتھر کا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ تو شروع سے ہی پتھر کا ہے۔ وہ الٹے قدموں پیچھے مڑا اور گیراج میں جا کر کھڑا ہوا۔ گیراج کے پچھلی جانب ایک واش روم تھا۔ جس کے سامنے پردہ لگا کر شاید میت کو نہلانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس نے نذیر کو اس پردے کے پیچھے ایک بڑا ٹب لے جاتے دیکھا۔ اس کا دل انتہائی زور سے دھڑکا تھا، اتنی زور سے کہ اسے اپنے کانوں میں دھڑکن کی آواز سنائی دی۔

اس نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ماموں عنایت اللہ اس کے باپ کے کسی دوست کے پاس کھڑے وفات کی وجہ بتانے کی کوشش کر رہے تھے، ان کی آوازیں اس کے کانوں تک آ رہی تھیں۔

''بس بھائی صاحب کیا بتاؤں...... ہفتہ پہلے میں مل کر گیا تو بھلے چنگے تھے۔ میرے ساتھ ایک ہی چارپائی پر بیٹھ کر روٹی کھائی۔ بیڈ پریشر (بلڈ پریشر) تھوڑا اوپر نیچے تھا مگر کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ قیمہ آلو پر خوب نمک چھڑک کر کھایا کہنے

لگے۔ ڈاکٹر جھوٹے ہوتے ہیں۔ میں بالکل بھلا چنگا ہوں اور سچی بات یہ ہے بھائی صاحب کہ واقعی بھلے چنگے لگتے تھے۔ یہ راتوں رات نہ جانے کس کی نظر کھا گئی۔ سارا مسئلہ خوراک کا ہے۔ انسان خوراک نہیں کھا رہا، خوراک انسان کو کھا رہی ہیں۔ سارا پرولم (پرابلم) ہی یہ ہے بھائی صاحب! اب زمین کی تاثیر ویسی نہیں رہی۔ تیزاب ڈال ڈال کر فصلیں اُگاتے ہیں اب۔'' ماموں عنایت اللہ جھوٹ بولنے میں ماہر تھے۔

اس کے باپ کی موت سے وہ سفید تیلیے اور گلابی سنڈی کی موت تک ایک ہی سانس میں سب کہہ دینا چاہتے تھے۔ وہ کھاد کو تیزاب ہی کہتے تھے۔

''پرابلم خوراک کا نہیں، پرابلم تو کچھ اور ہے۔ وہ چیز کچھ اور ہے جو میرے باپ کو اندر سے کھا گئی۔''

اس نے دل میں سوچا اور ایک دم گڑبڑا کر وہاں سے بھی ہٹ گیا۔ اس نے زندگی اب تک بہت موج میں گزاری تھی۔ اس کے لیے پریشانیاں ذرا مختلف طرح کی چیزیں تھیں، یہ ذہنی پریشانی اس کے حواس کو مفلوج کیے دے رہی تھی۔

''آپ کا فون ہے صاحب!'' ملازم نے اس کے قریب آ کر کہا۔ ملازم کے چہرے پر حزن و ملال تھا اور اس کے لیے ترس بھی۔ اس کی حالت واقعی ایسی ہو رہی تھی کہ سب ترس کھاتے۔

''شینا بی بی کا فون ہے۔'' ملازم نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے گویا اسے خوش کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ذرا تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ یک دم سُست پڑ گیا۔

''شینا کا؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔ ملازم نے فقط سر ہلایا۔ سُست روی سے قدم اٹھاتے وہ لاؤنج سے ہو کر دوبارہ اس بیڈ روم میں آ گیا۔ وہاں ایکسٹینشن تھا۔

''شینا! میرے فادر کی ڈیتھ ہو گئی...... کل رات...... نہیں...... آج صبح......'' اس نے تصحیح کی۔ حالانکہ یہ غلط تھا۔ وہ جانتا تھا اس کا باپ دراصل کل رات ہی مر گیا تھا۔

''اوہ...... اِٹس سیڈ...... آئی ایم سوری۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولی، پھر اس نے فون بند کر دیا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ کیا کہہ لیتی۔ اسے اس کے ڈیڈی کی اجازت کے بغیر کچھ کہنے کی اجازت ہی نہیں تھی۔

اب کی بار وہ اس کمرے میں زیادہ دیر نہیں رکا تھا۔ اسے اس کمرے سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ فوراً باہر آ گیا۔

میت کو نہلانے کی جگہ پر اب ایک بڑا تختہ، پیڑھا اور پانی والا پائپ آ چکا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اس کے باپ کو آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے لیے تیزی سے تیاریاں مکمل ہو رہی تھیں۔ ہر شخص ہی متورم آنکھیں اور متحرک ٹانگیں لیے کام میں مصروف نظر آ رہا تھا۔ فقط وہی ایک فراغت کے حصار میں تھا۔ اس قدر فراغت کے باوجود اس نے ایسی تھکن کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ اب کی بار تیز قدم اٹھاتا باہر آ گیا، جہاں اس کے تایا کھڑے تھے۔ وہ اس کے باپ سے عمر میں بڑے ہونے کے باوجود اتنے بوڑھے نہیں لگتے تھے، جتنا کہ اس کا باپ لگتا تھا۔ اپنے مخصوص آرام دہ دیہاتی لباس میں وہ دونوں بازو پیچھے باندھے کھڑے تھے۔ ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے، اس نے انہیں مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی، مگر اسے ان کے پاس کھڑے ہونے سے بہت ڈھارس ملی۔ تایا کو اس نے کبھی تمیز سے مخاطب کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اور وہی تایا اس وقت اسے سب سے زیادہ اپنے لگ رہے تھے۔

''سارے انتظامات مکمل ہو گئے پتر؟'' انہوں نے بہت دیر بعد اس کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں جی...... نہلانے کی تیاری کر رہے ہیں۔'' اس نے پیچھے مڑ کر دوبارہ اس عارضی غسل خانے کی طرف دیکھ کر

جواب دیا، جیسے کسی انسان کی تدفین میں فقط نہلانا ہی انتظامات میں شامل ہو۔

''کس قبرستان میں دفنانا ہے؟'' انہوں نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

وہ خاموش کا خاموش رہ گیا۔ اس متعلق اس نے سوچا ہی کب تھا۔

''میں...... مجھے...... مجھے تو کچھ نہیں پتا؟'' وہ واقعی سٹپٹا کر بولا۔

''گاؤں لے جانے کا ارادہ تو نہیں ہوگا، سات گھنٹے کا سفر ہے...... اتنی گرمی میں بہت مشکل ہے۔''

وہ زمین کی جانب دیکھ کر بول رہے تھے۔

''اپنی ماں سے پوچھ بچے...... میں تو دیر سے پہنچا تھا...... تم لوگوں نے تو کوئی انتظامات ہی نہیں کیے...... میرے بھائی کو ہوا میں اڑانے کا ارادہ تو نہیں ہے نا۔''

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے تھے، جب کہ وہ چکرا کر رہ گیا۔ اس نے تو کسی کام میں حصہ ہی نہیں لیا تھا۔ اس نے تو اتنی زحمت نہیں کی تھی کہ فون کر کے کسی کو اطلاع دے دیتا، سب کام صفدر اور ربیط وغیرہ نے کیے تھے۔ اس نے اپنے عقب میں دیکھا، وہ دونوں اسے کہیں نظر نہیں آئے۔ وہ ایک بار پھر پیچھے کی جانب چلا تھا۔ اسے ان دونوں کو ڈھونڈنا تھا۔

''آپ کو مامی بلا رہی ہیں؟'' اسے کسی نے دور سے مخاطب کر کے کہا۔ اس کے ماں باپ نے بہت سے لوگوں سے منہ بولے رشتے بنا رکھے تھے۔ اطلاع دینے والی لڑکی اسی منہ بولے رشتے کا استحقاق استعمال کر رہی تھی۔

''وہ کدھر ہیں؟'' اس نے استفسار کیا اور پھر جواب پا کر وہیں چل دیا، جہاں سے اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی ماں اسی بیڈروم میں اسے بلا رہی تھی جو کل رات سے پہلے تک اس کے باپ کا بھی ہوا کرتا تھا۔

O......❖......O

''کڑیو، منڈیو چیز ونڈی دی لے جاؤ۔'' اس معصوم سی پکار پر اس نے چڑ کر لحاف سر سے نیچے کیا اور مندی آنکھوں سے بیٹھک کے دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ اصغر پچھلی گلی میں کھلنے والے دروازے میں کھڑا پوری قوت سے بج رہا تھا۔ وہ دروازے کے ایک پٹ کو تھامے کھڑا تھا جب کہ دوسری جانب سے بچوں کی فوج ظفر موج اندر داخل ہو رہی تھی۔

''شی...... کسی نے رولا (شور) نئیں ڈالنا...... بھائی مرتضیٰ آیا ہوا ہے۔''

وہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجتے دعوت نامے کو روک کر اندر داخل ہونے والوں کو ہدایات بھی دے رہا تھا۔ مرتضیٰ نے جھنجلا کر لحاف گھسیٹ کر علیحدہ کیا اور چارپائی سے نیچے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ وہی بچے جو شور مچاتے، آوازیں کستے اندر داخل ہو رہے تھے، اس کو بنفس نفیس چارپائی پر بیٹھا دیکھ کر دانت نکالتے، شرماتے اندر صحن کی جانب بڑھنے لگے۔ مرتضیٰ گاؤں کے بچوں کے لیے ایک اکھڑ اور مغرور مہاراجہ کی حیثیت رکھتا تھا جو اپنی مرضی سے بولتا تھا اور ناک چڑھا کر بے تحاشا ڈانٹتا تھا۔ ان میں سے بیشتر بچے مرتضیٰ سے پڑھنے کے لیے آتے رہے تھے۔

''اماں جی! یہ کام آپ شام کے وقت کر لیا کریں۔ اب بندہ یہاں سکون سے سو بھی نہیں سکتا۔''

وہ چپلیں گھسیٹتا، روکھے بالوں میں انگلیاں چلاتا باہر صحن میں اماں جی کی چارپائی پر آبیٹھا۔ اماں جی نے نثار ہونے والی نظروں سے بیٹے کے چہرے پر پھیلی ناگواری کو دیکھا، پھر مسکراتے ہوئے سامنے پڑی تپائی پر رکھی کینوؤں کی ٹوکری میں سے ایک ایک اٹھا کر آنے والے بچوں کو تھمانے لگیں۔ ان کی نصیحتیں بھی ساتھ ساتھ جاری تھیں۔

کسی کو صاف ستھرا رہنے کے لیے کہہ رہی تھیں، کسی کو موٹے کپڑے پہننے کے لیے فرمان جاری ہو رہے تھے جب کہ

اکثریت سے ان کی ماؤں کے احوال دریافت کیے جا رہے تھے۔

''ان بلونگڑوں سے فارغ ہو کر میری بھی سن لیجئے گا۔'' وہ وہاں سے بھی جھنجلا کر اٹھا اور بیٹھک کے ساتھ والے کمرے میں آ کر رنگین پایوں والے پلنگ پر دراز ہو گیا۔ سردیوں کی چھٹیاں ہوتے ہی وہ گاؤں آ گیا تھا اور فطری بات ہے کہ اس کا دل لاہور کی گہما گہمی میں کہیں اٹک کر رہ گیا تھا۔ گزشتہ سات ماہ میں یہ اس کا تیسرا چکر تھا اور اس کا دورانیہ بھی لمبا یعنی ایک ہفتہ تھا اور وہ تیسرے ہی دن اُکتا کر واپس جانے کے متعلق سوچنے لگا تھا۔

کالج میں پروموشن ٹیسٹ ہونے والے تھے۔ ان کی پریشانی بھی سر پر سوار تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہ بہت سی سوسائٹیز کا ممبر بن چکا تھا۔ اس کی بہت سی سرگرمیاں تھیں جو اس کے ذہن کو متحرک رکھتی تھیں۔ یہاں گاؤں میں بیٹھ کر وہ ان کے متعلق سوچ ضرور سکتا تھا مگر کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا حالانکہ یہاں اس کی بہت آؤ بھگت ہوتی تھی۔ بھائی بھابی مہمان سمجھ کر بہت چاؤ چونچلے کرتے تھے جب کہ اماں اور ابا جی کی محبت تو تھی ہی شہد جیسی خالص جس کی مٹھاس اسے محسوس ضرور ہوتی تھی مگر نہ جانے کیوں شہری گہما گہمی اسے ہر جگہ اپنی جانب کھینچ لیتی تھی۔

''تیرے مامے نے کینوؤں کے ٹوکرے بھجوا دیئے تھے، ان کی چھانٹی کر کے بچوں میں بانٹ رہی تھی۔ یہ کام دھندے بھی تو ضروری ہوتے ہیں نا پتر! تجھے پتا ہے نا ہر سال سارا محلہ انتظار میں ہوتا ہے کہ بھٹیوں کے گھر کینو آئیں تو سب جی بھر کر کھائیں، سب کو خبر ہے تیرے مامے کے باغ ہیں۔ اتنا پھل آیا تھا ماشاء اللہ...... ہم نے کیا کرنا تھا پہلے سب کو گھر میں بھجوائے تھے پھر بچوں میں بھی بانٹ دیئے۔ سب سے بڑا والا ٹوکرا تیرے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ جاتے وخت لے جانا...... میں تو فکر میں ہی رہتی ہوں یہاں کہ میرا پتر وہاں ٹھیک سے کھاتا بھی ہوگا یا نہیں۔''

اماں جی ایک ہاتھ کمر پر رکھے دوسرے میں سرسوں کے تیل کی بوتل تھامے دھیرے دھیرے اندر چلی آ رہی تھیں۔ ان کے لہجے میں عجیب سی معذرت تھی جیسے بیٹے کی ناراضی کا بے حد احساس ہو۔ مرتضیٰ نے شرمندہ ہو کر ٹانگیں پیچھے کر کے ان کے لیے پلنگ پر جگہ بنائی۔

''آ تیرے بالوں میں تیل ڈال دوں۔ تجھے گرمی ہو گئی ہے کتابوں کی۔''

وہ اسے چمکار کر بولیں۔ مرتضیٰ ان کی دلیل پر مسکراتے ہوئے پلنگ سے اتر آیا۔ سرخ اینٹوں والا فرش بے حد ٹھنڈا تھا۔ پلنگ کے نیچے پیڑھا موجود تھا۔ اس نے اسے گھسیٹ کر باہر نکالا اور اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اماں جی اس کے سوکھے، قدرے بڑھے ہوئے بالوں میں سرسوں کا تیل انڈیل کر جھریوں بھرے ہاتھوں سے مالش کرنے لگیں۔ اسے اتنے دن کے بعد ممتا بھرا لمس ملا تھا، اس لیے بے حد سکون محسوس ہوا۔

''مرتضیٰ! ایک بات کرنی تھی تجھ سے پتر!'' اماں جی نے مالش کرتے ہاتھ روک کر ڈرتے ڈرتے اس سے اجازت طلب کی۔ اسے بے حد عجیب لگا۔ پیڑھے پر بیٹھے بیٹھے اس نے رخ موڑا اور ان کے چکنے ہاتھوں کو چومنے لگا۔

''اماں جی! آپ تو میری سہیلی ہیں، آپ کو مجھ سے بات کرنے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔''

اماں جی نے بہت دن کے بعد اپنے لاڈلے کے لاڈ دیکھے تھے۔ بے حد مسرور ہو کر انہوں نے اس کی پیشانی کو چوما۔

''پتر! میں تیری طبیعت سے واقف ہوں، اسی لیے تجھ سے یہ بات کر رہی ہوں۔''

مرتضیٰ نے ان کا اتنا سنجیدہ انداز پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے ہاتھوں کو ہاتھ میں لیے وہ بغور ان کی بات سننے لگا تھا۔

''بہت بچپن سے تُو ایسا ہی ہے۔ اپنے بارے میں فیصلہ کرتے وقت سوچتا نہیں ہے پھر پچھتاتا ہے۔ تجھے آگے جانے

کا شوق ہے اور اس چلر میں تُو پیچھے والوں کو بہت پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ میری بات کو دھیرج سے سننا مرتضیٰ! اللہ نے مجھے دو ہی اولادوں کو پالنے کی خوشی دی۔ میری آنکھوں کی روشنی ہو تم دونوں، میں نہیں چاہتی کہ یہ روشنی مجھ سے دور ہو بچہ!''

وہ بہت سوچ سوچ کر بول رہی تھیں۔ مرتضیٰ الجھ کر ان کی سمت دیکھنے لگا۔ اس نے اماں جی کے منہ سے ایسی باتیں پہلے کب سنی تھیں۔

اماں جی کے انداز میں جھجک سی تھی، جو مرتضیٰ کے تجسس کو بڑھا رہی تھی۔

''پتر! صفیہ بہت زور دے رہی ہے۔'' ان کے ایک جملے نے ہی اس تجسس کے غبارے سے ہوا نکال دی۔ وہ جوان کی جانب رخ کر کے بیٹھا تھا، فوراً سیدھا ہو گیا۔

''اونہہ...... آج تک خالہ صفیہ نے زور دینے کے علاوہ آپ کو دیا ہی کیا ہے اور آپ کیا ہر ایک سے کچھ نہ کچھ لیتی رہتی ہیں۔ ان سے کہیں سنبھال کے رکھیں اپنی زور زبردستی اور نسرین بانو...... ہمیں آلتو فالتو چیزیں جمع کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔''

وہ واقعی چڑ گیا۔ اماں جی منہ بسور کر اس کے سر پہ الٹے سیدھے ہاتھ مارنے لگیں۔ ان کے دل میں پہلے سے ہی خدشہ موجود تھا کہ وہ ان کی بات سن کر چڑ جائے گا۔

''اونہہ......! مجھے تو بھجا قصائی سمجھتی ہیں جو پہلی بھینس نظر آئے گی، اسے ہی چُھری پھروا دیں گی۔ آنکھوں کی روشنیاں ایسے اندھیروں پر قربان کی جاتی ہیں بھلا...... بھائی کی دفعہ چاچے برکت کا زور تھا اور میری دفعہ خالہ صفیہ کی کمیٹی نکالنے کا ارادہ ہے۔ ارے بیٹے کوئی آسانی سے ملتے ہیں کہ بے کار چیزوں کی طرح اِدھر اُدھر پھینک دیئے جائیں۔''

اماں جی کے کمرے سے چلے جانے کے بعد بھی وہ جلتا کُلستا رہا۔ جب تھک ہار گیا تو نہا دھو کر ابا جی کے پاس چلا آیا۔ وہ آج کل زیادہ تر کھیتوں میں پائے جاتے تھے۔ سردی کی وجہ سے نرم گرم دھوپ کا مزہ لینے کے لیے وہ کھیتوں میں آ جاتے تھے، یوں بھی ان کی صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ بڑے بیٹے کے ساتھ ہر کام میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر کافی خوش ہوئے۔ وہ اسے کھیتوں میں دیکھ کر ہمیشہ ہی خوش ہوتے تھے۔ اتنی سردی میں وہ کاٹن کی دھوتی کے ساتھ کھدر کا کرتہ اور اس کے اوپر جرسی پہنے حقہ گڑگڑانے میں مصروف تھے۔

''اوہ میرا شیر آیا...... بلے بھئی بلے...... آ جا میرا پتر۔''

دونوں بانہیں وا کر کے انہوں نے اسے خوش آمدید کہا۔ وہ کھلتی ہوئی زرد دھوپ کی سنہری خوشبو کو محسوس کرتا ان ہی کے پاس چارپائی پر آ بیٹھا۔

''جب ایسی دھوپ میری زمین پر پڑتی ہے نا...... میرا جی بہت خوش ہوتا ہے۔'' ابا جی اس کا کندھا تھپتھپا کر بولے۔

''دیکھ نا۔'' انہوں نے اس کی عدم توجہی کو محسوس کر کے اس کی توجہ دوبارہ کھیت کی طرف مبذول کروائی۔ وہ زمین سے نکلتے ننھے منے پودے ہی دیکھ رہا تھا، مگر ابا جی کی تسلی ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''دیکھ یار!'' اب کی بار پشت پر دھپ بھی پڑا۔

''دیکھ تو رہا ہوں...... اب کیا مائیکروسکوپ لے آؤں۔'' اس نے جھنجلا کر کہا۔

ابا جی ہنس دیئے۔ وہ جان بوجھ کر اسے تنگ کرنے کو بھی ایسی حرکتیں کیا کرتے تھے، وہ بھی ہنس دیا۔

''آپ کب بڑے ہوں گے ابا جی!'' اس نے ان کے معصوم چہرے کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

''جب تُو ابا جی بن جائے گا۔'' وہ مزے سے بولے۔ مرتضیٰ نے گہری سانس بھری۔

''اس کا مطلب یہ کہ دس پندرہ سالوں تک آپ کے بڑے ہونے کا کوئی چانس نہیں ہے۔''

ہئے پاگل نہ ہو تو...... ایسی بات نہیں نکالتے منہ سے۔'' انہیں حقیقتاً برا لگا۔

مرتضیٰ چہرے پر مسکراہٹ لیے کھیتوں کی جانب دیکھتا رہا۔ اس کا دل چاہا وہ انہیں اپنی کامیابیوں کے متعلق بتائے، انہیں بتائے کہ وہ بہت اچھی اداکاری کی بناء پر آج کل بہت تعریفیں وصول کر رہا ہے مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش رہا۔ انہیں اس کی باتیں سمجھ میں ہی نہیں آتی تھیں۔ وہ جتنی دلچسپی سے انہیں ایسی کوئی بات بتانے کی کوشش کرتا تھا، وہ اس سے کہیں زیادہ دلچسپی سے اس کی بات سن کر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایسے میں مرتضیٰ کو ان پر بہت پیار آتا۔ ساری زندگی کھیتی باڑی میں گزار دینے والے اس سادہ لوح انسان کے لیے جی سی اور اس میں پڑھنے والا ان کا بیٹا ایک جتنے مشکل تھے۔ کھیتوں کی جانب دیکھتے ہوئے اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب ابا جی نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔

''تجھے نسرین واقعی اچھی نہیں لگتی؟'' ابا جی نے یک دم ہی پوچھا۔ اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ گھوم پھر کر یہی سوال بار بار اس سے پوچھا جا رہا تھا۔

''نہیں، میں جھوٹ بولتا رہتا ہوں...... مجھے بہت اچھی لگتی ہے وہ...... چم چڑک (چمگادڑ)'' وہ تڑخ کر بولا۔

''ہے نا...... میں خود تیری ماں سے یہی کہہ رہا تھا کہ اپنا مرتضیٰ دل سے راضی ہے مگر شرماتا ہے، اس لیے صاف نہیں کہتا۔''

انہوں نے اطمینان بھری سانس خارج کی تھی۔

''ابا جی! میں آپ کو بہت برا لگتا ہوں نا...... آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے نا۔'' وہ انتہائی جذباتی لہجے میں بولا۔ ابا جی تڑپ اٹھے۔

''پگلا...... تُو کیوں مجھے برا لگے گا۔ میرا اتنا سوہنا پتر ہے تُو...... منتوں مرادوں سے رو رو کر لیا تھا تجھے خدا سے...... تیری ذرا سی بیماری سے میری جان نکل جایا کرتی تھی۔ جب تک تجھے پانچواں نہیں لگ گیا تھا، میرے دل کو دھڑکا ہی لگا رہتا تھا۔ تجھ سے پہلے تین اولادوں کو انہی ہاتھوں سے دفنایا تھا۔ تیری باری تو ہمت ہی جواب دے چکی تھی۔ میرے سینے کی ٹھنڈک ہے تُو غلام مرتضیٰ۔''

وہ انتہائی جذباتی لہجے میں کہہ رہے تھے۔ انہوں نے مرتضیٰ کو سینے سے لگا لیا تھا اور مرتضیٰ بھی جیسے اندر تک سرشار ہوا تھا۔ کھیتوں کے ساتھ ہی انہوں نے ایک کچا کمرہ تعمیر کر رکھا تھا جو گرمیوں میں اٹھنے بیٹھنے کے لیے کافی تھا۔ مصطفیٰ بھائی اسی کمرے میں بیٹھے تھے۔ وہ نہ جانے کیوں اٹھ کر باہر نہیں آئے تھے۔

''مرتضیٰ! ماں باپ اولاد کے دشمن نہیں ہوتے۔ وہ اولاد سے زیادہ کسی کا اچھا نہیں سوچتے۔ ہم بھی تیرے بارے میں اچھا ہی سوچتے ہیں۔ میں اور تیری ماں اسی لیے نسرین کی بات کرتے ہیں کہ وہ لڑکی تجھے سنبھال سکتی ہے۔ اپنی بچی ہے اور میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ......'' وہ کچھ جھجکے۔

''وہ تیرے لیے...... اچھے جذبات رکھتی ہے۔''

انہوں نے رک رک کر بات مکمل کی۔ اس زمانے میں ایسی بے دھڑک باتیں اتنے آرام سے کرنے کا رواج نہیں تھا۔ مرتضیٰ نے ان کے چہرے کی جانب دیکھا۔ نسرین اس کے لیے کیسے جذبات رکھتی ہے، یہ اس سے بہتر کون جان سکتا

تھا۔

''ابا جی! میں کسی خاص وجہ سے انکار نہیں کر رہا۔ مجھے ابھی ان جھنجھٹوں میں نہیں پڑنا۔ ابھی تو میرا سفر شروع ہوا ہے ابا جی! ابھی تو میری منزل بہت دور ہے۔ منزل تک پہنچنے سے پہلے اس قسم کے پڑاؤ مجھے مقصد سے ہٹا دیں گے۔''

وہ دھیمے لہجے میں بولا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اس کا فلسفہ سن کر ابا جی بھڑک اٹھیں گے۔

''یہ پڑاؤ نہیں ہے...... یہ منزل ہے بیٹا...... تو جتنی مرضی دور چلا جائے...... واپس تو یہیں آنا ہے...... تیری جڑیں تو یہیں ہیں نا...... تیرا رزق اس جگہ سے وابستہ ہے میرے بچے! پڑھائی تیرا شوق ہے......شوق پورا کر کے واپس آ جا۔''

وہ اس کی پشت سہلاتے ہوئے بہت پیار سے اسے سمجھا رہے تھے۔ اس نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ وہاں وہی ازلی شفقت تھی جو ہمیشہ سے اس کے حصے میں آتی رہی تھی۔ ابا جی جو کہہ رہے تھے، وہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا اور جو کچھ وہ سوچتا تھا، وہ اس نے کبھی ابا جی سے کہا نہیں تھا۔

''میری ایک بات یاد رکھنا پتر! زمین اڑیل گھوڑی کی طرح ہوتی ہے۔ اسے پیار کی بہت طلب ہوتی ہے جو اسے پیار کرتا ہے، سہلاتا ہے، اس کے لیے پسینہ بہاتا ہے، یہ اسے ہی پہچانتی ہے، اور جسے یہ پہچانتی ہے یہ اسی کی ہو جاتی ہے۔ زمین کی وفاداری حاصل کرنا ہو تو اسے توجہ دینا پڑتی ہے۔ میں نے اس زمین کو بہت توجہ دی ہے۔ یہ میرے ساتھ وفادار ہے۔ اس نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا۔ یہی حال مصطفیٰ کا ہے، وہ اس کے لیے خون پسینہ ایک کر دیتا ہے تو یہ اسے سونے میں تولتی ہے مگر......'' وہ لحہ بھر کے لیے رکے۔

''مگر یہ تجھے نہیں پہچانتی، مرتضیٰ تو اس کے ساتھ وقت نہیں گزارے گا تو یہ اڑیل گھوڑی تیرے قابو نہیں آئے گی پتر!''

مرتضیٰ کے لیے ان کی باتیں بہت پریشان کن تھیں۔ وہ کبھی کھیتی باڑی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا اور ابا جی اسے کیا سبق پڑھا رہے تھے۔ اسے اپنی پریشانی میں اتنی فرصت بھی نہیں ملی تھی کہ وہ ابا جی کو ان کے فلسفے کے لیے سراہ سکتا۔ وہ فقط گہری سوچ میں گم ہو گیا تھا۔



''اس کے بعد کیا کرو گے تم؟''

طلحہ نے بنیان سے جھانکتے ڈھولکی جیسے چھوٹے سے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سامنے دیوار کی جانب گھور گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ دیوار پر زینت امان کی تصویر لگی ہوئی تھی جسے طلحہ نے ہی کسی میگزین سے کاٹ کر چپکایا تھا۔ تصویر کے اوپر ایک کیل لگی تھی جس کے ساتھ کیلنڈر لٹکا ہوا تھا۔ جب کسی چھاپے کا خطرہ ہوتا تھا تو یہی کیلنڈر کھینچ کر نیچے کر دیا جاتا تھا اور یہ صرف اس لیے کیا جاتا تھا کہ مرتضیٰ کو کسی قسم کی وضاحت دینے سے خوف آتا تھا۔ وہ وارڈن ٹیچر سے کافی ڈرتا تھا جب کہ طلحہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ گزرے دو سالوں نے ان سب دبو اور بزدل لوگوں کو کافی نڈر کر دیا تھا۔ فورتھ ایئر کب کی جا چکی تھی بلکہ اب تو وہ بھی کالج سے پاس آؤٹ ہونے والے تھے۔ سعدی کے چلے جانے کے بعد طلحہ نے مرتضیٰ کے کمرے میں الاٹمنٹ کروالی تھی۔ سعدی نے مزید پڑھنے کے لیے جی سی کا انتخاب نہیں کیا تھا بلکہ وہ بیرون ملک چلا گیا تھا۔ مرتضیٰ کی اس سے بہت دوستی ہو گئی تھی اور وہ اسے بہت یاد کرتا تھا۔ اس کا حلقہ احباب اور سرگرمیاں بے حد پھیل چکی تھیں مگر وہ سعدی کو خط لکھنے کے لیے وقت ضرور نکال لیتا تھا۔ گریجویشن کے فائنل ایئر کے ایگزام تقریباً سر پر پہنچ چکے تھے۔ سو اب سب ہی شرارتیں چھوڑ کر پڑھائی کے لیے سنجیدہ ہو چکے تھے۔ یعنی پہلے ایک گھنٹہ پڑھا کرتے تھے، اب ڈیڑھ گھنٹہ پڑھنے لگے تھے۔

مرتضیٰ کو ابتداء سے کتابیں رٹنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ وہ بھی باقی لڑکوں کی طرح مخصوص اور اہم سوالات امتحان سے ایک دن پہلے یاد کر لیتا تھا اور جنہیں یاد نہیں کرتا تھا، وہ کمرہ امتحان میں اِدھر اُدھر سے پوچھ کر حل کر لیے جاتے تھے۔ سو پریشانی تو کوئی تھی ہی نہیں، اسی لیے وہ طلحہ کے سامنے بیٹھا آئینہ ہاتھ میں لیے چھوٹی قینچی سے مونچھوں کی تراش خراش میں مصروف تھا۔ طلحہ کے سوال پر اس نے چہرہ دائیں بائیں جانب سے آئینے میں چیک کیا پھر خود کو سراہ کر بولا۔

''نہانے جاؤں گا۔'' طلحہ نے قدرے اونچے ہو کر اس کے ہاتھ سے آئینہ چھین کر اس کے زانو پر زور سے مارا پھر ناک چڑھا کر بولا۔

''میرا مطلب تھا کہ بی اے کے بعد کیا کرو گے؟'' مرتضیٰ کو پلاسٹک کے فریم والا آئینہ کافی زور سے لگا تھا۔ وہ زانو سہلا کر اسے گھور کر بولا۔

''تیرا قتل کروں گا کمینے!''

''تجھے ترس نہیں آئے گا میرے بچوں کو یتیم کرتے ہوئے۔ اتنے پیارے پیارے کیوٹ کیوٹ بچوں کے سر سے باپ کا سایہ چھینتے ہوئے تیرا دل نہیں دُکھے گا۔''

وہ انتہائی چرب زبان اور بلا کا ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔

''تیری باتوں سے صاف پتا چلتا ہے کہ تُو بی اے کے بعد بیاہ ہی کرے گا......نکما نہ ہو تو۔'' مرتضیٰ کو حقیقتاً ابھی تک یہ مرض نہیں لگا تھا۔ وہ اکثریت کی طرح لڑکیوں کے بارے میں گفتگو اور ان سے دوستی میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا جب کہ طلحہ تو اس فیلڈ میں پی ایچ ڈی کیے ہوئے تھا۔

''اس میں نکمے پن والی کیا بات ہے۔ نکاح کرنا سنت ہے اور تم جانتے ہو، میں بہت اچھا مسلمان ہوں۔''

''میں جیسے جانتا نہیں تمہیں...... ہر داڑھی والے کو سکھ کہہ دیتے ہو......نماز تم عید کی بھی نہیں پڑھتے...... جھوٹ ایسے بولتے ہو جیسے انسان سانس لیتا ہے۔'' وہ اس کی خصوصیات گنوا رہا تھا کہ طلحہ نے بات کاٹ دی۔

''Wili you shut up please مجھ میں انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ میں اپنی تعریفیں سننا زیادہ پسند نہیں کرتا۔''

طلحہ بے نیازی سے بولا۔ مرتضیٰ بھی اس بے مزہ بحث کو بڑھانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ سو وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور الماری سے نہانے کے لیے کپڑے، تولیہ وغیرہ نکالنے لگا۔

''تم ایم اے کرو گے؟'' طلحہ نے ایک بار پھر اسے پکارا۔

''ہاں۔'' اس نے الماری کے اندر جھانکتے ہوئے مثبت جواب دیا پھر اس کی جانب رخ کر کے بولا۔

''کیوں......؟ تم نہیں کرو گے؟''

''اوں ہوں...... ماسٹرز کر کے بھی مجھے سول سروس میں ہی جانا ہے میرے ابا اور بھائی جو کر رہے ہیں، میں بھی وہی کروں گا۔ پیپرز کے فوراً بعد اکیڈمی جوائن کر لوں گا پھر دن رات موٹی موٹی غیر دلچسپ کتابیں پڑھوں گا۔ انگلش اور اردو اخباروں کے اداریے پڑھوں گا، انہیں اپنے لفظوں میں پروڈیوس کرنے کی کوشش کروں گا۔ جب تم جیسے ناکارہ اور معمولی لڑکے لاہور کی سڑکوں پر لڑکیاں تاکنے میں مصروف ہوا کریں گے، میں نے اپنے ابا کی سٹڈی میں بورنگ انٹرنیشنل اور نیشنل افیئرز ڈسکس کیا کروں گا۔ اُف کس قدر مشکل زندگی ہوگی...... مجھے بی اے میں فیل کر دے یا اللہ...... مجھ غریب کی

بھی سن لے۔"

مرتضیٰ نے بہت مشکل سے اس کی بات ہضم کی۔ اس کے بڑے بھائیوں سے وہ دو ایک بار مل چکا تھا۔ وہ واقعی کافی بارعب شخصیت کے مالک تھے لیکن طلحہ ان سے اتنا ڈرتا ہوگا، یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔ اس کے ذہن میں ابا جی کی نرم شخصیت اور بڑے بھائی کی حلیم طبیعت جگمگانے لگی۔

"میرے ابا جی ایسے نہیں ہیں۔ انہوں نے کبھی مجھ پر کسی چیز کے لیے رعب نہیں ڈالا۔ میں اپنی مرضی سے یہاں پڑھنے آیا، سبجیکٹس بھی اپنی مرضی کے لیے اور......" اب کی بار طلحہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بھٹی صاحب! آپ اپنی بات نہ کریں، آپ تو منتوں مرادوں والی اولاد ہیں، آپ کی آؤ بھگت نہیں ہوگی تو کیا ہم جیسوں کی ہوگی۔ ہم جیسے تو اگر معاشیات کے بجائے فائن آرٹس پڑھنا چاہیں تو ہمارے ابا آنکھیں نکالتے ہم پر چڑھ دوڑتے ہیں۔" وہ اب چارپائی سے ٹانگیں نیچے لٹکا کر بیٹھ گیا تھا۔

"مرتضیٰ! سنجیدگی سے بتاؤ، تم کیا کرو گے...... کچھ تو سوچا ہوگا نا یا پھر اپنے ابا جی کی طرح وائی بیجی (کھیتی باڑی) کا ارادہ ہے۔"

طلحہ کے لہجے میں سنجیدگی اور طنز کی آمیزش تھی۔ مرتضیٰ نے چونک کر اس کی شکل دیکھی، اس کے ذہن میں ابا جی کے کہے گئے جملے گونجے۔ اب تو وہ اکثر و بیشتر اسے یاد کرواتے تھے کہ زمین اس کی منتظر ہے اور وہ نہ جانے کس منزل کی تلاش میں تھا۔

"مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ تم بہت آگے جاؤ گے۔ تمہاری تخلیقی صلاحیتیں بہت شارپ ہیں...... اگر تمہیں ٹی وی پر یا فلم میں اچھے چانسز مل گئے تو پھر تمہیں مشہور ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔"

وہ سادہ سے لہجے میں بولا تھا۔ مرتضیٰ نے اپنے دل میں جھانکا اور اسے پہلی بار لگا کہ جو اس کے دل میں ہے طلحہ نے اسی خیال کو زبان دے دی ہے۔ اس کے چہرے پر خوش کن مسکراہٹ پھیل گئی مگر وہ طلحہ کو ٹالنے کے لیے بولا۔

"پتا نہیں یار...... میں نے اس کے متعلق کبھی نہیں سوچا...... ابھی تو پیپرز دینے ہیں۔ ایک بار گریجویٹ ہو گئے، آگے کے متعلق اس کے بعد سوچیں گے۔"

کہنے کو اس نے بات ٹال دی مگر کاتب تقدیر نے شاید فوراً وہیں کچھ نہ کچھ لکھ لیا تھا۔ اس کے بعد وقت سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑنے لگا۔ وقت کی فطرت میں بے وفائی ہے اور انسان اس قدر معصوم ہے کہ اس بے وفائی کو ہر حال میں برداشت کرنے پر مجبور ہے۔ یہ انسان کو اپنے شکنجے میں ایسے جکڑتا ہے کہ شاد و ناشاد سب کو اس کے پیچھے بھاگنا ہی پڑتا ہے۔ وہ سب بھی وقت کے پیچھے ایسے بھاگنے لگے جیسے معصوم بچے تتلیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ انہی تتلیوں کا تعاقب کرتے وہ مزید دو سال آگے نکل آئے۔ کچھ ساتھی بی اے کے بعد بچھڑ گئے تھے اور جو رہ گئے تھے، وہ مضامین مختلف ہونے کی وجہ سے کم ملنے لگے۔

مرتضیٰ نے ان دو سالوں میں جی بھر کر کامیابیاں سمیٹیں۔ وہی غلام مرتضیٰ بھٹی جو واسع کے ہاتھوں ریجکیٹ ہو جانے کے بعد بے حد مایوس ہو گیا تھا، اب وہی غلام مرتضیٰ بھٹی کالج کا بیسٹ ایکٹر قرار دیا جاتا تھا۔ ڈرامیٹکس کے انچارج ہاشمی صاحب اسے اپنا دستِ راست قرار دیتے تھے۔ وہ کیا کام تھا جو مرتضیٰ نہیں کر سکتا تھا۔ ہر ایک کی نقل اتارنے سے لے کر ہر طرح کا گیٹ اَپ اپنانے تک وہ ہر چیز میں ماہر تھا۔ گزشتہ دو سالوں میں اس نے کالج کے ہر پروگرام میں بہترین پرفارمنس

دی تھی۔ وہ اس فیلڈ میں اتنا ایکسپرٹ تھا کہ اگر عین وقت پر کوئی لڑکا کوئی کردار ادا کرنے سے معذرت کر لیتا تو وہ کردار مرتضیٰ کو دے دیا جاتا وہ اسے بغیر ریہرسل بھی بہت مہارت سے ادا کر لیتا تھا۔

ایم اے فائنل ایئر میں سالانہ ڈرامہ کے لیے اس نے ایک زبردست آئیڈیا ترتیب دیا تھا جس کی دھوم بہت مچی تھی اور اس کے حصے میں بے حد ستائش آئی تھی۔

اس نے جارج برنارڈ شا کے پلے

"Armsand the man"

کے کچھ حصوں کو پنجابی میں ڈب کر کے پیش کیا تھا۔ انگریزی ناموں والے سب کرداروں کا گیٹ اَپ بھی پنجابی تھا۔ یعنی ہیرو دھوتی کرتے میں ملبوس جب کہ ہیروئن لاچے کرتے اور گھنگھروؤں والے پراندے میں قلانچیں بھرتی پھرتی تھی۔ مرتضیٰ نے اس ڈرامے میں ہیروئن رائنا کا کردار ادا کیا تھا۔

اس کے بعد اس نے ایک سنجیدہ پلے لکھا تھا جس کا نام "مرگِ برگ" تھا۔ اس پلے میں اس نے اپنی تمام تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نا صرف ایکٹنگ کی بلکہ اس پلے کو بہت مہارت کے ساتھ کسی کی مدد کے بغیر اسٹیج پر پیش بھی کیا۔ اس پلے کی کہانی ایک ایسے شخص کے گرد گھومتی تھی جو زندگی کے مصائب کو بہت خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے اور بہار کے انتظار میں ہر مشکل کا سامنا بہت ہمت سے کرتا ہے مگر جب بہار آتی ہے تو اس شخص کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس پلے میں اس نے مرکزی کردار ادا کیا تھا اور اس بار وہ سنجیدہ اداکاری میں بھی اپنا لوہا منوانے میں کامیاب رہا تھا۔ اس پلے کو جب اس نے اسٹیج پر پیش کیا تو اس کی دعوت اور پُرزور فرمائش پر ابا جی گاؤں سے یہ تماشا دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ بیٹے کو ملنے والی ڈھیروں داد نے ان کا کئی لیٹر خون بڑھا دیا تھا لیکن جو چیز ان کے لیے تکلیف دہ تھی، وہ یہی تھی کہ ان کی نصیحتوں اور اصرار کے باوجود ان کا بیٹا شہر کو پیارا ہو چکا تھا۔ بلاشبہ وہ ان سے محبت کرتا تھا۔ ان کی وجہ سے اسے کبھی کوئی احساس کمتری نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے بے حد امیر اور شہری دوستوں سے انہیں بہت اعتماد سے متعارف کرواتا تھا مگر وہ گاؤں سے الرجک تھا اور وہ اس چیز کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔

فائنل ایئر کے ایگزامز میں کچھ دن رہتے تھے کہ میانوالی سے طلحہ ملنے چلا آیا۔ وہ ایک بار سی ایس ایس Written میں ناکام ہو جانے کے بعد اب دوسری بار تیاری کر رہا تھا۔ زبیر اور آصف بھی گریجویشن کے بعد مزید پڑھائی کا ارادہ ترک کر کے خاندانی کاروبار سنبھال چکے تھے۔ طلحہ نے فون کر کے انہیں بھی لاہور بلوا لیا۔ رضوان اور مرتضیٰ تو ایم اے میں بھی اکٹھے تھے جب کہ حبیب اور ربیط ان کے گروپ میں ایم اے میں ہی شامل ہوئے تھے۔ طلحہ کی آمد کی وجہ سے وہ سب ایک روز شاندار ساڈنر اڑانے کے لیے مال روڈ چلے آئے۔ زبیر اور آصف کے علاوہ سب ہی کنگلے تھے، اسی لیے ڈنر چندہ جمع کر کے ایک چھپر ہوٹل میں کیا گیا۔ چنے کی بھنی خوب مرچوں والی دال کے ساتھ تندور کی روٹیاں، اچار، سلاد اور تلی ہوئی مچھلی نے جشن کا سا سماں پیدا کر دیا تھا۔ ندیدہ ان میں سے کوئی بھی نہیں تھا مگر ہاسٹل کی پرانی عادت کے باعث خوب چھین جھپٹ ہوئی۔ مچھلی کے آخری قتلے پر تو وہ تماشا ہوا کہ سب مزدور لوگ جو اس چھپر ہوٹل میں کھانا کھانے آئے ہوئے تھے، اپنا کھانا روک کر ان سب کی جانب دیکھنے لگے۔ مچھلی کا وہ قتلا رضوان سے زبیر اور پھر مرتضیٰ کے ہاتھ سے ہوتا ہوا بالآخر طلحہ کے پیٹ کی زینت بنا تھا جس نے باریک کانٹوں کی پروا کیے بغیر وہ قتلا نگل لیا تھا۔ سب سے آخر میں آرسی کولا چڑھایا گیا۔ اس کی دفعہ بھی یہی سب کچھ ہوا۔ طلحہ ان سب سے زیادہ پھرتیلا تھا، سو اپنی بوتل ختم کر کے اب وہ اس چکر میں تھا کہ کسی طرح ساتھ بیٹھے رضوان کی

بوتل پر قبضہ کرلے۔

"میری بوتل کو ہاتھ مت لگانا...... میں نے اس میں دو بار تھوکا ہے۔" اس کی عیاری بھانپ کر رضوان نے بہ آواز بلند اپنا کارنامہ بتایا تھا۔

"آخ......تھو......گندا۔" طلحہ نے اس کے کندھے پر زوردار دھپ رسید کی۔

"واہ رضوان......کتنا اچھا آئیڈیا آیا ہے تیرے ذہن میں اس کمینے سے اپنی بوتل بچانے کا۔"

کھانا کھانے کے بعد انہوں نے کھوئے والی قلفیاں کھائیں اور یہ طے ہوا کہ کچہری روڈ تک پیدل چل کر جایا جائے۔ ربیط کافی نازک اندام تھا مگر ان کے اصرار کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی۔ وہ کچھ دیر چلتے پھر کسی فٹ پاتھ پر نشیوں کی طرح بیٹھ کر لطیفے سنانے لگتے یا کسی پرانے واقعہ کو یاد کر کے ہنسنے لگتے۔ ایک کھوکے سے میٹھے پان خرید کر کھائے گئے۔ تیز بھاگتی ٹریفک کے شور میں ان کا ہلا گلا الگ ہی بہار دکھا رہا تھا۔ اکثر گاڑیوں میں بیٹھے لوگوں نے ان کے قریب سے گزرتے ہوئے حیرانی سے ان کی جانب دیکھا۔ ایک گاڑی میں بیٹھے شخص نے تو ازراہ مذاق ان کی جانب چند سکے بھی اچھالے، جنہیں خوش دلی سے قبول کیا گیا۔

"تم ایک ہفتہ اسی سڑک پر اسی طرح لگالو تو ریاض جانے کا کرایہ بہت آرام سے نکل سکتا ہے۔"

طلحہ نے زبیر کو مشورہ دیا تھا کیونکہ آج کل وہ مڈل ایسٹ جانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

"تم بھی میرے ساتھ بیٹھنا، تمہارے ولیمے کا خرچا بھی یہیں سے پورا کرلیں گے۔" زبیر نے چڑ کر کہا تھا۔

"یار! پہلے اس کا بندوبست تو کرلو جس کی وجہ سے ولیمہ ممکن ہوگا۔ کمبخت نہ جانے کہاں چھپی بیٹھی ہے۔" وہ مصنوعی آہ بھر کر بولا۔

"آؤ یارو! مل کر سوچتے ہیں کہ ہماری متوقع بیویاں اس وقت کیا کر رہی ہوں گی۔" یہ طلحہ کا پسندیدہ موضوع تھا۔

"میری والی تو آئن اسٹائن کے نظریات رٹ رہی ہوگی۔ اسے رات کے اس پہر بھی میری نہیں بلکہ آئن اسٹائن کی یاد ستاتی ہے۔"

ربیط ناک چڑھا کر بولا۔ وہ ان کے گروپ کا واحد منگنی شدہ تھا۔ اس کی منگیتر فزکس میں آنرز کر رہی تھی۔

"تم فکر مت کرو۔ آئن اسٹائن مر چکا ہے، سو تمہاری والی فقط اس کو یاد ہی کر سکتی ہے۔" حبیب نے اس کے شانے کو سہلا کر تسلی دی تھی۔

"میری والی اس وقت نماز عشاء ادا کر کے مصلے پر بیٹھی آیت کریمہ کا ورد کر رہی ہوگی اور رو رو کر مجھے خدا سے مانگ رہی ہوگی۔"

رضوان ان سب میں سب سے زیادہ شریف تھا مگر مردانہ خصلت سے مجبور تھا، سو موضوع میں اس کی دلچسپی فطری تھی۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ قرآنی آیت جس میں اللہ سبحان تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بے شک انسان شر کو بھی خیر کی طرح مانگتا ہے۔" میں تمہاری والی جیسے لوگوں کی طرف ہی اشارہ کیا گیا ہے۔"

آصف کو بھی بولنے کا موقع ملا تھا۔ رضوان کو موقع پر کبھی موزوں جواب نہیں سوجھتا تھا، سو وہ خاموشی سے سب کے ساتھ ہنسنے میں شامل رہا۔

"یار! میری والی کیا کر رہی ہوگی......کم بختو! میرے متعلق بھی تو سوچو۔" طلحہ شرمانے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔

"تیری والی کی لمبی زلفیں ہوں گی۔" زبیر نے آنکھیں گھمائیں۔ طلحہ کو لڑکیوں کے لمبے بال پسند تھے اور وہ اکثر کہتا تھا کہ وہ کسی لمبے بالوں والی لڑکی سے شادی کرے گا۔ زبیر کی بات سن کر طلحہ نے پوری بتیسی باہر نکالی تھی۔

"اور وہ اس وقت ان زلفوں سے موٹی موٹی جوئیں نکالنے میں مگن ہوگی۔" آصف نے زبیر کا ادھورا جملہ مکمل کیا تھا۔

"لعنت ہے بھئی!" طلحہ نے بدک کر کہا تھا۔ سب کا بلند و بانگ قہقہہ اُبلا تھا۔ ٹریفک کی زبان ہوتی ہے مگر کان نہیں ہوتے، سو شور مچاتی چنگھاڑتی ٹریفک پہ اس قہقہے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"یہ مرتضیٰ سے بھی تو پوچھو......" حبیب نے اتنا ہی کہا تھا کہ زبیر نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اس سے مت پوچھو......اس کی آج کل پانچوں گھی میں ہیں۔"

"اس نے پانچ کر بھی لیں اور مجھے ایک کے متعلق بھی نہیں بتایا۔ مجھے ہاسٹل میں کہا کرتا تھا کہ اسلام میں صرف چار جائز ہیں۔"

بات کو کہاں سے کہاں گھما لے جانا طلحہ کی عادت تھی۔ ایک بار پھر زبردست قہقہہ پڑا۔ وہ چلتے چلتے اب ایک رہائشی کالونی میں آگئے تھے۔ مین سڑک پیچھے رہ گئی تھی۔

"طلحہ سے کوئی بات مت کرو، اس کے بارہ بج گئے ہیں۔" مرتضیٰ نے جھینپ کر کہا تھا۔

"یہ سکھ ہے؟" زبیر نے مصنوعی حیرانی کو چہرے پر طاری کیا۔

"جی نہیں، سکھ نہیں، شکھ ہوں......اپنے والدین کا، بھائیوں کا، بہنوں کا اور اپنی گھر والی کا۔"

طلحہ نے خاموش رہنا نہیں سیکھا تھا۔

"خدا کا واسطہ طلحہ......گھر والی کے علاوہ بھی کسی موضوع پر بات کرلیا کر۔" آصف اسے شرمندہ کرنا چاہتا تھا۔

"یار! تجھے اپنی بھرجائی کی باتیں سننا اچھا نہیں لگتا؟" وہ اتنی معصومیت سے بولا تھا کہ خود آصف شرمندہ ہوگیا۔

"تیری جو حرکتیں ہیں نا، وہ تجھے شرمندہ ہی کروائیں گی۔ شادی نہیں کرواسکتیں۔"

آصف خجالت سے بولا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ وہ وسیع و عریض اسٹریٹ سے گزر رہے تھے، جس کی دونوں جانب خوبصورت اور وسیع و عریض گھر بنے ہوئے تھے۔ ہر گھر کے گیٹ پر بلب روشن تھے، سو ساری اسٹریٹ روشن مگر سنسان تھی۔ ان کی آوازیں اور بے فکری ہنسی خوب گونج رہی تھی۔

"مرتضیٰ! ہمیں اپنی اداکاری کا کوئی کمال ہی دکھا دے۔" زبیر نے فرمائش کی تھی۔ اسے ان کے ساتھ واپس ہاسٹل نہیں جانا تھا بلکہ اس کے چچا کے نواسے کا عقیقہ تھا۔ سو اسے اس تقریب کے اختتام تک وہاں بھی پہنچنا تھا۔ اس کی فرمائش پر مرتضیٰ نے چوں چراں کی تو سب اصرار کرنے لگے۔ وہ تیار ہوا تو نئی فرمائش کی گئی۔

"ایسا کرتے ہیں، ایک ڈرامہ کرتے ہیں۔ تم ایک لڑکی کا رول کرو جب کہ میں ایک اسمارٹ لڑکا بنتا ہوں۔"

"ہاں، اس میں مزہ آئے گا۔ یہ لڑکا تمہیں چھیڑے گا بلکہ ہم سب اس کارِ خیر میں حصہ لیں گے اور پھر تم ہم سے لڑائی کرو گے بلکہ کرو گی۔"

ہنسی ہنسی میں ہی پلاٹ تیار ہوا اور اداکاری شروع ہوگئی۔

مرتضیٰ ان سے دس بارہ قدم آگے تھا جب کہ وہ اس کے پیچھے سیٹیاں بجاتے آوازیں کستے آرہے تھے۔ مرتضیٰ کی چال بالکل بدل گئی تھی۔ وہ نزاکت سے ٹھمک ٹھمک کر چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے آنے والے نا صرف ہنس رہے تھے بلکہ مزے مزے

کے جملے بھی کس رہے تھے۔

''تمہارے گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں؟'' وہ یک دم مڑا تھا اور آواز بدل کر بولا تھا۔

''ہیں جی...... پہلے ہم سے تو بات کر لیں، ماں بہنیں بعد میں آئیں گی۔'' یہ طلحہ کے سوا کون ہو سکتا تھا۔

''میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی۔'' مرتضیٰ کی آواز پر بھی نسائیت غالب تھی۔

''گلے لگنا چاہتی ہو......؟ بسم اللہ...... بسم اللہ......'' طلحہ دونوں بازو وا کر کے آگے بڑھا تھا۔ سب پیچھے والوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ان کا قہقہہ اتنا زوردار تھا کہ کسی گھر کے آگے کھڑے چوکیدار نے زوردار وسل بجائی تھی۔ وہ سب ہنس رہے تھے مگر مرتضیٰ ابھی بھی سنجیدہ تھا۔

''تم جیسے ڈھیٹ انسانوں نے عورت کی زندگی کو اس قدر مشکل بنا دیا ہے کہ وہ مشکل وقت میں بھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔ تمہیں ہری ہری سوجھ رہی ہے اور وہاں میرا باپ دمے کی وجہ سے سانس لینے سے بھی لاچار ہے۔ تم اپنا شوق پورا کر لو...... جتنی مرضی آوازیں کسنی ہیں، کس لو...... جتنی سیٹیاں بجانی ہیں، بجا لو...... یہ سب تمہارا حق ہے کیونکہ اللہ نے تمہیں مرد بنایا ہے۔ تمہیں حق ہے کہ تم عورت کی جیسے چاہو تذلیل کرو۔ تمہارے اس شغل میں اگر ایک انسان مر بھی گیا تو کیا ہوا، آخر اس دنیا میں بہرحال سب کو مرنا ہے...... میرا باپ...... مر بھی گیا...... تو کیا...... مر جانے دو...... مر جانے دو۔ سب کو......''

اس کی آواز پر نمی غالب آئی تھی اور یک دم اس کی سسکیاں چاروں جانب گونجنے لگیں۔ مذاق ہی مذاق میں جو بات شروع ہوئی تھی، اس کا اختتام بے حد سنجیدہ تھا۔ مرتضیٰ نے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ لیے تھے جب کہ باقی چھ لڑکے ششدر اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

اچانک کہیں سے زوردار وسل سنائی دی پھر تالی بجانے کی آواز آئی تھی۔ مرتضیٰ نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے، لمحہ بھر قبل وہ سسکیاں بھر رہا تھا لیکن اب اس کی آنکھیں دور سے تو خشک ہی لگ رہی تھیں۔ تالیاں بجانے کی آواز تیز ہوئی تھی۔

''ہیلو...... اِدھر...... یہاں......'' تالیوں کے ساتھ کسی کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ زبیر نے سب سے پہلے اس طرف دیکھا تھا۔ وہ لوگ جہاں کھڑے تھے، اس والے گھر کے سیکنڈ فلور کے ٹیرس سے کوئی شخص ان کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ اس شخص نے ہاتھ ہلا کر انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔

مرتضیٰ حیران ہو کر ان سب کی جانب آ گیا۔

''کمینے! ہمیں پھنسوا نہ دینا۔'' حبیب نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔

''پھنس بھی گئے تو کیا...... کم از کم یہ تو پتا چلا کہ مرتضیٰ واقعی بہت زبردست اداکاری کرنے لگا ہے۔''

آصف نے گروپ میں سے سب سے پہلے اسے سراہا۔

''آج سے تم میرے استاد ہو۔'' طلحہ نے اس کے قریب ہو کر اس کا ہاتھ تھاما۔ کچھ منٹ گزرنے کے بعد وہ شخص گیٹ کھول کر ان کے قریب چلا آیا۔

''مارولس...... میں نے تمہیں وہاں سے دیکھا اور دیکھتا گیا۔'' اس نے ٹیرس کی جانب اشارہ کیا۔

''ایکچوئلی میں ٹیلی اسکوپ سے تم لوگوں کو بہت دیر سے واچ کر رہا تھا۔ مجھے تمہاری آواز تو واضح نہیں آ رہی تھی مگر دھیان لگانے سے کچھ ڈائیلاگز بہرحال سن پایا ہوں...... بہت متاثر کیا ہے تم نے مجھے...... کیا کرتے ہو...... کبھی ایکٹنگ

وغیرہ کے متعلق سوچا؟''

وہ واقعی بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں بے حد پسندیدگی تھی۔

''اچھا...... جی سی میں...... سوشیالوجی فائنل ایئر...... ہاشمی صاحب کو تو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں...... اچھا ٹھہرو...... میں ابھی آتا ہوں...... جانا مت۔'' وہ شخص اتنا کہہ کر دوبارہ گیٹ کے اندر گھس گیا۔

''اے تے مگر ای پے گیا اے۔'' (یہ تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے) رضوان نے سرگوشی کی تھی۔ چند منٹ بعد وہ دوبارہ واپس آ گیا۔

''یہ میرا کارڈ ہے...... مجھے فون کرنا...... میرا نام سید حسنین بخاری ہے...... میں ڈرامے ڈائریکٹ کرتا ہوں۔'' وہ اپنا کارڈ مرتضیٰ کی جانب بڑھا کر بولا تھا۔



وہی کمرہ، وہی فرنیچر، وہی خوشبو اور وہی احساس۔

وہ کمرے سے باہر بھی ان ہی چیزوں کے سحر میں جکڑا تھا۔ کمرے کے اندر آ کر تو اسے لگ رہا تھا، دیواریں بھی اسے لعن طعن کر رہی ہیں۔ اس کی ماں بیڈ پر لٹے پٹے انداز میں بیٹھی تھی۔

اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنی ماں کو مخاطب کر پاتا۔ بہت خاموشی سے وہ بیڈ کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ گود میں رکھ لیے اور یکا یک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ وہ بالکل ایسے بیٹھا تھا جیسے اس کا باپ بیٹھا کرتا تھا۔ اسے اپنے باپ کے انداز سے چڑ ہوتی تھی۔ ایسے جیسے انسان ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ جائے۔ اسے لگتا تھا، یہ سُستی ہے جب کہ آج اپنے باپ کے انداز میں بیٹھے ہوئے اسے احساس ہو رہا تھا کہ ہاتھ جھاڑ کر انسان سُستی میں ہی نہیں بلکہ مایوسی میں بھی بیٹھ سکتا ہے۔

اسے اس طرح بیٹھا دیکھ کر اس کی ماں کے چہرے پر دکھ کے رنگ گہرے ہوئے تھے۔ وہ پژمردگی سے اٹھیں اور دیوار گیر الماری کی جانب بڑھ گئیں۔ چند لمحوں بعد اس نے انہیں اپنی جانب آتا دیکھا، وہ اپنی ماں کو ہی تکتا رہا تھا لیکن جیسے ہی اس نے انہیں اپنی جانب آتا دیکھا تو نظریں چرا کر اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھنے لگا۔

اس کی ماں اس کے قریب چلی آئیں۔ انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے کیا تھا۔ وہ چند لمحے ان کے ہاتھوں کی جانب دیکھتا رہا پھر نا سمجھی کے انداز میں اس نے ان کے چہرے کی جانب دیکھا۔

''یہ میری انگوٹھی ہے...... ہزار پندرہ سو کی بک سکتی ہے...... اس سے زیادہ روپے میرے پاس نہیں ہیں...... اگر میرے پاس ہوتے تو میں تمہیں کچھ نہیں کہتی...... کبھی بھی نہیں...... وہ...... مرنے والا...... تمہارا باپ...... تھا...... وہ زندہ تھا تو تم نے...... کبھی انہیں ان کا حق نہیں دیا...... اب وہ نہیں رہے...... اب ان کا کوئی حق نہیں رہا تم پر...... مگر......''

وہ رونے لگی تھیں۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ اٹھ کر انہیں دلاسہ دیتا مگر شاید وہ دلاسہ دینے کا حق بھی کھو چکا تھا۔

''تم نے اسے ساری زندگی...... بہت...... ذلیل کروایا ہے...... تمہاری وجہ سے وہ...... بہت ذلت سے گزرا ہے۔ اس نے وہ کام بھی کیے جو وہ نہیں کرنا چاہتا تھا...... کبھی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا...... میں نے اسے راتوں کو اس ذلت کی وجہ سے آنسو بہاتے دیکھا ہے...... وہ شخص جو اپنے دکھ پر بھی حوصلے سے مسکراتا تھا...... وہ تمہاری وجہ سے بہت رویا ہے...... اب اس سے جان چھڑانے کے لیے ایک آخری مرحلہ باقی ہے...... اس ایک مرحلے کے بعد تمہاری واقعی اس سے جان چھوٹ جائے گی۔

اس کی تدفین باعزت طریقے سے کروادو...... باہر...... وہ سب لوگ جمع ہیں جو...... اس...... کی عزت...... کرتے رہے ہیں۔ ان کی نظر میں اس کی جو عزت ہے، اسے سلامت رکھنا...... اسے لاوارثوں کی طرح مت دفنانا...... ایک ماں اپنے بیٹے سے کبھی اپنی پرورش...... کی قیمت وصول نہیں کرتی۔ میں کرنا چاہتی ہوں۔''

اس نے ''میں'' پر زور دیا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

''میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں...... میرے شوہر کے ساتھ اب وہ سلوک مت کرو جو تم ساری زندگی کرتے رہے ہو...... ان کی تدفین...... اچھے طریقے سے ہونی چاہیے۔'' اب وہ رونے کے ساتھ اس کے آگے ہاتھ بھی جوڑ رہی تھیں۔ اس نے خود کو پہلے سے زیادہ بے بس محسوس کیا۔

''آپ مجھ سے ایسے مت کہیں۔ آپ پلیز ایسے مت کہیں۔ آپ اپنی رنگ اپنے پاس رکھیں۔ میں روپوں کا بندوبست کرلوں گا۔ وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ دراصل...... مجھے بالکل نہیں پتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے...... کہاں سے ابتداء کرنی چاہیے، کارپوریشن والوں کو فون کروں یا پہلے گورکن ڈھونڈنا چاہیے یا پھر کفن کے لیے فیبرک لانا چاہیے۔ مجھے کچھ بھی نہیں پتا...... مجھے واقعی کچھ نہیں پتا۔''

وہ لاچاری کے احساس میں گھر کر بہت روانی سے بول رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا، اگر وہ کسی مقام پر رک جائے گا تو اس کے پاس بولنے کے لیے الفاظ ختم ہو جائیں گے، وہ کل رات کے بعد سے اب اپنی ماں سے بات کر رہا تھا۔

''تم اپنے ماما سے بات کرو...... وہ تمہیں بتا دیں گے یا پھر اپنے تایا سے...... تمہارے بابا کی خواہش تھی کہ انہیں گاؤں میں دفن کیا جائے...... جہاں ان کے بزرگوں کی میتیں دفن ہیں...... وہ وہیں دفن ہونا چاہتے تھے...... تم ان کی آخری خواہش کو پورا کردو گے نا......؟''

انہوں نے ایک بار پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ اب کی بار وہ خود کو روک نہیں پایا تھا۔ اس نے ان کے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔ وہ کب سے اسی سہارے کی تلاش میں تھیں۔ اس کا دل چاہا، وہ انہیں گلے لگالے مگر انہوں نے اس کے اندازے کے برعکس اپنے ہاتھ اس سے چھڑوا لیے پھر وہ اس کی جانب دیکھے بغیر باہر چل دی تھیں۔

''میں نے ایسا کیا کردیا ہے جو یہ مجھ سے خفا ہیں۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔''

حالانکہ وہ دل ہی دل میں جانتا تھا، ہر غلطی کرنے والا کہیں نہ کہیں اپنی غلطی سے واقف ضرور ہوتا ہے مگر ہر شخص کا اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کا طریقہ مختلف ہوتا ہے وہ بھی اپنے آپ سے نگاہیں چرائے باہر کی جانب چل دیا تھا۔

''گاؤں لے جانا ہے تو پہلے بتانا تھا...... میں تو کب سے منتظر تھا مگر تم منہ سے کچھ پھوٹے ہی نہیں...... دس بجنے والے ہیں...... جلدی جلدی سارے کام نمٹانے پڑیں گے۔ مجھے پہلے ہی ٹیلی فون کردیتے تو میں وہاں رک جاتا مگر...... اس سے زیادہ اچھی بات کیا ہوسکتی ہے کہ ہم اس کو اپنے ہی گاؤں میں دفنائیں، کم ازکم انسان روزانہ جا کر فاتحہ تو پڑھ سکتا ہے نا۔ تیری ماں کدھر ہے۔ مجھے اس سے بات کرنے دے۔''

ماموں عنایت اللہ اس کی بات سن کر جھنجلا کر بولے۔

قصور ان کا نہیں تھا، تیزی سے چڑھتا ہوا سورج سب کے مزاج گرم کر رہا تھا۔ یہی ماموں پہلے کبھی اس سے اس لہجے میں بات نہیں کرتے تھے۔ باپ کی موت کا دکھ اپنی جگہ اور مزاج میں موجود رعونت اپنی جگہ۔

''میں اپنی ماں سے بات کر چکا ہوں...... وہ پہلے ہی بہت اپ سیٹ ہیں۔ آپ براہِ مہربانی انہیں مزید اپ سیٹ نہ

کیجیے۔ میں خود ہی سب سنبھال لوں گا...... تھینک یو سو مچ۔'' وہ ناک چڑھا کر اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

''اوئے پاگل! میری بات تو سنو...... ایسا تو کچھ نہیں۔'' وہ اس کے مزاج سے واقف تھے، اسی لیے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگے مگر اس سے پہلے ہی وہ دوبارہ سے اندرونی رہائشی حصے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

O......❖......O

سید حسنین بخاری سے ہونے والی اس اتفاقیہ ملاقات نے اس پر کامیابی کا ایک اور در کھول دیا۔ ان دنوں پی ٹی وی سے جمعرات کی رات کو ''تمثیل'' کے نام سے ایک ڈرامہ سیریز چل رہی تھی جس میں مختلف رائٹرز کے لکھے ہوئے لانگ پلے نشر ہوتے تھے۔ بخاری صاحب آج کل اسی ایک ڈرامہ کے سلسلے میں مصروف تھے۔ انہوں نے اگلے دن فون کرنے پر اسے ایک مختصر مگر اچھا کردار آفر کیا۔ اسے ایک دیہاتی شخص کا کردار ادا کرنا تھا جو قسمت کی مہربانی سے زندگی میں ایک مرتبہ ہوائی سفر کا مزہ چکھ لیتا ہے۔ سارے پلے کے دوران اسے اسی ہوائی سفر کی شیخیاں بگھارنی تھیں۔ وہ کالج کے دوران اس سے کہیں زیادہ بہتر کردار ادا کر چکا تھا مگر ٹی وی کے لیے کام کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا، اس لیے وہ اس پیشکش کو رد نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس نے کیا بھی نہیں۔ اسے اگلے ہی دن ریہرسلز کے لیے بلا لیا گیا۔

ایگزامز میں کچھ ہی دن باقی تھے۔ اس صورتِ حال میں ریہرسلز اور پھر آؤٹ ڈور شوٹنگ میں مصروف رہنا کسی بھی طرح مناسب اقدام نہیں تھا۔

''کامیابی بار بار ایک ہی دروازہ نہیں کھٹکھٹاتی'' کی شوگر کوٹڈ گولی نگل کر اس نے ہر چیز کو پس پشت ڈال کر بخاری صاحب کو ہاں کہہ دیا تھا۔ ہاسٹل میں سب ہی کتابوں سے کبڈی کھیلنے میں مصروف تھے، سو اس کی اس نئی سرگرمی کے متعلق کسی نے نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ سارا دن ریہرسلز میں مصروف رہنے کے بعد رات گئے واپس آتا اور تھک ہار کر سو جاتا۔ کہنے کو اس کا رول مختصر تھا مگر پھر بھی اپنے حصے کا کام مکمل کروانے میں اسے پچیس دن لگ گئے۔ ٹی وی پر کام کرنے سے اسے تھیٹر اور ٹی وی کے درمیان واضح فرق سے آگاہی ہوئی، اسے محسوس ہوا ٹی وی میں بے تحاشا داد نہیں ملتی کیونکہ اداکاری کے جوہر دکھانے کے بعد ڈرامہ کے ٹیلی کاسٹ ہونے تک لمبا انتظار کرنا پڑتا تھا لیکن اس میں شہرت زیادہ تھی اور پروفیشنل ازم تھا جو یقیناً ہر آرٹسٹک کام کی بنیاد تھا۔ بے شک اسے مزہ نہیں آیا تھا مگر سیکھنے کو بہت کچھ ملا تھا۔ پچیس دن کے بعد جب اس نے بخاری صاحب سے رخصت لی تو انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپا کر کہا تھا۔

''تم میں ٹیلنٹ ہے بچے...... اس کو ضائع مت کرنا۔''

بچہ پہلے ہی اس ٹیلنٹ کے بوجھ سے ادھ موا ہوا جا رہا تھا۔ بخاری صاحب سمیت اس کے سینئر ساتھی اداکاروں نے بھی اس کی کافی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس ڈرامہ میں کام کرنے کے معاوضے کے طور پر اسے پانچ سو روپے کا چیک ملا تھا۔ اب تک اس نے فقط ستائش کے لیے کام کیا تھا۔ ''معاوضہ'' اسے پہلی بار ملا تھا۔ کسی نہ کسی طرح ہی سہی مگر اس کا شوق اس کا پروفیشن بن گیا تھا۔

افسوس ناک بات یہ تھی کہ اسے ایگزامز نہ دینے کا پچھتاوا نہیں تھا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا تھا اور اس کا ایک شوق دوسرے شوق کو نگل گیا تھا۔ وہ گاؤں سے شہر اس کام کے لیے نہیں آیا تھا، بہرحال ابھی ایسا وقت نہیں آیا تھا کہ وہ پچھتاتا۔ اس کا خیال تھا، پچھتانے کے لیے ابھی لمبی عمر پڑی ہے۔ ایگزامز کا عرصہ ختم ہوا تو اسے ہاسٹل چھوڑنا پڑا اور پھر وہ سلانوالی واپس آگیا۔

گاؤں میں اس کا استقبال ایسے ہی ہوتا تھا جیسے گرمی میں ٹھنڈی ہوا کا، لیکن اب وہ لمبے عرصے کے لیے آیا تھا بلکہ اس کے گھر والوں کا خیال تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے آگیا ہے۔ سو کچھ دن کے بعد ہی اسے عام حیثیت مل گئی۔ ابا جی کو خوش کرنے کے لیے وہ بھی سب کام خوش اسلوبی سے نمٹاتا رہا۔ مرغیوں کو دانہ ڈالنے، بھینسوں کا دودھ دوہنے، ٹریکٹر پر بیٹھ کر ہل چلانے اور ابا جی کے حقے کی چلم بھرنے تک اس نے سب کام دوڑ دوڑ کر کیے مگر ہر گزرتا دن اس کی بیزاری میں اضافہ کر رہا تھا۔

اس روز وہ بھینسوں کا دودھ دھو کر بالٹیاں پکڑے گھر کی جانب آرہا تھا کہ سامنے سے ایک جانی پہچانی شخصیت آتی دکھائی دی۔ اس نے بہت حیرانی سے اس کی جانب دیکھا چہرہ وہی تھا مگر چال ڈھال، انداز سب بدل چکے تھے۔ وہ اچنبھے سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ پہلے تو پریشان ہوئی پھر ناک چڑھا کر اس کے انداز پر برا مانا۔

''کیسی ہو نسرین؟'' وہ ایک دم سے گڑبڑا کر بولا۔

''شکر الحمدللہ...... تم کیسے ہو...... یہیں رہنے کا ارادہ کرلیا ہے کیا؟'' وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

''نہیں...... ہاں...... شاید...... پتا نہیں......'' اب کی بار وہ مسکرایا تھا جب کہ وہ مسکرائی بھی نہیں تھی۔ مرتضیٰ کا دل چاہا، وہ اس کی ہنسی کو دیکھ پاتا، وہ آگے بڑھ گئی۔

''کیا اب بھی یہ ہنستی ہوئی اتنی ہی بری لگتی ہے، جتنی پہلے لگا کرتی تھی...... اوہو...... میں ایسے کیوں سوچ رہا ہوں...... میری طرف سے بھاڑ میں جائے...... نخرہ تو دیکھو...... دو منٹ کھڑی ہو کر بات بھی نہیں کرسکتی۔''

وہ بڑبڑاتے ہوئے گھر کی جانب چل دیا لیکن دل ہی دل میں اس کا یا پلٹ پر سخت حیران تھا۔ اسے حیرانی اس بات کی تھی کہ گاؤں میں ہی رہتے ہوئے وہ اس قدر تبدیل کیسے ہوگئی۔ رنگ روپ تو پہلے بھی اس کا اچھا ہی تھا مگر اب انداز اور رکھ رکھاؤ میں ایک وقار سا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ گھر آکر بھی اس پہیلی میں الجھا رہا جس کا جواب نسرین ہی تھا مگر اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

''خیر سے بارہ جماعتیں کرلی ہیں اس نے۔ سکول میں استانی لگ گئی ہے۔ سوہنی تو پہلے بھی بہت تھی، اب تو ماشاء اللہ بہت ہی سوہنی ہوگئی ہے۔''

اماں جی شاید اس کی نظر میں اچھا تاثر جمانے کے لیے کچھ زیادہ ہی تعریف کرگئی تھیں۔

''اب اتنا جھوٹ بھی نہ بولیں...... میں نے دیکھا تھا آج اسے...... سوہنی ووہنی تو کوئی نہیں ہوئی...... ہاں مگر ڈیسنٹ...... خیر جانے دیں...... آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔''

وہ ہمیشہ کی طرح ناک چڑھا کر بولا مگر دل ہی دل میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ نسرین جیسی لڑکی کا بارہ جماعتیں پاس کر لینا، اس کے لیے واقعی ایک بریکنگ نیوز تھی۔ اس کے بعد اماں جی کی اور اس کی اس متعلق کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ خود بھی...... اس قسم کا لڑکا نہیں تھا کہ زیادہ دیر اس متعلق سوچتا رہتا۔ وہ تو خواب میں بھی اکثر یہی دیکھتا تھا کہ ایک بڑا سا اسٹیج ہے جس پر وہ کبھی کوئی کردار ادا کر رہا ہے اور کبھی کوئی۔ اسے خواب میں بھی بے پناہ ستائش ملتی تھی جس کا نشہ اسے کچھ اور سوچنے ہی نہیں دیتا تھا۔

اس روز ایک عجیب بات ہوئی، مصطفیٰ بھائی کے سسرال میں فوتیدگی ہوگئی تھی، انہیں جانا پڑا۔ وہ اسے کہہ گئے تھے کہ ''آج کی رات ''مونجی'' کی فصل کو پانی لگانا ہے، یاد رکھنا۔'' مگر وہ نہ جانے کیسے بھول بھال گیا۔ ابا جی بھی مصطفیٰ بھائی کے ہمراہ گئے تھے۔ سو اسے یاد دلانے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اگلے روز جب مصطفیٰ بھائی آئے تو اس کی کوتاہی اور سستی پر اسے بے

نقط سنا ڈالیں۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی مگر نہ جانے کیسے بے وجہ ہی بڑھ گئی۔ وہ کمرے میں جا کر بند ہوگیا۔ اسے کچھ دنوں سے احساس ہو رہا تھا کہ مصطفیٰ بھائی جان بوجھ کر اسے نیچا دکھانے کا بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ان کے رویے میں تبدیلی تو بہت پہلے سے آچکی تھی مگر اب تو جیسے وہ مکمل طور پر بھابی کے رنگ میں رنگے جاچکے تھے۔

ڈانٹ سننے کے بعد جب اس کو رات کو پیاس لگی تو وہ پانی پینے کے لیے باہر صحن میں چلا آیا۔ بھائی کا کمرہ ساتھ ہی تھا، ان کے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے نہ جانے کیسے اس کے کانوں سے بھائی کی آواز ٹکرا گئی۔ بھائی اور بھابی اسی کے متعلق باتیں کر رہے تھے، سو مجبوراً اسے دروازے سے کان لگانے پڑے۔

''میں نے اس زمین پر جان واری ہے تو یہ آج اس قابل ہوا ہے کہ ہم پر شہر کی پڑھائی کا رعب ڈال سکے۔ ہر مہینے جتنے روپے پیسے اس نے چاہے اس کو بھجوائے ہیں، مڑ کر کبھی حساب نہیں لیا اس سے۔ سوچا تھا پڑھ لکھ جائے گا تو وہیں شہر میں کہیں کھپ جائے گا...... سولہ جماعتیں تھوڑی نہیں ہوتیں...... سولہ جماعتوں والے افسر بن کر گھومتے ہیں اور یہ ویلا نکما روٹیاں توڑنے کو یہاں آبیٹھا ہے۔ میں کیا ساری زندگی اس کا پیٹ بھرتا رہوں گا۔ مجھے اپنے بارے میں سوچنے کے قابل نہیں چھوڑا اس نے...... ابا جی اور اماں جی بھی اس کے لاڈ اٹھاتے نہیں تھکتے...... سارے خاندان میں اس کی واہ واہ ہوتی ہے...... کس کی وجہ سے؟ اوئے میری وجہ سے نا جس نے خون پسینہ ایک کر کے اپنی کمائیوں سے اس کو اس مقام تک پہنچایا ہے۔''

بھائی کی آواز میں شعلوں سے زیادہ تپش تھی۔ وہ بوجھل دل لیے وہاں سے ہٹ گیا اور پانی پیئے بغیر کمرے میں واپس آگیا۔

''ابا جی! میں شہر جارہا ہوں...... بہت دن ہوگئے...... کوئی نوکری وغیرہ تلاش کروں، آخر سولہ جماعتیں یہاں گاؤں میں وقت برباد کرنے کے لیے تو نہیں کیں میں نے۔''

اگلے ہی روز اس نے اپنا ضروری سامان باندھ لیا تھا۔ ابا جی تو حیران رہ گئے۔ شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کا بیٹا لہلہاتی زمینیں چھوڑ کر شہر جا کر رزق تلاش کرنے کے متعلق سوچ سکتا ہے۔ ابا جی اور اماں جی کو اس نے محبت سے سمجھا لیا تھا جب کہ مصطفیٰ بھائی کو کیسے سمجھائے، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کیونکہ ان کا اصرار سب سے زیادہ تھا۔ ان کی باتوں پر وہ بوجھل دل لیے مسکراتا رہا مگر ایک بار ارادہ کر کے توڑنا اسے پسند نہیں تھا، سو وہ شہر آگیا۔

○......❖......○

''تم کدھر چلے گئے تھے گدھے...... کوئی کنٹیکٹ نمبر تو چھوڑا ہوتا۔'' ہاشمی صاحب اس کو اپنے آفس میں دیکھ کر مخصوص انداز میں بولے۔ وہ تو اچانک بغیر کسی منصوبے بندی کے ان سے ملنے چلا آیا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ اس کا اتنا والہانہ استقبال کریں گے۔

''تم نے اپنا پلے دیکھا...... پرسوں حسنین کا فون آیا تھا...... بہت تعریف کر رہا تھا تمہاری...... کہہ رہا تھا، اس لڑکے نے بہت اعتماد سے پرفارم کیا...... لگ ہی نہیں رہا تھا کہ پہلی دفعہ اداکاری کر رہا ہے۔''

وہ اسے خوش دلی سے سراہتے رہے۔ جی سی میں آج کل کانووکیشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ انہوں نے اسے بھی ازراہ مہربانی ایک پاس عنایت کر دیا۔ اسے دو ماہ ہوگئے تھے لاہور آئے ہوئے اور اسے یہ نہیں پتا تھا کہ اس نے جس پلے میں کام کیا تھا، وہ کب کا نشر ہو چکا ہے۔ آج کل وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے فرنٹ ڈیسک پر استقبالیہ کلرک کے طور پر کام کر رہا تھا۔ ایک پرانے دوست کے ساتھ رہائش کا بھی عارضی انتظام ہوگیا تھا۔ وہ روپے کمانے کے لیے کبھی بھی بہت پُرعزم نہیں رہا تھا،

اس لیے اڑھائی ہزار ماہانہ کی نوکری جس میں دو سو روپے اسے فلیٹ کے ایک کمرے کے کرایہ کے طور پر دینے پڑتے تھے، اسے کافی اچھی لگ رہی تھی۔ ہاشمی صاحب سے ملاقات کے بعد وہ بہت دن تک ایک عجیب سی سرخوشی میں مبتلا رہا۔ اسے خوش کرنے کو یہ بات بھی کافی تھی کہ وہ ایک ٹیلنٹڈ آرٹسٹ ہے۔

اس روز ایک عجیب بات ہوئی، وہ ایک چیک آؤٹ کرنے والی فیملی کے بقیہ جات کا بل بنا رہا تھا۔ وہ فیملی جس میں ایک خاتون، ان کی دو بچیاں اور شاید بچیوں کا بھائی شامل تھے۔ وہ خاتون بغور اس کی جانب دیکھ رہی تھیں کیونکہ جب انہوں نے چیک ان کیا تھا تو استقبالیہ پر خاتون ریسپشنسٹ موجود تھیں۔ ان کا آج پہلی بار مرتضٰی سے واسطہ پڑا تھا۔

''آپ کو میں نے ٹی وی پر دیکھا ہے یا آپ کی شکل ایک اداکار سے بہت ملتی ہے۔''

وہ بغور اس کی جانب دیکھ کر بولی تھیں۔ اس کی جاب کی نوعیت ایسی تھی کہ اسے ہمہ وقت ایک پیشہ ورانہ مسکراہٹ کو چہرے پر سجانا پڑتا تھا۔ ان خاتون کی بات سن کر وہ لمحہ بھر کے لیے چونکا پھر اس کے چہرے پر موجود مسکراہٹ گہری ہوئی۔

'منی بیٹا! ادھر دیکھو۔ ہم نے ان کو ٹی وی پر دیکھا تھا نا، ایک لانگ پلے میں۔ ہے نا؟''

وہ بیٹی کو پکارنے کے ساتھ اس کی یقین دہانی بھی چاہ رہی تھیں۔

''یس مما...... یو آر رائٹ...... آپ بھولا ہونا...... بہت مزے کا ڈرامہ تھا آپ کا۔''

وہ بچی ماں کی پکار پر لپک کر آئی تھی۔ وہ سب اس کی تعریف کر رہے تھے اور وہ مسلسل شکریہ شکریہ کرنے میں مصروف تھا۔ ان کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک سرور کی کیفیت اس پر چھائی رہی۔

تعریف سننا بہت کم لوگوں کو برا لگتا ہے اور اسے تو وہ شخص برا لگنے لگتا تھا جو دل کھول کر تعریف نہیں کرتا تھا۔ تعریف و ستائش اس کی صلاحیتوں اور ارادوں کو مزید جلا بخش دیتی تھی۔ اس کی جاب ٹھیک چل رہی تھی مگر اس کا شوق اور صلاحیت کہیں دب کر رہ گئی تھی۔

اس کے کچھ دن بعد ہاشمی صاحب کے ذریعے حسنین بخاری نے اسے پیغام بھجوایا۔ ریڈیو کے کسی پنجابی پروگرام کی میزبانی کے لیے خالص پنجابی لہجے والا کوئی شخص درکار تھا۔ انہوں نے اسے ریڈیو کے دفتر پہنچ کر کسی شخص سے ملنے کے لیے کہا۔ اس نے کبھی ریڈیو نہیں کیا تھا۔ اسے کبھی اپنی آواز میں وہ کوالٹی محسوس نہیں ہوئی تھی جو کسی بھی اچھے اسپیکر کی آواز میں ہونی چاہیے لیکن چونکہ حسنین بخاری نے کہا تھا، اس لیے وہ نا چاہتے ہوئے بھی ریڈیو پر چلا آیا۔ ریڈیو پر کام کرنا اس کے لیے برا تجربہ ثابت ہوا۔ اس کی آواز کی پچ واقعی بہت معمولی تھی اور اتنے اچھے بولنے والوں میں وہ بہت نکما لگتا تھا مگر پھر بھی اس نے پنجابی کا وہ پروگرام کیا جس میں کسانوں کو موسم کے حساب سے کھیتی باڑی کے زریں اصول سکھائے جاتے تھے۔

یہ کام اس کے لیے بے موسم سبزی کے جیسا تھا مگر اس کام نے اس کے اندر موجود پروفیشنل ازم کی کمی کو پورا کر دیا۔ وہ ٹی وی اور تھیٹر کر چکا تھا۔ ریڈیو تیسرا میڈیم تھا جس کے اسرار و رموز وہ بے دلی سے ہی سہی مگر سیکھ رہا تھا۔ اس کام میں ایکٹنگ کا مارجن کم تھا لیکن کہیں نہ کہیں ایکٹنگ موجود ضرور تھی۔ اکثر اوقات کوئی زرعی ماہر وقت پر نہ پہنچ پاتا تو اسے خود ہی ''کسان'' نامی اس پروگرام میں میزبان و زرعی ماہر بننا پڑتا تھا۔

دوسروں کی آواز نکالنے کی خصوصیت یہاں اس کے کام آ رہی تھی۔ ان دنوں ٹی وی تیزی سے ترقی کر رہا تھا لیکن ریڈیو کی حالت بھی پتلی نہیں تھی۔ ریڈیو کے ساتھ اچھی فہم و فراست کے لوگ وابستہ تھے، اسی وجہ سے ریڈیو بھی سنا جاتا تھا۔ اس کے ہوٹل میں چونکہ یہ بات پتا تھی کہ وہ ایک آرٹسٹ ہے، سو اسے اس کے پروگرام کی ٹائمنگز میں آسانی سے چھٹی مل جایا کرتی

تھی۔ اس پروگرام کے اسے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ مل رہے تھے۔ اسے لگنے لگا تھا کہ اس کی تخلیقی صلاحیتیں ماند پڑ رہی ہیں مگر اپنے شوق کی تسکین کا کوئی ذریعہ یا حل اسے نہیں سوجھ رہا تھا۔ کسی سے جا کر کام کیسے مانگتے ہیں، یہ طریقہ اسے آتا نہیں تھا اور آ بھی جاتا تو وہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ خود کو اداکار سمجھتا تھا، بھکاری نہیں۔ خودداری اور عزت نفس اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

انہی دنوں جی سی میں اولڈ راوین کے ساتھ کوئی تقریب منائی جا رہی تھی۔ وہ چونکہ ایم اے ہی نہیں کر پایا تھا، اس لیے اسے انوائٹ کیے جانے کے امکانات کم تھے لیکن ہاشمی صاحب اسے ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔ سو اس نے بھی یہ تقریب اٹینڈ کی۔ وہاں بہت عرصہ بعد اس کی سعدی سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان دونوں کی خط و کتابت کم ضرور ہوئی تھی مگر ختم نہیں ہوئی تھی۔ اسے سعدی سے ملنا بہت اچھا لگا۔ اس نے سعدی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ فائنل ایئر کے ایگزامز نہیں دے پایا تھا۔ سعدی کو اگر یہ پتا چل جاتا تو اسے بے نقط سنانی تھیں وہ بہت مختصر وقت کے لیے آیا تھا۔ اسے تقریب کے اختتام سے پہلے واپس چلے جانا تھا، اسی لیے وہ ایک دوسرے کے ساتھ تفصیلی بات بھی نہ کر سکے۔ سعدی کے جانے کے بعد ہاشمی صاحب اسے کسی سے ملوانے لگے۔

''ارے بھئی ان سے ملو...... اجوکا کا نام سنا ہے کبھی؟'' وہ اپنے سامنے کھڑی پُر وقار سی خاتون کی جانب دیکھ کر کہہ رہے تھے۔ مرتضٰی نے اجوکا کا نام پہلے نہیں سنا تھا مگر وہ ان خاتون سے بخوبی واقف تھا بلکہ وہ پہلے نا صرف ان سے مل چکا تھا بلکہ بات بھی کر چکا تھا۔

''اجوکا ایک تھیٹر گروپ ہے اور ان کا ایک واضح نصب العین ہے۔''

ہاشمی صاحب تعارف میں تعریفی جملے شامل کر رہے تھے۔



اجوکا تھیٹر گروپ میں کام کرنا اس کے لیے ایک بے حد دلچسپ تجربہ ثابت ہوا۔ اس نے تھیٹر کے مزید اسرار و رموز سیکھے، تجربہ حاصل کیا اور ستائش پائی لیکن جو چیز حاصل نہ ہو سکی، وہ روپیہ تھا۔ اجوکا کے پلیٹ فارم تلے بہت سنجیدہ سوشل ایشوز پیش کیے جاتے تھے، اس لیے پبلک میں ابھی یہ اتنا مقبول نہیں تھا۔ واہ واہ سے دل و دماغ تو سیر ہو سکتے ہیں مگر پیٹ صرف روٹی سے بھرتا ہے، سو جلد ہی مرتضٰی ایک بار پھر پریشان رہنے لگا۔

اس کی وہی جاب چل رہی تھی مگر اب اس کی تنخواہ ڈیلی ویجز کی بنیاد پر ملنے لگی۔ تھیٹر کے شوق میں اسے ہفتے میں ایک آدھ بار چھٹی کرنی پڑ جاتی تھی جس کی وجہ سے اس کی تنخواہ کٹ جاتی تھی اور پھر تھیٹر میں اسے روپے تو خاک ملنے تھے، خود اس کے اپنے روپے چھوٹی موٹی چیزوں کی مد میں خرچ ہو جایا کرتے تھے۔ اس نے جو پلاٹ لے رکھا تھا، اس کی قسط بھی ہر ماہ جمع کروانی ہوتی تھی۔

اس روز وہ کسی ایکٹر سے اسی سلسلے میں بات کر رہا تھا کہ شاہد صاحب نے سن لیا۔ وہ ٹی وی کے اچھے اداکار تھے۔ ان کی والدہ بھی تھیٹر سے وابستہ رہی تھیں اور اب بھی ٹی وی کے لیے کام کر رہی تھیں۔ انہوں نے اسے اپنے پاس بلایا اور اس کا انٹرویو کرنے لگے۔ وہ انہیں جی سی کے زمانے سے جانتا تھا۔

''دیکھ بچہ! شوق اور پروفیشن کبھی ایک نہیں ہونا چاہیے کیونکہ شوق کا تعلق دل یا روح سے ہے جب کہ پروفیشن کا تعلق جسم اور پیٹ سے ہے۔ اگر تُو پیٹ بھرے گا تو دل خالی ہوگا اور اگر دل کی سنے گا تو بھوک سے مر جائے گا۔ تیرا پرابلم یہ ہے کہ

تجھ میں ٹیلنٹ ہے اور تجھے اس ٹیلنٹ کا احساس بھی ہے۔ اب یہ احساس تجھے سکون نہیں لینے دیتا...... مگر......''

وہ لمحہ بھر کے لیے رکے اور مخصوص انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

''تعلیم تیری کم ہے...... خاندان تیرا غریب ہے...... اگر تُو صرف یہ سوچ لے کہ میں اداکاری کروں گا اور میرے ابا مجھے من وسلویٰ فراہم کرتے رہیں گے تو یہ ناممکن سی بات ہے، اس لیے تماشے کو تماشا سمجھ، کوئی دھندا شروع کر اور کبھی کبھی دل کی تسکین کے لیے یہاں وہاں آتا رہا کر...... پڑا کچھ پلے کہ نہیں۔''

ان کی باتیں حقائق پر مبنی تھیں مگر اس کا منہ لٹک گیا۔ جاب بھی اسے آسانی سے نہیں ملی تھی۔ کافی خوار ہونے کے بعد وہ اس ہوٹل میں نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اسے اس قسم کی خواری سے بہت ڈر لگتا تھا۔

چند دن مزید اسی پریشانی میں گزر گئے۔ اس روز وہ ریڈیو اسٹیشن سے نکل کر سامنے کھوکھے سے سگریٹ لے رہا تھا کہ مکرم مل گیا۔

''یار! تُو اسموکنگ کرنے لگا ہے؟'' مکرم بھی ایک چھوٹا موٹا اداکار تھا جو کام حاصل کرنے کے لیے صلاحیت سے زیادہ چاپلوسی پر یقین رکھتا تھا۔

''ہاں'' اس کے سوال کا مرتضیٰ کے پاس یہی جواب تھا۔ حالانکہ وہ اپنی جیب میں سگریٹ صرف اس لیے رکھتا تھا کہ اس کا روم میٹ منتظر رہتا تھا کہ وہ اس کے لیے سگریٹ لائے گا۔

''ہور فیر کیویں چل رہی ہے۔ (اور پھر زندگی کیسی گزر رہی ہے؟)''

سگریٹ کے کش فٹافٹ لگاتے ہوئے اس نے بات برائے بات کی غرض سے پوچھا۔ مرتضیٰ اسے زیادہ منہ لگانے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا، سو اس نے ہاتھ اور منہ سے ''سب اچھا ہے۔'' کا اشارہ کیا۔

''اچھا میں چلتا ہوں...... مجھے آڈیشن کے لیے جانا ہے۔ یعقوب بابر صاحب آج کل اچھے لڑکوں کی تلاش میں ہیں۔''

مکرم کے منہ سے نہ جانے کیسے پھسل گیا۔ حالانکہ ٹی وی کے لوگ ایسی باتیں اتنی آسانی سے ایک دوسرے کو نہیں بتاتے تھے۔ مکرم تو اتنا کہہ کر اپنی راہ چلا گیا جب کہ مرتضیٰ سوچ میں پڑ گیا۔

''آڈیشن دینے میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔'' اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا تھا۔ یعقوب بابر پی ٹی وی کے پُرعزم اور حوصلہ مند نوجوان ڈائریکٹرز میں سے ایک تھا۔ مرتضیٰ نے آڈیشن دیا تھا اور اس کی قسمت اس آزمائش میں کامیاب ہوگئی تھی۔ یعقوب بابر نے مرتضیٰ کو اجوکا کے کسی ڈرامہ میں پرفارم کرتے دیکھا تھا، سو وہ اس کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔

یعقوب بابر کا یہ میگا سیریل مرتضیٰ کا ہی نہیں بلکہ پی ٹی وی لاہور مرکز کی تاریخ کا ایک یادگار سیریل ثابت ہوا تھا۔ اس سیریل میں بھی اس کا لیڈنگ رول نہیں تھا لیکن وہ سپورٹنگ رولز بھی خوشی سے ادا کرتا تھا اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ جیسا بھی کردار ادا کرتا تھا، اسے خوب پذیرائی ملتی تھی۔ اس سیریل کی کامیابی نے مرتضیٰ کے لیے بہت سے بند دروازے کھول دیئے تھے۔ اسے ٹی وی پر بکثرت کام ملنے لگا۔ اس نے گریجویشن کی بنیاد پر بینک میں جاب کے لیے اپلائی کر رکھا تھا لیکن شوٹنگ کی ڈیٹ کی وجہ سے وہ انٹرویو بھی نہ دے پایا۔ ہوٹل کی جاب ابھی بھی چل رہی تھی جب کہ ٹی وی پر بھی روپے مل ہی جاتے تھے۔ وہ تھیٹر کے لیے بھی کبھی کبھار وقت نکال ہی لیتا تھا۔ جس سے اس کے شوق کی تکمیل بھی ہو جاتی تھی۔

شہرت کس چڑیا کا نام ہے، یہ مرتضیٰ کو دراصل تب سمجھ میں آیا تھا جب کہیں آتے جاتے اسے لوگ پہچان لیتے اور اس

کے کسی کردار کا نام لے کر اسے بلاتے تو اسے بے حد خوشی ہوتی۔

اندر سے وہ واقعی ایک معصوم اور بے ضرر سا انسان تھا جو اپنے کام سے کام رکھتا تھا جسے الٹے سیدھے شوق بھی نہیں تھے۔ اس کی شہرت اور کام کا لوڈ ایک ساتھ بڑھ رہا تھا اور اس کے طرز معاشرت میں بھی تبدیلی آ رہی تھی۔ اسی دوران ابا جی گاؤں میں کافی بیمار پڑ گئے تو اسے گاؤں آنا پڑا۔ دو تین مہینے بعد وہ چکر تو لگا لیتا تھا اور اس نے مصطفیٰ بھائی کے ساتھ تعلقات بھی نہیں بگاڑے تھے۔ ابا جی کی طبیعت کچھ گری گری رہنے لگی تھی لیکن اس کو دیکھ کر وہ بہت محسوس کرنے لگتے تھے۔ گھر میں ٹی وی آ چکا تھا، سو اس کی کامیابی گھر والوں کے لیے کوئی نئی خبر نہیں تھی۔ اسے اس کی شہرت کی وجہ سے گاؤں میں بھی رعایتی مارکس ملا کرتے تھے۔

نسرین نے اب تک شادی نہیں کی تھی اور ابا جی مرتضیٰ سے اب شادی کے لیے کہنا چھوڑ چکے تھے۔ مرتضیٰ کو ابا جی سے بہت محبت تھی اور نسرین سے محبت تو نہیں تھی لیکن وہ اسے بری نہیں لگتی تھی۔ اتنی چکا چوند والی زندگی میں بھی اس کی زندگی میں کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ سو اباں جی کے ایک ہی بار دوبارہ کہنے پر اس نے نسرین سے شادی کے لیے ہامی بھر لی تھی۔ اس نے اس شادی کے لیے ایک شرط رکھی تھی۔

''ابا جی! میں نسرین سے تب ہی شادی کروں گا جب آپ میرے ساتھ شہر چل کر رہیں گے۔''



''یہی بہتر ہے۔'' تایا جی اس کی بات سن کر بھیگے لہجے میں بولے تھے۔

''میں خود تجھ سے یہی کہنا چاہ رہا تھا مگر......'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ یہ نہ کہہ سکے کہ تجھ سے اور تیرے نخروں سے ڈرتا تھا، اس لیے پہلے یہ بات نہیں کہی تھی۔

''سب سے پہلے میت کے لیے ٹھنڈی گاڑی کا انتظام کرو...... وہ جو لکڑی کا بکسا بناتے ہیں جس میں فوجیوں کی نعشیں بھیجی جاتی ہیں۔ ویسا بکسا بنواؤ...... اپنی گڈی ہو تو اب سفر اتنا لمبا نہیں رہا...... بس کے ذریعے جاؤ تو پھر مشکل ہوتی ہے...... دس بجے ہیں...... عشاء تک دفنا دیں گے...... ہائے میرا بھائی۔''

انہیں بات کرتے کرتے بھائی کی یاد آ گئی تھی۔ اس نے ان کی باتوں سے جو پہلا اندازہ لگایا تھا، وہ یہ کہ اسے میت لے جانے کے لیے ٹرانسپورٹ کا انتظام کرنا ہے اور اس کے لیے پیسے درکار تھے۔ پیسے کہاں سے اور کیسے آ جاتے ہیں، یہ اس کے سوچنے کی بات پہلے کبھی نہیں تھی۔ وہ بس اپنے باپ کے پاس پہنچ جاتا تھا اور دھونس سے ان سے رقم کا مطالبہ کر دیا کرتا تھا۔ اب نہ باپ رہا تھا اور نہ ہی فی الحال اس میں وہ دھونس تھی کہ کسی سے بھی جا کر یوں پیسوں کی بات کرنے لگتا، وہ اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ اس کے والٹ میں فقط پانچ سو روپے کا ایک نوٹ تھا۔ کل صبح ہی اس نے باپ سے پانچ ہزار روپے لیے تھے، جس میں سے صرف پانچ سو بچے تھے۔

''ان پانچ سو روپے سے تو سی این جی کا خرچا بھی پورا نہیں ہوگا۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا اور یہ پہلی مرتبہ تھا کہ اس نے پیسے کو خرچ کرنے سے پہلے کچھ سوچا تھا۔

وہ پانچ سو روپے کا نوٹ ہاتھ میں لیے کچھ دیر اسی طرح اپنے کمرے میں کھڑا رہا۔ اس نے باپ کے علاوہ کبھی کسی سے پیسے نہیں مانگے تھے جس طرح وہ اپنے باپ سے پیسے مانگتا تھا، اس طرح کسی اور سے تو نہیں مانگے جا سکتے تھے۔ وہ ذہن میں ان دوستوں کے نام دہرانے لگا جن سے وہ پیسے مانگ سکتا تھا۔

مکرم، طیب، علی نعمان...... اس نے سب سے پہلے طیب کو فون کیا تھا۔

''اوہ اٹس سیڈ...... یونو اٹس ریئلی سیڈ...... فادر کے بغیر زندگی بہت مشکل ہو جاتی ہے نا...... مگر یو ڈونٹ وری یار...... تم بہت اسٹرونگ ہو...... تم نے اپنے ڈیڈ کے بغیر سروائیو کرنا سیکھا ہوا ہے...... تمہیں کیا مشکل ہو سکتی ہے۔ تمہارے لیے پیسوں کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تمہارے ڈیڈ اتنا کماتے تھے۔ انہوں نے تمہارے لیے اتنا چھوڑ دیا ہے کہ تمہیں نیکسٹ کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔ غم جتنا بڑا ہو، بہر حال برداشت کرنا پڑتا ہے اور پھر صبر کرو یار...... مرنا تو سب کو ہے۔ آج وہ چلے گئے، کل ہماری باری ہے۔''

وہ اس کی پوری بات سنے بغیر شروع ہو گیا تھا۔ اسے پہلی مرتبہ طیب کی مادیت پرستی پر غصہ آیا۔ حالانکہ وہ خود بھی انتہا کا میٹیریلیسٹک...... واقع ہوا تھا۔

طیب کا انداز دیکھ کر اسے ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اس سے ادھار کے نام پر کچھ رقم مانگ سکتا۔ یہ وہی طیب تھا جسے وہ ہمیشہ قرض دے دیا کرتا تھا اور بھول جاتا تھا۔

''دوست ہی دوست کے کام نہ آیا تو دوستی کا فائدہ۔'' وہ اپنے باپ کے سامنے ہمیشہ کہا کرتا تھا، جب بھی وہ اسے لالچی دوستوں سے دور رہنے کا مشورہ دیتا تھا۔

اگلا فون اس نے علی کو کیا تھا۔ اسے ابھی تک یہ اطلاع نہیں ملی تھی، وہ ابھی تک سویا ہوا تھا۔ اس کی آواز پر نیند غالب تھی۔

''فادر کی ڈیتھ ہو گئی ہے...... رات تک تو بھلے چنگے تماشے کرتے پھر رہے تھے۔ یار! یہ بھی کوئی نیا تماشا تو نہیں ہے نا...... اچھا جنازہ کتنے بجے ہے......؟ میں بہت تھکا ہوا ہوں...... کوشش کروں گا کہ پہنچ جاؤں۔''

اس نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔ مکرم نے اسے سب سے زیادہ دکھ پہنچایا۔ اس کی بہن نے فون اٹھایا تھا اور چند لمحے بعد مکرم کی غصیلی آواز سنائی دی۔

''یار! تم نے لینڈ لائن پر کیوں فون کیا ہے...... سی ایل آئی پر تمہارا نمبر آرہا ہے۔ میرے پاپا پہلے ہی اس بات پر غصہ کرتے ہیں کہ میں تمہارے ساتھ کیوں گھومتا پھرتا ہوں۔ تمہارا نمبر انہوں نے دیکھ لیا تو ان کا پارہ ہائی ہو جائے گا...... وہ پہلے ہی مجھے ٹوکتے رہتے ہیں کہ تماش بینوں جیسے دوست کیوں بنا رکھے ہیں...... تم جانتے ہو نا وہ کس چیز سے الرجک ہیں...... تمہارے فادر کا سوشل اسٹیٹس ہی اتنا چیپ ہے...... آئی ایم سوری یار...... ابھی تم فون بند کر دو...... میں تمہیں جم میں شام کو ملتا ہوں۔''

مکرم پر اسے سب سے زیادہ بھروسا تھا۔ وہ خود کو بہت براڈ مائنڈڈ اور ماڈرن کہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ تمام انسان برابر ہیں اور کوئی امیر غریب نہیں ہوتا۔ وہ سب دوستوں میں برملا کہتا تھا۔

''یار! میرا باپ گدھا ہے جو کلاس ڈس کریمینیشن پر یقین رکھتا ہے۔ مجھے ایسی باتوں سے نفرت ہے۔''

اور یہی مکرم اب اسے اتنی حقارت سے دھتکار رہا تھا۔ اس نے آج تک اپنے ماں باپ یا رشتہ داروں کو اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ اس کے لیے اس کے دوست جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل تھے، اہم تھے لیکن ضرورت پڑنے پر یہی دوست اس کی مدد نہیں کر رہے تھے۔

اسے پہلی مرتبہ بہت کچھ محسوس ہو رہا تھا۔ آج کے دن اس کی زندگی میں اتنا کچھ پہلی مرتبہ ہو رہا تھا کہ اسے لگنے لگا تھا،

وہ اس دنیا میں پیدا ہی آج ہوا ہے۔ ابھی کچھ اور دوست بھی باقی تھے لیکن اس میں ہمت نہیں تھی کہ ان کی دوستی کو آزماتا۔ یعنی یہ طے ہوا کہ کبھی کبھی صرف وہ شخص مصیبت میں نہیں ہوتا جسے آزمایا جا رہا ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھی وہ شخص زیادہ مصیبت میں ہوتا ہے جو آزما رہا ہوتا ہے۔

''اب میں کیا کروں؟'' اس نے سُن ہوتے ذہن کے ساتھ سوچا تھا۔

O......❖......O

دوستوں سے مایوس ہو کر وہ اپنے کمرے میں آکر اپنی ویلیوایبلز کو چیک کرنے لگا۔ اس کا لگژری بیڈروم ہر طرح کی لگژریز سے آراستہ تھا۔ ٹی وی، کمپیوٹر، سپلٹ اے سی، روم ریفریجریٹر، بیش قیمت فرنیچر، ایرانی قالین ہر چیز ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ لیکن کیا وہ یہ سب چیزیں بیچ کر رقم حاصل کر سکتا تھا۔ اور وہ بھی اس صورتِ حال میں جب کہ اس کا باپ باہر اپنے آخری سفر کے آخری مراحل کے پورے ہو جانے کا منتظر تھا۔

ایک مرد ان حالات میں اپنے حواسوں کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔ خاص طور پر ایک بے حس مرد کو موت وغیرہ جیسی باتوں سے فرق نہیں پڑتا اور وہ تو ایسا مرد تھا کہ جسے مرنے والے سے نفرت کی حد تک الجھن رہی تھی۔ مگر پھر بھی تدفین اور اس کے مراحل اس کی ذمہ داری تھے۔ اس نے اپنی ساری زندگی بے حسی کے چولے میں مقید ہو کر گزاری تھی، لیکن یہ بے حسی و بیزاری صرف اس کے ماں باپ کے لیے تھی۔ گھر سے باہر والوں کے لیے وہ ایک ویل مینرڈ، ہینڈسم اور ماڈرن شخص تھا اور اب جب اس کا باپ اس دنیا کو چھوڑ چکا تھا، تو اسے دل ہی دل میں کہیں بے حسی کی برف پگھلتی لگ رہی تھی۔ اسے اپنے باپ کی بہت سی باتیں یاد آرہی تھیں۔ ان کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد اسے ان کی کمی محسوس ہونا شروع ہو گئی تھی۔ لیکن افسوس ناک بات یہ تھی کہ اسے روپوں کی کمی سے باپ کی کمی محسوس ہوئی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں سود و زیاں کے عمل میں مبتلا الماری میں نہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ جب دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ کمرے میں آتے ہوئے اکبر کو اشارہ کر کے آیا تھا۔ اکبر پانی کا جگ اور گلاس ہاتھ میں لیے مردوں والے حصے میں پانی پلا رہا تھا۔

''اکبر! ابا کی ڈائری کدھر ہے...... میں ان کا سارا حساب دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اکبر اس سے عمر میں دو تین سال بڑا تھا۔ وہ بہت چھوٹی عمر میں ان کے گھر آگیا تھا۔ وہ ان کے باپ کے کسی کزن کا بیٹا تھا اور پڑھائی کا شوق نہ رکھنے کے باعث لاہور آیا ہوا تھا کہ یہاں کوئی ہنر وغیرہ سیکھے گا، اس کا باپ اکبر کو بھتیجا جب کہ وہ اسے ہمیشہ ملازم سمجھتا تھا۔ اس کی نظر میں ہمیشہ اکبر کے لیے حقارت ہوتی تھی لیکن آج حالات مختلف تھے۔

اکبر چند لمحوں بعد وہ رجسٹرز لے آیا تھا جس میں دکان کا سب حساب کتاب درج ہوتا تھا۔

''اکبر! باہر اندازاً کتنے لوگ ہوں گے؟'' پہلی سطر پر نظر دوڑاتے ہوئے اس نے اکبر سے پوچھا تھا، اکبر اس کے ملائم لہجے پر حیران ہو رہا تھا۔

''دو تین سو تو ہوں گے جی، چاچا جی! ماشاء اللہ بہت نیک بندے تھے۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ بہت بڑا دل تھا ان کا۔ کئی گھروں کا چولہا ان کی وجہ سے جلتا تھا۔ جب سے کاروبار ٹھپ ہوا تھا تب سے اس بات کا بہت غم کرتے تھے کہ ان خاندانوں کا کیا ہوگا۔ جن کا مہینہ انہوں نے مقرر کر رکھا تھا۔ حالات کتنے خراب تھے مگر جتنا بن پڑتا تھا ان سب کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرتے تھے۔ تب ہی، باہر دیکھیں جمگھٹا لگا ہے۔ اپنے تو اپنے پرائے بھی ان کے لیے رو رہے

ہیں۔''

اکبر خود سب بتاتے ہوئے رو پڑا تھا۔ اس نے رجسٹر سے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے ساری زندگی اپنے باپ سے شکایتیں ہی رہی تھیں۔ اسے لگتا تھا، اس کے باپ اور سرکس کے جوکر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح سرکس میں جوکر اپنی حرکتوں سے لوگوں کا جم غفیر اکٹھا کر کے روپے ہتھیاتا ہے اسی طرح اس کے باپ کے گرد بھی لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ اور اس کا باپ ان کی جیبیں خالی کرواتا رہتا ہے۔ یہ عقدہ تو آج کھلا تھا کہ وہ جیبیں خالی کروانے والوں میں سے نہیں بلکہ بھرنے والوں میں سے تھا۔

''اکبر! اندازہ لگا کر بتاؤ کل کتنی رقم چاہیے ہوگی۔ سب انتظامات کرنے میں؟''

اس نے کبھی اکبر کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی کہ وہ اس سے قسم کے سوالات پوچھتا، لیکن آج تو صورتِ حال بے حد مختلف تھی۔

''چاچی کہہ رہی تھیں کہ گاؤں لے جائیں گے۔ اس میں بیس ہزار لگ جائیں گے۔ پھر گاؤں جا کر دیکھیں گے کہ کتنے لوگوں کی روٹی کرنی ہے۔ وہاں جا کر تو تایا جی سب سنبھال لیں گے۔ ابھی تو بیس ہزار کے قریب چاہئیں۔ ہمارے پاس بس پانچ ہی ہزار ہوں گے۔''

اس نے سب بتا دیا تھا۔ وہ کب سے دکان کا حساب کتاب کر رہا تھا۔ اندر کی صورتِ حال سے وہ سب سے زیادہ واقف تھا۔

''اکبر! بیس ہزار کہاں سے آئیں گے؟'' وہ بے حد پریشان ہو کر بولا۔ وہی اکبر جسے وہ کبھی مخاطب نہیں کرتا تھا، آج اس سے ہی وہ اپنائیت کا متقاضی تھا۔ اس کا دل چاہا اکبر الہ دین کے چراغ کی طرح اس کے سب مسائل کو ''جو حکم میرے آقا'' کہہ کر حل کر دے۔

''پرسوں میری کمیٹی نکلی ہے، پانچ ہزار کی۔ دو تین ہزار جمع کیے ہوئے ہیں میرے پاس تو یہی ہیں۔ ان سے سب کچھ ہو سکتا ہے تو آپ کر لو۔''

اکبر نے واقعی بہت اپنائیت سے کہا تھا۔ اسے کچھ عرصہ پہلے والا واقعہ یاد آ گیا۔ اسے دوستوں کو پارٹی دینی تھی اور تقریباً سات آٹھ ہزار درکار تھے۔ اس کے باپ نے اسے اکبر کے پاس جا کر یہ رقم لے لینے کے لیے کہا تھا۔

''وہ دو ٹکے کا ملازم...... میں کبھی اس کے پاس نہیں جاؤں گا...... یہ خیال آپ دل سے نکال دیں۔ آپ اسے فون کریں اور رقم منگوائیں اور پھر اپنے ہاتھوں سے مجھے دے دیں۔''

اس نے حقارت سے کہا تھا اور اب یہی اکبر اس کے لیے اپنی جمع پونجی لے آیا تھا۔

شرمندگی اور تاسف نے ایک ساتھ اس پر حملہ کر دیا۔ پردہ کتنا ہی بھاری کیوں نہ ہو، ایک دن اٹھ کر اسے بھید کو عیاں کرنا ہی ہوتا ہے اور کچھ چیزیں فقط بھید لگتی ہیں مگر ہوتی نہیں ہیں۔ وہ سب باتیں جو آج اسے پتا چل رہی تھیں یہ سب تو اس کے ماں باپ وقتاً فوقتاً اسے بتاتے رہتے تھے اور وہ انہیں ''بکواس'' کہہ کر سر جھٹک دیتا۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر رہی تھیں۔ لیکن جیب ابھی بھی خالی تھی۔

''آپ پریشان نہ ہوں، میں باہر کے انتظامات دیکھتا ہوں۔ اس ڈائری کے آخر میں کچھ فون نمبر لکھے ہوئے ہیں۔ چاچا جی کے کاروباری دوستوں کے نمبر ہیں۔ اس میں آپ طاہر ملک کو فون کر لیں۔ ایک وہی شخص ہے جو فوراً پیسے دے سکتا

ہے باقی تو ٹال مٹول کرنے لگیں گے۔ انسان دل کا سیٹھ ہو تو پھر اس کا بٹوہ موت بھی نہیں کھول سکتی۔ طاہر ملک کے علاوہ سب کے سب دل کے سیٹھ ہیں۔''

اکبر نے اسے ایک ڈائری تھما دی تھی۔ اس نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ باقی سب دل کے سیٹھ ہیں جب کہ طاہر ملک دماغ کا سیٹھ ہے۔ کیونکہ یہ بات اسے خود بھی نہیں پتا تھی۔



''ارتضٰی! کی فیس جمع کروا دی تھی؟'' چائے کے بھاپ اڑاتے کپ کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے اس نے نسرین کے شگفتہ و تر و تازہ چہرے کی جانب دیکھ کر پوچھا تھا۔

''ایسی باتوں کے لیے پریشان مت ہوا کریں، آپ جو کام مجھے کہہ دیتے ہیں...... وہ کبھی لیٹ نہیں ہوتا...... تاخیر آپ کی عادت ہے...... میں تو بجلی اور گیس کے بل بھی جس روز آتے ہیں، اس سے اگلے روز جمع کروا دیتی ہوں۔''

وہ اپنی ازلی مسکراہٹ کا سہارا لے کر بولی تھی۔ گزشتہ سات سالوں سے زندگی کی شاہراہ پر وہ چل کر نہیں بلکہ دوڑ دوڑ کر مرتضٰی کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ پُر اعتماد تھی لیکن مرتضٰی کے ساتھ اور شہری زندگی نے اسے بے پناہ پالشڈ کر دیا تھا۔ مرتضٰی اپنی نصف بہتر کے لیے قدرت اور ابا جی کا ایک ساتھ مشکور ہوتا تھا کہ جن کی بدولت اسے اتنی اچھی شریکِ حیات ملی تھی۔ اس کی شادی کو سات سال کا عرصہ ہو چلا تھا اور ان سات سالوں میں اس کی زندگی پہلے سے کہیں زیادہ آسودہ ہو چکی تھی۔ ابا جی نے زمینوں کا بٹوارہ کر دیا تھا۔ اپنے حصے کی زمین اس نے مصطفٰی بھائی کے ہاتھ بیچ دی تھی اور ملنے والی رقم سے اس نے گھر کی تعمیر مکمل کی تھی۔ تین کمرے اور کچن تو وہ شادی کے بعد بنوا چکا تھا لیکن باقی کا کام اس نے اسی رقم سے پورا کیا تھا۔ اوپر والا پورشن ابھی بھی نامکمل تھا لیکن فی الحال اسے اس حصے کی ضرورت نہیں تھی۔

شادی کے بعد ہی اس کے لیے پی ٹی وی لاہور مرکز گھر جیسا ہو گیا تھا۔ ایک تو ڈرامے بہت کثرت سے بننے لگے تھے پھر ہر ڈرامے میں باپ، بھائی، داماد یا دوست جیسے سپورٹنگ رولز بہت ہوتے تھے جن کی وجہ سے اس کی خوش بختی عروج پر تھی۔ وہ ان ساری باتوں کا کریڈٹ نسرین کو دیتا تھا جس نے اس کی زندگی کے دھارے کو پُر سکون کر دیا تھا۔

ابا جی اور اماں جی اسی کے ساتھ رہتے تھے لیکن گاؤں سے ناتا پرانا تھا سو جلدی اداس ہو جاتے اور بڑے بیٹے کے پاس بھاگ جاتے، جہاں ان کے اپنے بہن بھائی بھی آباد تھے۔ خصوصاً ان کے بھائی جن کی ابا جی سے خوب بنتی تھی، اللہ نے شادی کے تین سال بعد اولاد کی نعمت سے نواز دیا تھا۔ ارتضٰی بھٹی میں اس کی جان تھی، اس کا بیٹا تھا بھی اس قابل۔ ابھی صرف چار سال کا تھا مگر بے حد ذہین اور شرارتی۔ یعنی زندگی کے بینک میں اس کا بینک بیلنس تا حال اچھا رہا تھا۔

''بھٹی صاحب! آپ کا فون ہے۔'' وہ نسرین کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ارتضٰی نے اپنے توتلے لہجے میں اطلاع دی۔ ٹی وی کے لوگوں میں وہ ''بھٹی صاحب'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔

''ادھر آؤ بھٹی صاحب کے کچھ لگتے...... کتنا سمجھایا تھا آپ کو...... بابا کو نام سے نہیں پکارتے...... بری بات ہوتی ہے۔''

نسرین اسے جھڑکنے لگی تھی، مرتضٰی مسکراتا ہوا فون کی جانب بڑھ گیا۔ ماں بیٹے کے معاملات میں وہ کم ہی دخل دیتا تھا۔

''فون والے انکل نے یہی کہا تھا۔ میں تو بابا کو بابا ہی کہتا ہوں۔''

وہ منہ بسورتے ہوئے ماں کی گود میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فی الحال وہ نزدیکی انگلش میڈیم سکول میں پڑھ رہا تھا لیکن مرتضٰی کا ارادہ تھا کہ اسے ایچی سن میں داخل کروا دے گا۔ جی سی میں اس نے بہت سی امپریسو شخصیات کو اسی سکول سے وابستہ ہونے کی وجہ سے انتظامیہ کی جانب سے اسپیشل پروٹوکول کا مستحق پایا تھا سو اس کا ارادہ تھا کہ اپنے بیٹے کو بھی ایچی سن ہی بھیجے گا۔ وہاں ایڈمیشن ہو رہے تھے اسی سلسلے میں کسی کا فون تھا۔

''کل نو بجے تیار رہنا...... ٹیسٹ اور انٹرویو ہوگا۔'' فون سن کر وہ نسرین کو تاکید کرنا نہیں بھولا تھا۔ اسے ارتضٰی کی ذہانت پہ یقین تھا لیکن وہاں پہنچ کر مسئلہ اس کی اپنی ذہانت کا آ گیا تھا۔ ارتضٰی سے پہلے اسے خود انٹرویو دینا پڑا تھا۔

''مرتضٰی صاحب! یہ ہماری پالیسی کے خلاف ہے۔ یہاں ہائی جینٹری اپنے بچے بھیجتی ہے۔ کیونکہ سب جانتے ہیں ایچی سن کا معیار کیا ہے یہاں کیسے گھرانوں کے بچے پڑھتے ہیں، آج کل سب لوگ اپنے بچوں کے حوالے سے بہت کانشس ہو گئے ہیں۔ ایک نوٹنکی والے کے بیٹے کو ایڈمیشن دینے کا مطلب سمجھتے ہیں نا۔ آپ...... یہاں ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ لوگ بار بار آ کر مطالبہ کریں گے، اس لیے ہماری جانب سے معذرت قبول فرمائیں۔'' کلیریکل آفس میں بیٹھے ایک شخص نے بہت تحمل سے اسے ساری بات سمجھائی تھی۔ یہ ان کی مہربانی تھی کہ وہ اسے اتنا کچھ بتا رہے تھے۔ جب کہ پرنسپل آفس سے تو اسے اتنا کہہ کر لوٹا دیا گیا تھا کہ آپ کا بچہ انٹرویو ہی کلیئر نہیں کر سکا، فارمل ٹیسٹ میں کیا کرے گا۔'' اس نے بہت مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا۔

''اونہہ...... یہی ایک سکول نہیں ہے۔ میں اپنے بیٹے کو کسی اور اس سے زیادہ اچھے سکول میں داخل کروا دوں گا۔''

وہ نخوت سے اتنا کہہ کر پلٹ آیا تھا۔ قرعہ فال بیکن ہاؤس کے نام نکلا تھا۔ وہاں اس کے بہت سے کولیگز کے بچے بھی پڑھ رہے تھے۔ سو ارتضٰی بھی وہیں جانے لگا۔ مگر اس بات نے مرتضٰی کو بہت دن تک عجیب سے ملال میں گھیرے رکھا۔ اس کے ملال کو دیکھ کر اسی کے جیسے بیک گراؤنڈ والے کسی کولیگ نے اسے سمجھایا تھا۔

''یار! یہ تو بہت عام سی بات ہے۔ تم مجھ سے مشورہ کرتے تو میں تمہیں وہاں جانے ہی نہ دیتا یہ ان کی پالیسی نہیں ہے۔ تعصب ہے۔ تم اکیلے نوٹنکی والے نہیں ہو۔ یہ جو بڑے بڑے رائٹرز اور پوئٹس کے بچے اس فیلڈ میں آ گئے ہیں تو کیا یہ نوٹنکی والے نہیں ہیں مگر ان کے بچے تو اسی سکول میں پڑھ رہے ہیں اور ان لوگوں کو وہاں سے خارج کروانے کے لیے کوئی مطالبہ نہیں کرتا۔ یار جو چیز واقعی اہمیت رکھتی ہے وہ بیک گراؤنڈ ہے۔ تم دیہاتی ہو مگر کوئی پوچھے ایچی سن میں دیہاتیوں کی اولادیں نہیں پڑھتیں۔ وہ سب لوگ جو انگریزوں کے زمانوں میں مربعوں پہ مربعے پا رہے تھے وہ خود کو بہت فخر سے رورل (Rural) بیک گراؤنڈ کا ظاہر کرتے ہیں۔ ایچی سن میں کثیر تعداد میں رورل بیک گراؤنڈ کے حامل بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ کہنے کو ایک بیک گراؤنڈ بن گیا نا۔ رورل بیک گراؤنڈ، مگر تمہارا رورل بیک گراؤنڈ فقط ایک مربعہ پر مشتمل تھا اور یہاں ہزاروں مربعوں والے لوگ کھاتے کھولے بیٹھے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں خوامخواہ اپنے بچوں کو بھیج کر احساس کمتری میں مبتلا کرنے کا فائدہ۔ ہمارے بچے وہ غلطیاں کیوں کریں جو ہم نے کی تھیں۔''

اسے اتنے مفصل اور اچھے انداز میں سمجھایا گیا اور وہ واقعی سمجھ بھی گیا۔

''یہ جوگرز بالکل بھی اچھے نہیں ہیں۔'' ارتضٰی نے ڈبہ دیکھتے ہی ناپسندیدگی سے ناک چڑھائی تھی۔ حالانکہ ابھی اس نے جوگرز دیکھے بھی نہیں تھے۔

''آپ پہن کر تو دیکھو بیٹا! یہ بہت اچھے ہیں۔'' مرتضٰی نے اسے پچکار کر کہا جب کہ اس کا منہ لٹک گیا تھا۔ وہ بہت دن

سے نئے جوگرز کے لیے ضد کر رہا تھا۔ مرتضٰی کا مارکیٹ چکر لگا تو وہ اس کے لیے جوگرز لے آیا۔ اچھے بھلے سروس کے بلیک اینڈ وائٹ جوگرز تھے لیکن ارتضٰی کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ وہ نو سال کا ہو چکا تھا اور اپنے والدین کے لیے ابھی بھی اکلوتا ہی تھا۔ اس کی طبیعت میں ضد کا بہت عمل دخل تھا۔ مرتضٰی کے لاڈ پیار نے اسے خودسر بنا دیا تھا۔ ظاہری شخصیت میں وہ باپ کے بالکل برعکس تھا۔ اتنی سی عمر میں بھی وہ انتہا سے زیادہ برانڈ کانشس تھا۔ اسے چھوٹی موٹی چیزیں پسند نہیں آتی تھیں۔ سروس شوز کا ڈبہ دیکھ کر اس کا منہ بن گیا تھا۔

''مجھے Adidas کے جاگرز چاہیے تھے۔ یہ چار سو روپے کے جاگرز میں نہیں پہنوں گا۔ آپ کو پتا بھی ہے کہ میرے پاؤں اور ڈنری برانڈز کے فٹ ویئرز میں خراب ہو جاتے ہیں۔''

مرتضٰی نے حیرانی سے اس کی جانب دیکھا۔

''اب میں انہیں واپس نہیں کر سکتا۔ میں انہیں خرید چکا ہوں، اس لیے اب تم انہیں رکھ لو۔ چند دن بعد جب یہ جاگرز پرانے ہو جائیں گے تو میں تمہیں نئے Adidas کے جاگرز دلوا دوں گا۔'' وہ اسے پچکار رہا تھا۔

''نہیں...... میں انہیں نہیں رکھ سکتا۔ میں کہہ چکا ہوں مجھے یہ جاگرز نہیں چاہئیں۔'' وہ قطعیت سے کہہ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ مرتضٰی نے پاس کھڑی نسرین کی جانب دیکھا۔ اسے بچے کی فرمائش پوری نہ کرنے کا دکھ تھا۔ نسرین اس کے قریب چلی آئی پھر اس کے قریب سے گزر کر پیچھے کھڑی ہوئی اور اس کے کندھوں کو دھیرے دھیرے سہلانے لگی۔

''آپ اس کی فکر نہ کریں بچہ ہے...... ابھی جب کھیلنے کے لیے باہر جائے گا تو دیکھئے گا یہی جاگرز پہن کر چلا جائے گا۔ آپ شاور لے لیں، میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔'' وہ بہت محبت سے اپنے نرم ہاتھ اس کے کندھوں پر پھیر رہی تھی جیسے اس کی تھکن دور کرنے کے لیے ساتھ ساتھ ارتضٰی کی باتوں کا اثر زائل کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''وہ ناراض ہو گیا ہے۔ ایک ہی تو بیٹا ہے میرا۔ میں اسے اس کی پسند کے جاگرز نہیں دلوا سکتا کیا۔ تم بلاؤ اسے...... میں اسے ابھی مارکیٹ لے چلتا ہوں۔''

پوری رات اور ساری دوپہر شوٹنگ کروا کر لوٹنے کے بعد بھی وہ بیٹے کا بجھا چہرہ روشن کرنے کی تدبیر کر رہا تھا۔

''آپ پہلے ہی میری بات مان لیا کریں...... آپ جانتے ہیں، میں غلط بات نہیں کرتا۔'' Adidas کے جاگرز خرید کر وہ بے تاثر لہجے میں بولا تھا جب کہ اس کا یہ نوابی انداز مرتضٰی کو مسکرانے پر مجبور کر گیا۔ اسے بیٹے کی فرمائش پوری کرنا اچھا لگتا تھا۔

وقت کچھ اور آگے سرک آیا تھا اور زندگی کا چہرہ مزید کھل کر سامنے آ چکا تھا۔ وہ ایک آسودہ زندگی گزار رہا تھا۔ اسے زندگی کی بازی میں اپنے کارڈز ذہانت سے استعمال کرنے آ گئے تھے تب ہی کسی تشنگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا تو پھر وہ بیٹے کو خواہشات کے معاملے میں تشنہ کیوں رکھتا۔

انہی دنوں سیاسی اتار چڑھاؤ تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ اچانک منتخب حکومت ختم ہو گئی۔ گزشتہ حکومت کے وفاداروں کو دھڑا دھڑ نوکریوں سے برخاست کیا جانے لگا۔ مرتضٰی ہوٹل کی نوکری چھوڑ کر صرف پی ٹی وی کا ہو کر رہ گیا تھا اور یہاں بھی اس کی وفاداری نیوٹرل تھی، لیکن وہ حسنین بخاری کے ساتھ جا کر اٹھتا بیٹھتا تھا، جو برخاست حکومت کے حامی تھے سو اس کے لیے بھی پی ٹی وی کے دروازے بند ہو گئے اور اس قدر زوردار آواز کے ساتھ بند ہوئے کہ وہ ہل کر رہ گیا۔ انسان جتنا مرضی قابل ہو، لیکن جب کسی ایک کام کے ساتھ بندھ کر رہ جاتا ہے تو پھر وہ اسی کام کا ہو جاتا ہے۔ مرتضٰی کو تو یاد بھی نہیں تھا

کہ وہ اداکاری کے علاوہ کچھ کرسکتا ہے۔ اس کی روزی روٹی اداکاری ہی تھی سو اسے ایک بار پھر تھیٹر کا رخ کرنا پڑا لیکن اب کی بار وہ کمرشل تھیٹر کی جانب آ گیا تھا۔ یہ پروفیشنل قسم کا تھیٹر تھا اور اس میں معاوضہ بہرحال مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی دو دکانیں تھیں جہاں سے کرایہ آ جاتا تھا۔ مصطفیٰ بھائی کی جانب سے گندم، چاول اور سبزیاں وغیرہ ملتی رہتی تھیں۔ سو معاشی مسائل کا اسے سامنا نہیں تھا۔



''تھیٹر کیا چیز ہے؟''

اس لفظ کی کوئی حتمی وضاحت نہیں دی جا سکتی۔ یہ کس سن میں وجود میں آیا اس بارے میں بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ تھیٹر ڈرامہ سے کہیں پہلے وجود میں آیا تھا۔ جب یہ دونوں اکٹھے ہوئے تو ڈرامہ تھیٹر یا تھیٹریکل ڈرامہ کہلائے۔

کہتے ہیں اس کی ابتداء یونانیوں کی تھی۔ یونانیوں نے جب اپنا قیمتی ورثہ یورپ کو منتقل کیا تو تھیٹر بھی کشاں کشاں یورپ چلا آیا اور جب انگریز بہادر نے برصغیر میں قدم رکھا تو ہندوستانی پہلی مرتبہ اس آرٹ سے متعارف ہوئے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب مسلمان برصغیر میں آئے تو تھیٹر سے ملتی جلتی کچھ چیزیں پہلے ہی یہاں موجود تھیں۔

بٹوارے کے وقت جو چیزیں ہمارے خطے کو خود بخود مل گئیں تھیٹر یا تھیٹریکل روایات ان ہی چیزوں میں شامل ہیں۔

یہاں بھی تھیٹر کا مقصد عوامی تفریح کے نئے ذرائع پیدا کرنا تھا۔ ابتدائی تھیٹر واقعی ان روایات کو پورا کرنے اور اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب رہا۔ ہمارے خطے کے بہت اچھے اداکار رولکھاری اس تھیٹر کے ساتھ وابستہ رہے اور بطریق احسن اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے رہے۔

ٹی وی کے آ جانے سے بھی تھیٹر انڈسٹری پہ زوال نہیں آیا تھا۔ وسیع ذہنی کینوس کے حامل لوگ بہت شوق سے اس تفریحی ذرائع کا استعمال کرتے رہے پھر یکا یک نہ جانے کیسے ہمارے خطے میں تھیٹر انڈسٹری کا زوال شروع ہوا۔ تھیٹر دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک کمرشل تھیٹر اور ایک نان کمرشل تھیٹر۔

غلام مرتضیٰ بھٹی نے جب کمرشل تھیٹر جوائن کیا تو حالت دگرگوں نہیں تھی لیکن قریب قریب کافی ذہنی پسماندگی اور گھٹیا پن اس مثبت تفریحی ذرائع میں شامل ہونے لگا تھا۔

ان دنوں ٹی وی پر عوام میں ایڈز کے متعلق آگہی پیدا کرنے کے لیے ایک ڈیڑھ منٹ کا ایڈ چل تو رہا تھا لیکن اس میں بات بہت ڈھک چھپ کر بیان کی جاتی تھی۔ جب کہ اسے جو اسکرپٹ دیا گیا تھا اس میں پھکڑپن کی انتہا ہو گئی تھی۔ جا بجا ایسے جملے تھے جو کسی بھی طرح سے شائستگی کے زمرے میں نہیں آتے تھے۔ وہ گرین روم سے کاغذ ہاتھ میں پکڑے اسٹیج کی جانب آ گیا۔ عرفان رحیم لائٹنگ کے ارینج منٹ کو چیک کر رہا تھا۔ وہ سیدھا اسی کے پاس چلا آیا۔

''یہ کیا بے ہودہ بکواس تھما دی تم نے ہمیں۔'' وہ اسکرپٹ والے پیپرز اس کے چہرے کے سامنے لہرا کر بولا۔ عرفان رحیم نے حیرانی سے اس کے عمل کو دیکھا۔

''بھٹی صاحب! اسکرپٹ تب ہی ایکٹرز تک پہنچتا ہے۔ جب اپروو ہو جاتا ہے۔ مجھے پروڈیوسر نے یہی اسکرپٹ دیا ہے اور میں نے بھی ایکٹرز کو یہی دینا تھا۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔

''یہ اسکرپٹ نہیں ہے۔ یہ تو نری واہیاتی ہے۔ اس میں کئی جملے ایسے ہیں جو میں اپنی بیوی کے سامنے با آواز بلند نہیں

ادا کر سکتا تو کسی اور خاتون کے سامنے کیسے ادا کروں گا۔ وہاں ہال میں کئی خواتین ہوں گی جو اپنے عزیز واقارب کے ہمراہ آئیں گی۔ ایسی صورتِ حال میں یہ چیپ ڈائیلاگز انہیں ہی نہیں ہمیں بھی ہماری نظر میں شرمندہ کروا دیں گے۔''

مرتضیٰ کا انداز قطعیت بھرا تھا۔

''آپ پروڈیوسر صاحب سے مل لیں تو بہتر ہوگا۔'' عرفان رحیم نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تھا۔

''بھٹی صاحب! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ...... مزید آٹھ نو سال گزریں گے تو ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو جائیں گے۔ اس اکیسویں صدی کے تقاضے ہوں گے یہ سب۔ آپ کا کیا خیال ہے یہ سب باتیں جو اسکرپٹ میں لکھی ہیں غیر ضروری ہیں، نہیں معاشرے کا اتنا بڑا ناسور ہے۔ یہ بیماری...... اس کے متعلق لوگوں کو بتانا ہی ہوگا۔''

طاہر ملک نے اس کی بات کو سن کر بہت تحمل سے کہا اور پھر اپنے باہر کو ابلتے ہوئے پیٹ کو سہلانے لگا تھا۔

''احترام اور حیا بھی کوئی چیز ہوتی ہے ملک صاحب...... جس چیز کا آپ ذکر کر رہے ہیں، وہ تو ایک بے حد سنجیدہ سی بات ہے جب کہ آپ نے اس بات کو انتہائی گندے طریقے سے ایکسپوز کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اور سب کچھ تو نظر آ رہا ہے۔ مگر آگہی کہیں نظر نہیں آ رہی۔''

وہ ملک صاحب کے ساتھ پہلے بھی کام کر چکا تھا اس لیے ذرا رعب سے بات کر رہا تھا۔ اس کی بات پر طاہر ملک اس کی جانب دیکھتا رہا پھر ہونٹ بھینچ کر بولا۔

''او کے...... آپ کو جن ڈائیلاگز پر اعتراض ہے، آپ انہیں اسکرپٹ سے نکال دیں۔'' مرتضیٰ اطمینان کا سانس لے کر دوبارہ گرین روم میں چلا آیا۔ اسکرپٹ اسے آج ہی ملا تھا ورنہ شاید وہ پہلے ہی بہت اطمینان سے اس کا کوئی حل ڈھونڈ لیتا۔ اس نے وہ تمام جملے چن چن کر انڈر لائن کیے جن پر اسے اعتراض تھا اور پھر باقی کے ڈائیلاگز یاد کرنے لگا۔

یہ ڈرامہ اس کی زندگی کا پہلا بُرا ڈرامہ ثابت ہوا تھا۔ اپنے ڈائیلاگز کی چھانٹی کر کے وہ مطمئن ہو گیا تھا کہ اس نے تمام اسکرپٹ میں موجود غلاظت کو ختم کر دیا۔ وہ یہ بھول گیا تھا اس کے علاوہ بھی اس ڈرامہ میں پانچ مین کریکٹرز تھے جو کہ چند دوسرے چھوٹے موٹے کریکٹرز کی انٹریز بھی تھیں۔ ان سب باقی کریکٹرز نے چیپ ڈائیلاگز ہی بولے تھے اور خوب جم کر بولے تھے۔ وہ ڈرامہ مرتضیٰ کی زندگی کا برا ڈرامہ تھا مگر باقی لوگوں کے لیے اس ڈرامے کا پہلا شو ہی کھڑکی توڑ ثابت ہوا۔

''ہم نے ایک نئی جہت متعارف کروائی ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم کامیاب نہ ہوتے۔'' طاہر ملک نے پہلے شو کے آخر میں رعونت بھرے لہجے میں بطورِ خاص اس کی جانب دیکھ کر کہا تھا۔ مرتضیٰ اس روز تینوں شوز کرتے ہوئے شرمندہ ہی ہوتا رہا جب کہ حیرانی اسے اس بات پر تھی کہ ہال میں بیٹھی خواتین ایسی باتوں پر قہقہے کیسے لگا سکتی ہیں۔ ہال میں جتنے بھی مرد و عورت تھے وہ سب کے سب اس ڈرامہ کو خوب انجوائے کر رہے تھے۔ یہ ڈرامہ کافی دن تک ریکارڈ رش لیتا رہا اور مرتضیٰ پہلے کی طرح ایک ساتھ شرمندہ اور حیران ہوتا رہا۔ اس کے بعد جیسے یہ ٹرینڈ سا آ گیا۔ لاہور کے تمام رائٹرز اور پروڈیوسرز جو تھیٹر کے لیے کام کرتے تھے، مل جل کر کچھ ایسے ڈرامے تیار کرنے لگے جو اطمینان سے فیملی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھنے والے نہیں تھے۔

''آپ کی سوچ کچھ زیادہ ہی بیک ورڈ ہو گئی ہے۔'' اس کے اعتراض پر یہی جملہ سننے کو ملتا، اس روز فرزند بیگ نے اسے ایک نئی ڈوز دینے کی کوشش کی۔

''بھٹی صاحب! دنیا میں اتنے مسائل ہیں۔ عوام کے ذہن ان مسائل سے جکڑے ہوتے ہیں۔ وہ یہاں ایسی تفریح کے حصول کے لیے آتے ہیں جو انہیں تازہ دم کر دے، انہیں تفریح پہنچانے کے لیے اگر چند ایک جملے ایسے استعمال کر لیے

جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ عوام ہنستے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں۔ انہیں ہنسنے سے غرض ہوتی ہے۔ وہ اس بات کی پروانہیں کرتے کہ انہیں کس قسم کے مواد سے ہنسایا جارہا ہے۔''

''اگر تمہاری ماں سامنے ہال میں بیٹھی ہو تو کیا تب بھی تم یہی ڈائیلاگز بولنے پر اصرار کرو گے۔''

مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ طاہر ملک نے اسے اپنے دوسرے ڈرامہ کے لیے بلوایا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ وہ بحث کو کچھ خاص پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے یہی بہتر سمجھا تھا کہ غلام مرتضٰی بھٹی کے بجائے کسی دوسرے اداکار کو بلا لیا جائے۔ مرتضٰی کا دل تنفر ضرور ہوا تھا مگر اتنا نہیں کہ وہ تھیٹر چھوڑ دیتا۔ اس روز ایک عجیب بات ہوئی۔

اس کا ایک دیرینہ دوست سعدی لندن سے آیا ہوا تھا۔ مرتضٰی کے ڈراموں کی ویڈیو کیسٹ آئی تھیں، جو اس نے خود بھی ابھی نہیں دیکھی تھیں۔ مرتضٰی نے وہ سعدی کو دے دیں۔ تین روز بعد سعدی اس سے دوبارہ ملنے کے لیے آیا۔

''انہیں تمہارے ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔ مل کر دیکھنے میں زیادہ مزہ آئے گا۔'' سعدی نے سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔ مرتضٰی بھی فارغ تھا۔ سو اس نے ہنسی خوشی ویڈیو لگا دیا۔

ڈرامہ کے ڈائیلاگز اتنے چیپ نہیں تھے مگر ابھی پچیس منٹ کا ڈرامہ گزرا تھا کہ ایک فربہی مائل جسم کی میک اَپ میں لتھڑی ہوئی رقاصہ اسٹیج پر آکر رقص کرنے لگی۔ اس کے اسٹیپس سے زیادہ ہال میں بیٹھے لوگوں کی سیٹیاں تھیں جو مرتضٰی کو پریشان کررہی تھیں۔

''یہ...... پتا نہیں...... کیسے یہ بعد کی ریکارڈنگ ہے۔'' اس نے پشیمانی کے احساس میں گھر کر سعدی سے کہا تھا۔

''تم دیکھتے جاؤ۔'' سعدی اسکرین کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اڑھائی گھنٹہ کے اس ڈرامہ میں تین رقص شامل تھے اور مرتضٰی تینوں سے ہی لاعلم تھا، جب کہ سعدی اس کی کوئی بات سننے پر تیار نہیں ہوا۔

''تمہیں شرم آنی چاہیے یہ سب کرتے ہوئے۔ تم اسے فن کی خدمت کہتے ہو۔ ایسے کرتے ہیں فن کی خدمت...... توبہ...... سیدھا سادا فحاشی کا اڈا ہے جو تم چلا رہے ہو۔ اتنی غربت آگئی ہے تم پر...... بھوکے مر رہے ہو تم...... یا پھر ایسی کون سی مجبوری ہے جو تمہیں یہ سب کرنے پر مجبور کررہی ہے۔ مجھے تم سے گھن آرہی ہے مرتضٰی۔'' وہ اس کی بات سنے بغیر اپنی کہے گیا تھا اور پھر حقارت سے اسے خدا حافظ کہے بغیر چلا گیا تھا۔

''مجبوری......؟'' مرتضٰی نے ایک لفظ دہرایا تھا۔ واقعی اسے کوئی مجبوری تو نہیں تھی۔

''مجھے فائیو تھاؤزنڈ دے دیں۔'' ارتضٰی نے عجلت بھرے انداز میں لاؤنج میں داخل ہوکر اسے مخاطب کیے بنا اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ مرتضٰی آنکھوں پہ چشمہ لگائے اخبار ہاتھ میں لیے شوبز کے پیج پر نظریں دوڑا رہا تھا، کبھی کسی ایسے اداکار یا اداکارہ کی تصویر یا ان کے متعلق کوئی خبر آجاتی۔ جن کے ساتھ وہ کام کرچکا تھا۔ تو وہ اس خبر کو بہت شوق سے پڑھتا تھا۔ اب بھی وہ خالد عباس ڈار کے بیان اور تصویر کو بہت مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا جب ارتضٰی نے آکر مطالبہ کیا۔

''اس تصویر کو دیکھو ارتضٰی...... یہ بہت اچھے ایکٹر ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ دو تین بار کام کیا تھا۔ بہت بذلہ سنج شخصیت کے مالک ہیں۔ مجھے بہت......''

''مجھے فائیو تھاؤزنڈ چاہیے تھے۔'' ارتضٰی کی جھنجلاہٹ بھری آواز سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر اپنے اونچے لمبے بیٹے کو دیکھا۔ اور پھر اس خیال سے نظر ہٹالی کہ کہیں اس کی نظر بیٹے کو نہ لگ جائے۔ سفید ٹریک سوٹ میں ملبوس سترہ سالہ ارتضٰی بھٹی شاندار قد کاٹھ کا مالک اور نہایت اچھے نقوش کا حامل نوجوان تھا۔ اعتماد اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ صحت مند اٹھان تھی۔

جسے ایکسر سائز وسوئمنگ اور ٹینس نے چار چاند لگا دیئے تھے۔ اس پر مستزاد جب وہ خوبصورت لہجے میں فرفر انگریزی بولتا تو مرتضٰی کا دل نہال ہوجاتا۔

''میرا بیٹا شہزادوں سے بڑھ کر ہے۔'' وہ اکثر نسرین سے کہتا تھا حالانکہ اس فخریہ پیش کش کی وہ برابر کی ذمہ دار تھی مگر پھر بھی وہ چڑ جاتی۔ اسے اپنے شہزادے کے نخروں سے ڈر لگنے لگا تھا۔

''کہاں کھو گئے ہیں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''میرے پاس اس وقت فائیو تھاؤزنڈ نہیں ہیں۔ تم ون تھاؤزنڈ لے لو۔ میں تمہیں کل......'' وہ جیب سے بوسیدہ والٹ نکال رہا تھا مگر ارتضٰی نے اس کی بات کاٹ دی۔

''نو تھینکس مجھے فائیو ہی چاہئیں۔'' اس نے اتنا کہا اور پلٹ کر تیز تیز چلتا ہوا کچن کی جانب چل دیا۔ اس کے انداز میں ناراضی نمایاں تھی۔ مرتضٰی کا دل بے حد دکھا اس کے معاشی حالات دن بہ دن تنزلی کی جانب گامزن تھے۔ گزشتہ چھ سالوں میں وہ چھ ہی کاروبار تبدیل کرچکا تھا۔ اپنی پنو راما میں موجود دو دکانوں میں سے ایک میں آج کل وہ ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار کررہا تھا۔ اس سے پہلے مردانہ فٹ ویئرز رکھے تھے اور اس سے بھی پہلے اس نے کمپیوٹر کے کاروبار کو چلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی وہ کاروباری اسرار ورموز سیکھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ جو جمع جتھا تھا وہ مال کی صورت دکان میں منتقل ہوجاتا تھا مگر برکت نہیں پڑتی تھی اسی لیے آج کل وہ ہاتھ کھینچ کر گزارہ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے اور نسرین نے اس سال ایک بھی نیا جوڑا نہیں بنایا تھا۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے بیٹے کو انکار کردیا تھا، ارتضٰی کچن کی جانب چلا گیا تو وہ بھی اٹھ کر اسے منانے کے لیے پیچھے چلا آیا مگر ابھی وہ کچن اور لاؤنج کے درمیانی راستے میں تھا کہ اس کے کانوں میں ارتضٰی کی پھنکارتی آواز سنائی دی۔

''انسان کس لیے کماتا ہے۔ بچوں کے لیے نا...... تو پھر ''یہ'' مجھے پہلی بار مانگنے پر پیسے کیوں نہیں دے دیتے۔ انہیں اچھا لگتا ہے کہ میں فقیروں کی طرح ان کے آگے ہاتھ پھیلاؤں۔ تب ہی میرے سامنے پیسوں کی کمی کا رونا رونے لگتے ہیں۔''

''ان کے بارے میں اس لہجے میں بات مت کرو ارتضٰی...... ان کے پاس واقعی پیسے نہیں ہوں گے ورنہ وہ تمہیں کبھی انکار نہیں کرتے۔'' نسرین کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

''ان کے پاس کبھی پیسے ہوتے بھی ہیں، سن لیں مما...... صرف مجھے پیسے دیتے ان کی جان جاتی ہے۔ وہ اپنی دولت پر ناگ بن کر بیٹھے ہیں۔ اتنے روپے کہاں لے جائیں گے وہ، میں نے زیادہ تو نہیں مانگ لیے۔ اونلی فائیو تھاؤزنڈ...... فائیو تھاؤزنڈ کی اوقات ہی کیا ہے آج کل کے زمانے میں۔ انہیں شوق ہے مجھے چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترسانے کا۔ وہ کبھی مجھے خوشی سے پیسے نہیں دیتے۔ وہ چاہتے ہیں میں ان کی منتیں کرتا رہوں۔ آپ جانتے بوجھتے ہوئے ان کا ساتھ دیتی ہیں۔''

ارتضٰی نے آواز کا والیوم کم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''تم اپنے خرچ کم کرنے کی کوشش کرو بیٹا...... اب پہلے جیسے حالات نہیں رہے۔'' نسرین نے ایک بار پھر اسے پچکارنا چاہا تھا۔

''میں اپنے خرچ کم کروں؟'' وہ بھڑک اٹھا ''یعنی میں اپنے خرچ کم کروں...... میرے خرچ ہیں ہی کیا ایسا کیا کرتا ہوں میں؟ آپ نے میرے کلاس فیلوز کو نہیں دیکھا۔ ان کے خرچ دیکھ لیں تو شاید حیرانی سے مرجائیں۔''

’’خدانہ کرے۔‘‘ باہر لابی میں کھڑا مرتضٰی دہل کر بولا تھا۔اس کی آواز اتنی اونچی نہیں تھی کہ کچن میں موجود ماں بیٹا سن پاتے۔

’’آپ لوگ مجھے اس طرح ٹریٹ مت کریں جیسے کسی بھکاری کو کرتے ہیں۔ دل چاہا تو دو روپے کا سکہ دے دیا،نہیں دل چاہا تو ’’معاف کرو بابا‘‘ کہہ کر ٹال دیا۔آپ لوگوں سے میرے خرچ پورے نہیں ہو سکتے تھے تو آپ کو مجھے پیدا نہیں کرنا چاہیے تھا۔میں اپنی مرضی سے تو اس دنیا میں نہیں آیا۔‘‘

وہ پھنکار رہا تھا۔مرتضٰی بھٹی پھٹی آنکھوں سے کھڑا یہ سب سن رہا تھا،اس نے اپنے بیٹے کو یہ سب نہیں سکھایا تھا۔وہ تھکے قدموں سے چلتا اپنے بیڈروم میں آ گیا پھر وارڈ روب کھول کر کپڑوں کی تہہ کے نیچے رکھا ایک والٹ نکال کر اس نے اس میں سے گن کر پانچ ہزار ہزار کے نوٹ نکالے تھے۔ یہ روپے اس نے نسرین کے چیک اَپ کے لیے آج ہی کسی سے ادھار لیے تھے۔وہ بہت دن سے پیٹ میں عجیب سے درد کی شکایت کر رہی تھی۔ان کے جنرل فزیشن نے تفصیلی چیک اَپ کے لیے کہا تھا۔وہ پانچ ہزار لیے دوبارہ کچن میں آ گیا۔

’’پلیز ارتضٰی! آہستہ بولو......تمہارے بابا سنیں گے تو انہیں کتنا برا لگے گا۔‘‘

کچن کے دروازے سے بالکل اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے نسرین کی آواز سنی۔

’’شکر ہے ارتضٰی! ابھی تم یہیں ہو۔ یہ لو یار پانچ ہزار روپے۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میرے پاس یہ روپے ہیں۔ ابھی دیکھا تو نظر آئے تم یہ رکھ لو۔کیا پک رہا ہے نسرین! بہت بھوک لگی ہے۔ پیٹ میں ہلچل سی مچی ہے۔اتنی بھوک لگ رہی ہے کہ بھوک کی وجہ سے سانس بھی پھول رہی ہے۔لاؤ یار کوئی کیک رس یا بسکٹ ہی دے دو۔ چائے بنا دو کچھ دے دو۔ مجھے کچھ دے دو نسرین۔‘‘

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ کچن میں موجود چھوٹی ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھ گیا۔ارتضٰی روپے اس سے لے کر ناک چڑھاتا کب کا کچن سے جا چکا تھا۔نسرین نے گہری سانس بھری،دو موٹے موٹے آنسو اس کی پلکوں پہ لرزتے لرزتے رخسار پر ڈھلک آئے تھے۔ وہ خاموشی سے چائے کے لیے برنر آن کرنے لگی۔ جب کہ مرتضٰی کے سامنے پڑی ٹیبل کی چکنی سطح گیلی سی ہو گئی تھی۔



’’اب کیا ہوگا؟‘‘ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب چھت کی جانب کھلی آنکھوں سے دیکھتے نسرین نے بجھے بجھے لہجے میں سوال کیا تھا۔ وہ دونوں ہی چت لیٹے کب سے چھت کو تک رہے تھے۔نسرین کے لہجے میں اس قدر مایوسی تھی کہ مرتضٰی بے چینی سے تڑپ اٹھا۔ اس نے رخ بدل کر اس کی جانب دیکھا پھر ایک عجیب سے احساس میں گھر کر اسے اپنے قریب کر کے اپنے بازو اس کے گرد حمائل کر دیئے۔نسرین کی سسکیاں رات کی تاریکی میں کمرے کے چاروں جانب ایک نیا اضطراب گھول رہی تھیں۔

’’مجھے معاف کر دیں مرتضٰی! میں آپ کے لیے ہمیشہ سے ہی مسائل کا منبع رہی ہوں۔ میں آپ کی زندگی میں کوئی آسانی نہیں پیدا کر سکی...... مجھے معاف کر دیں۔‘‘

سسکیوں کے درمیان وہ نہ جانے کس بات کی معافی تلافی کر رہی تھی۔اس کے گرد مرتضٰی کی گرفت مضبوط ہوئی تھی۔

’’تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔ان شاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ہوں نا۔‘‘

وہ اس کے بالوں بھرے سر پہ اپنا چہرہ رکھ کر بولا تھا۔اس کی آنکھوں میں بھی پانی تھا،مگر وہ اپنی شریکِ حیات کو بے حوصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا،اس نے تو اسے ڈاکٹر سے ہونے والی میٹنگ کی مکمل تفصیل بھی نہیں بتائی تھی۔ وہ جس پیٹ درد کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر رہے تھے۔ وہ ہیپا ٹائٹس سی نکلا تھا،نسرین تو ابھی بھی چیک اَپ کے لیے راضی نہیں تھی۔مگر اس کا تیزی سے زرد پڑتا چہرہ اور مضمحل وجود مرتضٰی کو احساس دلا رہا تھا کہ تاخیر مناسب نہیں۔نسرین کے چیک اَپ کے لیے اسے ادھار لینا پڑا تھا۔ چیک اَپ تو ادھار روپوں سے ہو گیا تھا،لیکن اب ایک لمبا اور مہنگا علاج درکار تھا تا کہ اس بیماری کا قلع قمع کیا جا سکے۔نسرین کو اس نے یہی بتایا تھا کہ یرقان کا عارضہ ہے۔ رپورٹس جان بوجھ کر اس نے اس کے ہاتھ نہیں لگنے دی تھیں۔مبادا وہ جان جائے کہ ہیپا ٹائٹس سی ہے اور وہ خطرناک اسٹیج پر پہنچ چکا ہے۔

وہ کافی دیر تک نسرین کے بالوں کو سہلاتا رہا تا کہ وہ سو جائے،اور وہ سو بھی گئی تھی لیکن نیند مرتضٰی کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مسائل عفریت کی طرح اسے چاروں جانب سے دبوچ رہے تھے۔اور کوئی راہِ فرار نہیں تھی۔ کاروبار مسلسل گھاٹے میں جا رہا تھا،ارتضٰی کے خرچ بڑھتے جا رہے تھے،وہ اپنے لائف اسٹائل کے اسٹینڈرڈ کو برقرار رکھنے کے لیے کسی کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔آج بھی سارا دن پرائیویٹ میڈیکل کلینکس پر خوار ہونے کے بعد جب وہ گھر پہنچے تھے تو ارتضٰی کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

’’تمہاری مما کی رپورٹس پازیٹو نہیں ہیں۔اسے......‘‘ مرتضٰی نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ اپنا کٹ بیگ اٹھا کر بولا۔

’’میں آپ کی باتیں واپس آ کر سنوں گا۔ابھی میرے فرینڈز انتظار کر رہے ہیں۔ہمیں مری کے لیے نکلنا ہے۔آج رات میرا اسکوائش کا میچ ہے۔‘‘ وہ ماں سے ملے بغیر،باپ کو تسلی دیئے بغیر باہر نکل گیا تھا۔ جب کہ مرتضٰی نے تاسف سے دروازے کی جانب دیکھا۔

’’کیا اولاد بھی پانی کے بلبلے کی طرح ہوتی ہے؟ کیا واقعی اس کو نہیں پکڑا جا سکتا۔‘‘ کمرے میں پھیلی اپنے بیٹے کی خوشبو محسوس کرتے ہوئے وہ یہی سوچتا رہا تھا۔حالات بھی اس کے قابو میں نہیں آ رہے تھے۔اس کی شاپ پر ایک ملازم تھا اکبر جسے وہ گاؤں سے گزشتہ سال لایا تھا ابا جی کے ماموں کے بیٹے کا بیٹا تھا۔اچھا سمجھدار اور قابلِ بھروسا لڑکا تھا،لیکن ملازم بہر حال ملازم ہوتا ہے سو مرتضٰی کا دل چاہتا تھا کہ ارتضٰی ایک آدھ چھوٹی موٹی ذمہ داری تو سنبھال لے۔ وہ بہت اچھی ڈرائیونگ کرتا تھا۔ وہ ماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جا سکتا تھا۔یا مرتضٰی کی غیر موجودگی میں شاپ کا ایک چکر لگا سکتا تھا۔لیکن اسے ان سب کاموں سے نفرت تھی۔ سب سے بڑھ کر نسرین کے علاج کے لیے کافی رقم درکار تھی۔ وہ اپنے خرچ ہی کم کر سکتا تھا مگر وہ اس کے لیے بھی تیار نہیں تھا جب کہ مرتضٰی کے کانوں میں مسلسل ڈاکٹر اذغان کا جملہ گونج رہا تھا۔

’’بہتر ہے شوکت خانم سے بھی ٹیسٹ کروا لیے جائیں۔ تسلی ہو جاتی ہے۔ ہیپا ٹائٹس سی ڈائریکٹ لیور کو بھی تو اٹیک کرتا ہے نا۔‘‘

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بیٹے کو پاس بٹھا کر یہ سب بتائے۔ نسرین سے تو یہ سب شیئر نہیں کیا جا سکتا تھا۔گزشتہ کئی سالوں سے اس کی دوستیاں ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ سب اپنی اپنی زندگیوں اور دائروں میں گھمن گھیریاں کھا رہے تھے۔سعدی نے تو اسے جان بوجھ کر نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔

وہ رات اس نے بہت مشکل سے گزاری تھی۔ اگلی صبح پہلی فرصت میں وہ بینک گیا تھا۔تا کہ اپنا بیلنس وغیرہ چیک کر سکے اور یہ سب کرنے کے بعد اس کی پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

"آپ کا کریڈٹ ہے پچاس ہزار نو سو روپے۔ خیریت بھٹی صاحب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔"

کیشئر جو اسے جانتا تھا اس کے چہرے پر حزن و ملال کے گہرے سائے دیکھ کر پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ حالانکہ بری خبر سنانے والا بھی وہی تھا۔ مرتضیٰ نے بہ دقت مسکرا کر اسے ٹالا اور بینک سے نکل آیا اب کیا سبیل نکالی جائے اسے بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

مصطفیٰ بھائی سے کچھ مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ خود نہ جانے کیسے اپنے دو بچوں کو پال رہے تھے۔ ان کے یہاں اولاد دیر سے ہوئی تھی۔ ان کے بچے ارتضیٰ سے بھی چھوٹے تھے، نسرین کے بھائی تو تھے ہی نکھٹو صرف باتیں کرنے میں ملکہ حاصل تھا...... ایسی صورت میں وہ روپے کس سے مانگ سکتا تھا، اور کیسے مانگ سکتا تھا۔ یہ سب باتیں اس کی طبیعت کو بھی نڈھال کر رہی تھیں۔ وہ چلتے چلتے ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس کی گاڑی تو کب سے اس کے بیٹے کے تصرف میں آ چکی تھی۔ وہ آج کل لوکل ٹرانسپورٹ سے گزارہ کر رہا تھا۔

کافی دیر وہیں بیٹھے رہنے کے بعد وہ گھر پہنچا تھا تو ایک دل دہلا دینے والی خبر منتظر تھی۔

"اس کی شاپ میں آگ لگ گئی تھی۔ لاکھوں کا مال پل بھر میں راکھ ہو گیا تھا۔" نسرین کے منہ سے یہ سب سن کر وہ دل پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔

"اب کیا ہوگا؟" یہ سوال جب کچھ دن پہلے نسرین نے اس سے پوچھا تو وہ اسے تسلی دینے لگا تھا لیکن اب یہ سوال وہ بار بار خود سے پوچھ رہا تھا اور مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

اس کی شاپ انشورڈ نہیں تھی کہ وہ بے فکر ہو جاتا۔ اس کے لیے تو یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اور اب جب اسے ہاتھ جھاڑ کر بیٹھنا پڑ رہا تھا تو اسے مایوس ہونے کے سوا کوئی کام نہیں آ رہا تھا۔ اباجی اور اماں جی آج کل اس کے پاس شہر آئے ہوئے تھے۔ کتنی ہی دیر تک وہ اور اباجی لان میں فولڈنگ چارپائی بچھا کر خاموشی سے بیٹھے رہے۔ ان کے پاس کہنے کے لیے کوئی الفاظ ہی نہیں تھے۔ اباجی کا جھریوں بھرا چہرہ اپنے بیٹے کے شکستہ چہرے کو دیکھ کر مزید لاغر لگنے لگا تھا۔ وہ انہیں بے حد عمر رسیدہ لگ رہا تھا۔ وہ بیٹھے ہی ہوئے تھے کہ گاڑی کا ہارن بجنے لگا۔ ارتضیٰ آ چکا تھا وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مری گیا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟...... کون مر گیا؟" اندر آتے ہی اس نے سب سے پہلے دادا اور باپ کی اتری شکل دیکھ کر سوال کیا تھا۔

"خدانخواستہ...... بچے ایسی باتیں نہیں نکالتے منہ سے کوئی مبارک کلمہ کہہ کر گھر میں داخل ہوتے ہیں۔"

اباجی بے ساختہ اسے ٹوک بیٹھے جب کہ ارتضیٰ کا چہرہ لال ہو گیا۔

"اپنے باپ سے کہہ دیں مجھے نصیحتوں سے سخت نفرت ہے۔" وہ انگریزی میں مرتضیٰ کی جانب دیکھ کر بولا اور پھر اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ پہلی بار اسے ارتضیٰ کی حرکت پر سخت غصہ آیا۔ چند منٹ بعد ہی وہ اس کے کمرے میں کھڑا تھا۔

"تمہیں کسی نے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی؟"

"یہ بات آپ مجھ سے نہیں خود سے پوچھیے۔ آپ نے مجھے جس طرح کا بروٹ اَپ کیا ہے میں اسی طرح کا ہوں...... آپ مجھے اس طرح Brought up نہیں کرتے تو میں ایسا کبھی نہ ہوتا۔" وہ کندھے اچکا کر بولا تھا۔

"میں نے تمہیں بزرگوں کے ساتھ بدتمیزی کرنا نہیں سکھایا تھا۔" مرتضیٰ اپنے دکھ کو کنٹرول کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے بزرگوں کے ساتھ کبھی بدتمیزی نہیں کی۔" اس کا انداز ویسا ہی تھا۔ وہ مرتضیٰ کی پروا کیے بغیر بستر پر دراز ہو چکا تھا۔

"جو تم ابھی اپنے دادا کے ساتھ کر کے آئے ہو اسے تمہاری زبان میں کیا کہتے ہیں؟"

"اگر وہ بدتمیزی تھی تو جو انہوں نے میرے ساتھ کیا وہ بھی بدتمیزی ہی تھی اور فار گاڈ سیک میرا دماغ مت کھائیے۔ میں پہلے ہی بہت تھکا ہوا ہوں۔"

وہ اوندھا ہو کر لیٹ گیا تھا۔ اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا لیکن بعض اوقات کسی کو دھتکارنے کے لیے دروازہ بند کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مرتضیٰ نے اپنے بوجھل دل کو مزید بوجھل پایا۔ اباجی کے ساتھ اس کا رشتہ کبھی بھی ایسا نہیں تھا کہ اسے وضاحتیں دینی پڑتیں لیکن ارتضیٰ کی بدتمیزی کے بعد وہ خوامخواہ نہیں وضاحتیں دینے لگا۔

اباجی بھی اپنے بیٹے کے ہی باپ تھے اسی لیے اس کی وضاحتوں پر سر ہلاتے گئے۔



"مجھے نہیں پتا، میں نے زندگی میں ایسی کون سی غلطیاں کی ہیں جن کی سزا اب مجھے مل رہی ہے۔ ہر آنے والا دن میرے لیے مصائب کے انبار لا رہا ہے۔ مجھے آنے والے دن سے ڈر لگتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ سورج ہی طلوع نہ ہوا کرے۔ میں اتنا برا انسان تو نہیں ہوں نسرین۔ میرے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟"

کمرے میں جب تنہائی کے علاوہ اس کی بیمار، غمگسار بیوی اس کے دکھ بانٹنے کی کوشش کر رہی تھی تو اس نے رقت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ نسرین کے پاس اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ان دونوں کے پاس جب کوئی جواب نہیں ہوتے تھے تو وہ خاموشی کی زبان میں غم بانٹنے کی کوشش کرتے تھے۔ نسرین بھی یہی کرتی رہی۔ وہ خود کافی پریشان تھی۔ گھر کے حالات، اس کی بیماری، کاروبار کا ختم ہو جانا اور ارتضیٰ کی خودسری سب چیزیں مل کر اس کے اعصاب کو کمزور بنا رہی تھیں۔ ارتضیٰ کھانا کھانے کے لیے بھی نہیں آیا تھا۔ وہ ٹرے سجا کر اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ ممتا کے ہاتھوں مجبور تھی نا...... اس کا خیال تھا کہ ارتضیٰ کو ساری باتیں تحمل سے سمجھا دے گی مگر وہ سب کچھ سن کر بھڑک اٹھا تھا۔

"واٹ...... شاپ جل گئی......؟ بھٹی صاحب بے وقوف بنا رہے ہیں آپ کو۔ مما! وہ واقعی دولت پر سانپ بن گئے ہیں۔ وہ جانتے تھے نا کہ مجھے Lums میں ایڈمیشن لینا ہے۔ تب ہی انہوں نے یہ ڈرامہ کیا ہے۔ اس کام میں تو ماہر ہیں وہ۔ ساری زندگی ڈراموں کے علاوہ انہوں نے کیا ہی کیا ہے۔ میں تو ان کے روز روز کے تماشوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ وہ مجھے پیسے نہیں دینا چاہتے، اس لیے ہر روز کوئی نیا کھٹ راگ پیدا کر دیتے ہیں۔"

"میری جان! میرے بچے۔ ایسے مت سوچا کرو۔ بہت محبت کرتے ہیں وہ تم سے...... تمہیں سمجھ......"

نسرین اسے سمجھا رہی تھی کہ لاڈلے نے بات کاٹ دی۔

"مما! ایسی جذباتی باتیں مت کیا کریں۔ میں جانتا ہوں، وہ کتنی محبت کرتے ہیں مجھ سے۔ آپ کو یاد ہے آج سے چار سال پہلے جب ہم نے اوپر والا پورشن بنا کر گھر کے تمام حصوں کا انٹیریئر بدلا تھا تب میرا کمرہ ڈیکوریٹ کرتے وقت انہوں نے کتنی فضول چیزوں کا انتخاب کیا تھا۔ حالانکہ میں نے ان کے کمرے کے لیے ہر چیز بہترین منتخب کی تھی۔ اگر انہیں مجھ سے محبت ہوتی تو وہ ایسے کرتے؟ گزشتہ چار سالوں سے میں ان کی ایسی باتوں کو اگنور کر رہا ہوں، اب مجھ سے نہیں ہوتا...... وہ اچھے باپ نہیں ہیں۔ باپ ایسے نہیں ہوتے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ لوگ اکلوتے بیٹوں پر جان چھڑکتے ہیں اور......" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا تھا۔

"میرا منہ مت کھلوائیں مما! مجھے خاموش رہنے دیں۔ مجھے وہ انسان اچھا نہیں لگتا جو ناانصاف ہو۔ وہ میرے ساتھ

ناانصافی کرتے ہیں۔"

اس کی آواز میں ٹین ایجرز والا جذباتی پن تھا۔نسرین اسے سمجھانا چاہتی تھی، لیکن اس کی اپنی طبیعت اتنی بوجھل ہو گئی تھی کہ وہ وہاں سے اٹھ گئی۔اس کے پاس ارتضٰی کے ہر سوال کا جواب تھا لیکن اسے سمجھانا فی الحال کسی کے بس کی بات نہیں لگ رہی تھی۔

وہ باپ کی محبت کو مادیت پرستی کے ترازو میں تول رہا تھا ایسے جیسے بچے سب سے زیادہ عیدی دینے والے انکل کو سب سے اچھا انکل کہتے ہیں، اسی طرح اس کا بیٹا اپنے باپ کے لیے ایک معیار مقرر کر چکا تھا۔وہ اپنے بیٹے کو کیسے بتاتی کہ اس کا باپ جان بوجھ کر اس کے لیے "فضول چیزیں" پسند نہیں کرتا۔وہ اگر اپنے لیے چیزیں لاتا تو وہ ایسی ہی ہوتی تھیں۔ایک دیہاتی شخص کی پسند ناپسند اس کے ماڈرن بیٹے کے معیار پر کیسے پوری اتر سکتی تھی۔ارتضٰی کی باتوں کو برداشت کرتی وہ اب اپنے بستر پر لیٹی مرتضٰی کی باتیں سن رہی تھی۔

نسرین کی بیماری بڑھتی جا رہی تھی۔جس چیز کو ہیپا ٹائٹس سی سمجھا گیا تھا وہ دراصل لیور کا اسٹون تھا۔ڈاکٹرز نے اسے آپریٹ کروانے کا مشورہ دیا تھا۔مرتضٰی کے پاس بخار کے علاج کے لیے پیسے نہیں تھے وہ لیور کا آپریشن کیسے کرواتا۔کسی کے مشورے پر اس نے اپنا گھر گروی رکھ کر اس پر قرضہ لے لیا جو پندرہ لاکھ مالیت کا تھا۔رقم ہاتھ میں آجانے سے اسے کافی سکون نصیب ہوا۔اگرچہ گھر گروی رکھ دینے کا افسوس تھا مگر گھر نسرین سے زیادہ اہم نہیں تھا۔نسرین کے آپریشن کے ساتھ اس نے بقیہ رقم سے دکان کو ری پینٹ کروا کر وہاں مال ڈلوا لیا تھا۔دوسری دکان کرائے پر تھی جس کا پانچ سال کے لیے کانٹریکٹ ہو چکا تھا۔اس کنٹریکٹ سے جو رقم حاصل ہوئی تھی، اسی سے کچھ عرصہ پہلے اس نے اپنا گھر مرمت کروایا تھا۔

اسے لگ رہا تھا جیسے وہ نئے سرے سے زندگی کی ابتداء کر رہا ہے۔زیرو سے سفر شروع کرنا واقعی بے حد مشکل تھا۔ خاص طور پر جب آپ ناامید بھی ہوں۔نسرین اسے اور وہ نسرین کو امید دلانے کے لیے بلاوجہ باتیں کرتے رہتے ایسے جیسے ذیابیطس کے مریض انسولین کی ٹیبلٹ لیتے ہیں۔ارتضٰی کی وہی مصروفیات تھیں بلکہ ان میں کسی قدر اضافہ ہو چکا تھا۔اے لیولز کے بعد وہ فارغ تھا۔اس کا زیادہ وقت دوستوں میں گزر جاتا۔گھر ہوتا تو فون، موبائل فون، یا انٹرنیٹ پر مصروف رہتا۔اس نے اسموکنگ بھی شروع کر دی تھی۔ایک روز کام والی ماسی نے گھر کی صفائی کے دوران سگریٹ کے کچھ ٹوٹے دیکھے تھے۔

"یہ چھوٹے صاحب کے کمرے سے نکلے ہیں۔" ملازمہ نے ارتضٰی کے کمرے کی جانب اشارہ کر کے کہا تھا۔جب کہ نسرین نے اسے یہ بات کسی کو بتانے سے منع کر دیا تھا۔اس کا خیال تھا مرتضٰی کو بیٹے کی یہ حرکت مزید دکھ دے گی۔وہ گاڑی میں سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر دیکھ کر پہلے ہی کھٹک چکا تھا کہ اس کا بیٹا سگریٹ نوشی کرنے لگا ہے۔اس نے بھی یہ بات نسرین کو نہیں بتائی تھی کہ اس کے بے حد دکھی ہو جانے کا خدشہ تھا۔ارتضٰی بھٹی صاحب کو ان دونوں کی ہی فکر نہیں تھی سو ایک روز رات کے کھانے کے بعد جب مرتضٰی نے اسے کسی ضروری بات کی خاطر کچھ دیر وہیں بیٹھنے کے لیے کہا تو اس نے احسان کرنے والے انداز میں بیٹھ کر جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا تھا۔نسرین اور مرتضٰی ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہ گئے تھے۔

"سگریٹ پینا کوئی اتنا بڑا پرابلم نہیں ہے کہ آپ میری شکل ایسے دیکھنے لگیں، جیسے لوگ مرے ہوئے شخص کی شکل دیکھتے ہیں۔میری سمجھ میں نہیں آتا آپ مجھے زمانے کے ساتھ کیوں نہیں چلنے دیتے۔میں کوئی چھوٹا بچہ تو نہیں ہوں جس کی ہر حرکت پر اسے سرزنش کرنے والے انداز میں دیکھا جائے۔"

وہ بے انتہا چڑ گیا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے بیٹا! تم اپنی مما اور بابا کے بارے میں کچھ زیادہ ہی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو۔دراصل اتنے کرائسز گزرے ہیں کہ سب ہی چڑچڑے ہو گئے ہیں۔ایسا کرتے ہیں کل کہیں مل کر باہر چلتے ہیں۔ڈنر باہر کریں گے۔کیسا آئیڈیا ہے۔" مرتضٰی خوش ہوتے ہوئے بولا۔عرصہ ہی ہو گیا تھا انہیں اکٹھے کہیں باہر گئے۔وہ امید بھری نظروں سے اپنے بیٹے کی جانب دیکھ رہے تھے۔

"آئم سوری، میں آپ کے ساتھ ڈنر کے لیے نہیں جا سکتا۔کسی نے خدانخواستہ آپ کو پہچان لیا تو میرا کتنا مذاق بنے گا۔میرے جس فرینڈ کو آپ کا پتا چل جاتا ہے وہی مجھے مسخرے کا بیٹا کہہ کر چڑانے لگتا ہے۔مجھے مذاق بننے سے بہت ڈر لگتا ہے۔مجھے تو معاف رکھیں آپ۔"

وہ تلخ لہجے میں بولا تھا۔نسرین نے مرتضٰی کی جانب دیکھا اور پھر سر جھکا کر ٹیبل پر پڑے برتن اٹھانے لگی۔یہ اب ان کے لیے معمول کی بات تھی۔اس کی کوشش ہوتی تھی کہ مرتضٰی کے سامنے بیٹے کو کم سے کم مخاطب کرے تاکہ بعد میں مرتضٰی کے سامنے یہ تاثر پیدا کر سکے کہ ارتضٰی اس کے سامنے روڈ ہوتا ہے مگر اکیلے میں اپنے باپ سے بہت محبت جتاتا ہے لیکن جب کہیں وہ ایک ساتھ اس سے بات کرنے کی غلطی کرتے تھے تو ایک دوسرے سے نظریں چراتے پھرتے تھے۔



"مجھے Lums میں ایڈمیشن لینا ہے۔" وہ باپ کے سامنے بیٹھا خودسر لہجے میں بولا تھا۔

"Lums میں...... وہ تو بہت مہنگا......" مرتضٰی نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ وہ چیخ پڑا۔

"مجھے پتا تھا...... میں جانتا تھا، آپ یہی کہیں گے۔آپ میری خوشیوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔آپ مجھے خوش دیکھنا ہی نہیں چاہتے، اسی لیے میری ہر بات سے انکار کر دیتے ہیں۔"

"میں نے انکار تو نہیں کیا میں تو صرف یہ......" وہ بیزار لہجے اور اکھڑتی سانسوں کے درمیان بولا تھا۔

"یہ انکار ہی ہے جناب...... اور انکار کسے کہتے ہیں۔ٹھیک ہے ایسے تو ایسے ہی سہی، میں بھی پڑھائی چھوڑ دوں گا۔ Lums کے سوا تو مجھے کہیں نہیں پڑھنا۔میرے سب دوست وہیں ایڈمیشن لے رہے ہیں ایز یو وش۔"

وہ پاؤں پٹختا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔مرتضٰی نے اپنے بیٹے کی جانب دیکھا، اس کے لیے اس کی اولاد سب سے بڑا بلیک میلر ثابت ہو رہی تھی۔وہ اس کا بیٹا تھا، مگر کسی ڈراؤنے خواب سے کم نہیں تھا۔مسئلہ یہ تھا کہ اسے اس ڈراؤنے خواب سے محبت بھی بہت تھی۔اس نے نسرین سے بات کی تو اس نے قطعیت بھرے لہجے میں انکار کر دیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس بار اس کی بات ماننے کی۔کچھ زیادہ ہی خودسر ہو گیا ہے یہ، اگر اس کے سب فرینڈز Lums میں ایڈمیشن لے رہے ہیں تو ہم کیا کریں، ہم نہیں افورڈ کر سکتے۔"

"وہ بچہ ہے، بچے ضد کرتے ہی ہیں۔تم اسے پیار سے سمجھاؤ۔" مرتضٰی منت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

"وہ پیار کی زبان سمجھتا ہی کب ہے؟" نسرین نے یہ بات دل میں سوچی تھی۔وہ خود ارتضٰی سے خائف رہنے لگی تھی۔ اس نے سوچا تھا، وہ رات کو اس سے بات کر کے دیکھے گی، مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔وہ رات کو گھر نہیں آیا تھا۔اس سے پہلے وہ رات کو بتائے بغیر کبھی غائب نہیں ہوا تھا۔ان کے پاس اس کے دوستوں کے جتنے نمبرز تھے، ان سب پہ فون کر کے وہ پتا کر چکے تھے۔وہ وہاں کہیں نہیں تھا۔اس کے سیل فون پہ کوئی رسپانس نہیں تھا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب وہ گھر آیا تھا۔ اور ان دونوں کو نظر انداز کر کے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ ایک گھنٹہ بعد انہوں نے اسے سوٹ کیس لیے کمرے سے باہر نکلتے دیکھا۔

''میں آپ کا گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں ایسی جگہ نہیں رہ سکتا جہاں پیرنٹس اولاد کو قربانی کا بکرا سمجھیں۔ آپ میرے باپ نہیں، بلیک میلر ہیں۔ میں نفرت کرتا ہوں آپ سے۔''

وہ گیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ مرتضیٰ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے سامنے آ گیا۔

''ایسے مت کہو ارتضیٰ...... ! میرے چاند...... اتنی سی بات پر گھر چھوڑ دو گے۔ میں تمہیں دلوا دوں گا Lums میں ایڈمیشن...... میں نے کہا نا، میں دلوا دوں گا۔ چلو آؤ یہاں بیٹھو۔''

وہ اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا تھا۔ کافی منت سماجت کے بعد ارتضیٰ نے ان دونوں پر احسانِ عظیم کرتے ہوئے گھر سے جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔



''ہیلو! جی میں مسلم پورہ تھانے سے بول رہا ہوں، یہ بات کر لیں۔'' رات کے اڑھائی بجے تھے جب فون کی گھنٹی بجی۔ فون نسرین نے اٹھایا تھا۔

''مما! انہوں نے مجھے اریسٹ کر لیا ہے۔ مجھے یہاں سے چھڑوائیں...... میرے سب......'' ارتضیٰ کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ریسیور اس سے چھین لیا گیا۔

''بی بی! آپ کا بیٹا لڑکیوں کو چھیڑتا پکڑا گیا ہے۔ آپ کسی مرد کو تھانے بھجوا دیں۔''

اتنا کہہ کر فون کھٹاک سے بند ہو گیا۔ نسرین نے ہمت مجتمع کر کے مرتضیٰ کو جگایا تھا۔

ارتضیٰ انہیں کمبائن اسٹڈی کا کہہ کر گیا تھا اور صبح واپس آنا تھا اسے مگر اب اس فون نے انہیں دہلا کر رکھ دیا۔ مرتضیٰ نے اٹھ کر اِدھر اُدھر فون کیے۔ پھر تھانے پہنچا تو ارتضیٰ حوالات میں بند تھا۔ صبح کے چھ بج رہے تھے۔ تھانے کا عملہ بھی اونگھنے میں مصروف تھا، ایس ایچ او نے اسے دیکھ کر ناک چڑھاتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مرتضیٰ نے کبھی ایسے حالات کا سامنا نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ ہی ایک فیئر زندگی گزاری تھی اس نے اور اب اولاد کی وجہ سے اسے کیسی ذلت اور خواری کا سامنا تھا۔ ایس ایچ او ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد وہ مرتضیٰ کو پہچان گیا تھا۔

''آپ ایکٹنگ شیکٹنگ کرتے ہو نا۔''

مرتضیٰ نے سر ہلا کر اعترافِ جرم کیا۔

''دیکھیں جی۔ آپ کا بیٹا اور اس کے دو دوست لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ خانی کر رہے تھے۔ پہلے تو یہ ایک اخلاقی جرم ہے نا جی۔ اس کی سزا الگ ہے اور پھر ہم انہیں یہاں لے آئے ہیں تو اتنی آسانی سے تو نہیں چھوڑیں گے۔ سویرے سویرے گھما پھرا کر بات نہیں ہوتی مجھ سے۔ کیا نام بتایا آپ نے اپنا...... پانچ لاکھ دے دیں تو ابھی چھوڑ دیتا ہوں۔ ورنہ کیس تو لمبا ہے۔''

اس نے بہت اطمینان سے مطالبہ دہرایا تھا۔ مرتضیٰ پریشانی سے پہلے ہی اَدھ موا ہوا جا رہا تھا۔ اس بات پر تو اس کے ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے۔

''پانچ لاکھ...... یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ ایسا کیا کیا ہے ارتضیٰ نے۔''

اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ یہ سوال پوچھے، لیکن دل کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔

''او جی آپ، پونے پانچ لاکھ دے دو۔ اتنے ڈرامے شرامے کرتے ہو آپ، اتنی اندھی کمائیاں ہوتی ہیں آپ لوگوں کی۔ بیٹے کی خاطر اتنا نہیں کر سکتے آپ۔''

وہ یقیناً بلیک میلنگ پر اتر آیا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ مرتضیٰ بیٹے کی خاطر اتنی رقم کا بندوبست کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ آخر اب نہ سہی کبھی تو وہ ایک پبلک فگر رہا تھا۔ مرتضیٰ کی اپروچ اتنی نہیں تھی کہ وہ کسی چاچے مامے کے ذریعے تھانے والوں پر دباؤ ڈلوا سکتا۔ اس کے کالج کے زمانے کے ساتھی بہت اچھی اچھی جگہوں پر پہنچ چکے تھے۔ لیکن مرتضیٰ کے ان سے اسے روابط نہیں تھے کہ وہ بیٹے کی رہائی کے لیے ان سے رابطہ کرتا اور پھر یہ بات اتنی شرمندگی والی تھی کہ وہ کسی اپنے سے نہیں کر سکتا تھا۔ دوست تو پھر بیگانے تھے۔ کافی دیر تک ایس ایچ او سے بحث کے بعد معاملہ تین لاکھ میں طے ہو گیا۔

ایس ایچ او نے تاکید کی تھی، تین لاکھ اگرچہ اتنی بڑی رقم نہیں تھی، لیکن زندگی انہیں جن حالات تک لے آئی تھی وہاں تین لاکھ بہت بڑی رقم لگ رہی تھی۔ یہ اس کے لیے ایک اور کارِ دشوار تھا۔ مکان گروی، دکان نئی اور بینک بیلنس صفر تھا۔ نسرین نے اپنی سارے زیورات لا کر میز پر ڈھیر کر دیئے جو تقریباً ڈیڑھ لاکھ مالیت کے تھے، اونے پونے بیچنے کے باعث ان کا تقریباً ایک لاکھ مل ہی گیا تھا۔ شرمندگی کے احساس سے چُور چُور وہ جن لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا سکتا تھا پھیلا دیئے، مگر مانگنے کے اس بدترین عمل کے باوجود وہ دوپہر تک تین لاکھ اکٹھے نہیں کر پایا تھا۔ پچھتر ہزار ابھی بھی کم تھے۔ کاروباری حلقے میں سب جانتے تھے کہ وہ کنگال ہو چکا ہے اس لیے اسے قرض دیتے وقت سب بڑی بڑی ضمانتیں مانگ رہے تھے۔ ہر طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد اس نے ایک ساتھی اداکار کو فون کیا تھا۔ جو آج کل کمرشل تھیٹر سے وابستہ تھا۔

''میرے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آنی ہے بھٹی صاحب! آپ ایسا کریں آپ انتظار کریں، میں طاہر ملک سے بات کر کے آپ کو فون کرتا ہوں۔'' اسے تسلی دی گئی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد اس دوست کے بجائے خود طاہر ملک نے فون کیا تھا۔

''کیسے ہیں آپ بھٹی صاحب! مجھے خود فون کر لیا ہوتا۔ آپ نے ہمیں چھوڑا تھا، ہم تو آج بھی آپ کے منتظر ہیں۔''

اس کی بھاری بھرکم آواز اتنے سال گزر جانے کے باوجود آج بھی ایسی ہی تھی یعنی ناقابلِ برداشت، مرتضیٰ نے پہلے کبھی اس شخص کے سامنے جھکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن آج وہ مجبور تھا اور مجبوری بڑے بڑوں کو جھاگ کی طرح بٹھا دیتی ہے۔

''پچھتر ہزار تھوڑے نہیں ہوتے۔ دوسرا حالات آج کل ادھر کچھ اچھے نہیں رہے، خود ہی آ کر تفریح کرتے ہیں۔ مجرے دیکھتے ہیں اور خود ہی چھاپے پڑوا دیتے ہیں۔ آپ خود سوچیں، ایسے حالات میں بھی ڈٹ کر کام کرتے رہنا جہاد کے برابر ہے کہ نہیں۔''

مرتضیٰ کا دل چاہا اسے بڑی سی گالی دے، مگر وہی مجبوری جس کا نام ارتضیٰ تھا۔

''خیر، یہ باتیں تو ہم بعد میں بھی کر سکتے ہیں۔ اس وقت آپ کو جلدی ہو گی۔ ایسا کریں۔ آپ میرے آفس آ جائیں۔ الحمرا والے آفس، باقی باتیں ہم بیٹھ کر طے کر لیتے ہیں۔ پچھتر ہزار کیش آپ کو مل جائے گا۔''

طاہر ملک کی باتوں سے اس کے ارادوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ پچھتر ہزار کیش فراہم کر کے اس نے مرتضیٰ کو چھ ماہ کے لیے اپنی پروڈکشنز میں کام کرنے کا پابند کیا تھا۔

"اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔ آپ کو تو پہلے بھی انتہائی شریفانہ جملوں پر اعتراض ہوا کرتا تھا۔ اب اس سے کہیں زیادہ کھلے جملے بولنے پڑتے ہیں۔ رقص کی اناؤنسمنٹ بھی کرنا ہوتی ہے۔ عوامی تفریح کا پورا خیال رکھتے ہیں ہم۔ آپ سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لیں۔ بعد میں بلاوجہ کی بحث سے مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔"

پچھتر ہزار کی رقم اس کے سامنے میز پر رکھ کر وہ بہت معصومیت سے کہہ رہا تھا۔ مرتضٰی نے منہ سے کچھ کہے بغیر اگریمنٹ پر سائن کر دیئے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی رہی ہوتی تو وہ اس کے پاس آتا ہی کیوں۔



کچھ سال پہلے اس نے جس گندگی سے دامن چھڑا لیا تھا۔ ایک بار پھر اسے اسی گندگی میں قدم رکھنا پڑا تھا۔ پہلے ہی ڈرامہ میں اسے "ہیجڑے" کا رول دیا گیا۔ اس ذلت آمیز کام کے لیے اسے مکمل کاسٹیوم فراہم کیا گیا تھا۔ جسے دیکھ کر مرتضٰی شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

وہ کتنی ہی دیر چست بھڑکیلے لباس اور دوسری چیزوں کو دیکھتا رہا، اس نے لباس پہننے سے پہلے میک اَپ مین سے بہت کھرچ کھرچ کر شیو بنوائی تھی۔ اس ڈرامہ کے لیے اس نے مونچھیں صاف کروا دی تھیں۔ وہ "ہیجڑا" بن رہا تھا لیکن اسے عورت نظر آنے کی ہر ممکن کوشش کرنی تھی۔ لباس چڑھانے کے بعد اس کا میک اَپ شروع ہوا تھا۔ اس کے ریگستان کی بھوری مٹی جیسے گالوں پر خوب غازہ ملا گیا تھا۔ اس کی بے جان شکوہ کناں آنکھوں کے اندر باہر رنگوں کی تہہ بچھائی گئی تھی۔ اور پھر ہونٹوں پر لپ اسٹک کی موٹی تہہ جما دی گئی۔

ان سب چیزوں کے ساتھ جب اس نے اسٹیج پر انٹری دی تو وہ واقعی اندر سے مر چکا تھا۔ جو ڈائیلاگز اسے بولنے تھے، وہ اس کے لباس کی طرح "بے لباسی" والا تاثر ہی لیے ہوئے تھے۔ وہ اس روز ذلت کی انتہا سے گزرا۔ سب سے بری بات رقص کے نام پر وہ مجرا تھا۔ جو ہر بیس منٹ بعد ان چیپ ڈائیلاگز کے درمیان زرق برق عجیب و غریب لباس پہنے کوئی نہ کوئی لڑکی آ کر پیش کر دیتی۔ اس دوران زیادہ تر مرتضٰی کو اسٹیج پر پڑے صوفے پر بیٹھ کر اس "مجرے" کو انجوائے کرنے کا تاثر پیش کرنا تھا۔ یہ کام سب کاموں سے مشکل تھا۔ اس رقاصہ کے چہرے اور جسم کے زاویوں پر نگاہ ڈالنا اس کی آنکھوں میں چھپے گندے پیغامات کو اگنور کرنا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ رکھنا۔ اسے مرنے کے برابر لگ رہا تھا۔ وہ فقط فرش کو ہی گھورتا رہا، سامنے ہال کی جانب دیکھتا رہا جو کھچا کھچ بھرا تھا۔ یہی تو سب سے بڑا المیہ تھا کہ ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ چھوٹے بڑے، دبلے پتلے، گورے سانولے، مرد ہی مرد اس ہال میں کیا کرنے آئے تھے۔ وہ ان چیپ جملوں کو بے حد انجوائے کر رہے تھے۔ جو مرتضٰی اور دوسرے اداکار اسٹیج پر بول رہے تھے اور رقص میں تو ان کی جان اٹکی تھی۔

عورت کو اسٹیج پر اس طرح رقص کرتے دیکھ کر وہ سیٹیاں بجا رہے تھے، گندے جملے کس رہے تھے اور نوٹ بھی برسا رہے تھے۔

یہ المیہ نہیں تو اور کیا ہے۔ کہ لوگ واقعی ہنس رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے خوش ہو رہے تھے۔

"یہ آدم زاد کون ہیں؟"

ایسی گھٹیا چیزوں میں "یہ" دلچسپی لے سکتے ہیں، لے سکتے ہیں تو کیسے؟

کیا واقعی "یہ" اپنے دکھوں کا مداوا ان مجروں اور فحش جملوں میں ڈھونڈنے یہاں آتے ہیں؟

یہ رقم جو طوائفوں پر لٹائی جا رہی ہے، کسی بھوکے کا پیٹ نہیں بھر سکتی تھی؟

کیا کسی کی چادر اُتارنے کا نشہ کسی کو چادر پہنانے کے نشے سے زیادہ ہوتا ہے؟

کیا ایسے لوگوں کے جسموں میں روحیں ہوتی ہیں؟ اگر ہوتی ہیں تو ان روحوں کی سیاہی کیا عام سیاہی جیسی ہوتی ہے؟

اپنے سامنے تھرکتے ہوئے لاشے کو دیکھتے ہوئے وہ نہ جانے کیا کیا سوچتا جا رہا تھا، رقص ختم ہوتے ہی ایک بار پھر اسے ایک تکلیف دہ عمل سے گزرنا تھا۔ اسے خود میں اور چارے میں کوئی فرق نہیں لگ رہا تھا۔ وہ وہی تکلیف محسوس کر رہا تھا جو چارا ٹوکے سے گزرنے میں کرتا ہوگا۔

ڈرامہ ختم ہوا تو وہ سب کے ساتھ گرین روم میں آ گیا۔ پہلی بار اسے انسانی چہروں سے گھن محسوس ہوئی لیکن یہ احساسات گرین روم میں بیٹھے لوگوں کے لیے نہیں تھے بلکہ ہال میں بیٹھے لوگوں کے لیے تھے۔

دوسرے شو کے شروع ہونے میں ابھی ساڑھے تین گھنٹے باقی تھے۔ سب تیزی سے میک اَپ صاف کرنے، کپڑے بدلنے یا طاہر ملک کے ساتھ پیسوں کے لیے جھگڑنے میں مصروف تھے۔ ایک وہ تھا جو اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اس نے سر سے وگ اتارنے کے علاوہ اپنے اصل حلیے میں واپس آنے کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ اسے تینوں شو ختم ہونے کے بعد ہی گھر جانا تھا۔ بھوک اسے لگ نہیں رہی تھی۔ پیسے وہ پہلے ہی لے چکا تھا۔ سو اب ہاتھ جھاڑ کے بیٹھنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ اسی دوران ایک موٹی بھدی سی عورت اس کے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھی۔ اس کی آنکھیں بھیگی بھیگی سی تھیں۔ مرتضٰی کو وہاں موجود کسی انسان سے دلچسپی نہیں تھی مگر اس عورت کے وجود پر چھائی تھکن اسے اس کی جانب متوجہ کر گئی تھی۔

"ہمیں انسان نہیں...... سمجھتے ہیں۔" وہ ایک موٹی سی گالی دے کر بولی تھی۔

"کیا ہوا؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

"آپ کیوں پوچھ رہے ہو جی...... آپ کیا کر سکتے ہو...... خاموش بیٹھے رہو آپ...... میرا دماغ پہلے ہی خراب ہے۔" وہ تڑخ کر بولی۔ مرتضٰی شرمندہ ہوئے بغیر سامنے دیکھنے لگا۔ وہ پہلے ہی اتنا شرمندہ ہو چکا تھا کہ اب اس کے اندر شرمندگی پیدا کرنے والے خلیے ہی ختم ہو گئے تھے۔

"آپ مجھے ایک بات بتائیں...... اِدھر دیکھیں ذرا...... میری طرف...... آپ کو لگتا ہے میں اس...... کی طرح ناچ سکتی ہوں...... اسٹیج پر۔"

اس نے خالی جگہ پر پھر ایک موٹی گالی استعمال کی تھی۔

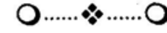
"میرا چھوٹا بچہ ہسپتال میں ہے...... مجھے پانچ ہزار...... نہیں دے رہا کمینہ۔ کہتا ہے ایک بار اسٹیج پر ناچ کر دکھاؤ۔ کوئی حاجی ہے جو اس ملک کا گہرا دوست ہے اور ہر ڈرامہ دیکھنے آتا ہے...... ہر عورت کو دیکھ کر رال ٹپکنے لگتی ہے اس کی...... طاہر نے اور اس نے شرط لگائی ہے کہ میں اسٹیج پر ناچ سکتی ہوں یا نہیں...... اب آپ بتاؤ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ مجبوریوں نے تو ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیا ہے...... اس کی بات مانوں تو پانچ ہزار دے گا، ورنہ نہیں۔ آپ یقین کرو چاچا جی...... میں بری عورت نہیں ہوں...... میں باقی سب کی طرح علاقہ غیر کی نہیں ہوں جی!"

وہ بات کرتے کرتے رونے لگی تھی۔ "علاقہ غیر" وہ کس جگہ کو کہہ رہی تھی۔ مرتضٰی کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ کہیں سے پانچ ہزار لا کر اس عورت کے ہاتھ پر رکھ دے جو عمر میں بڑی ہونے کے باوجود اس کو چاچا کہہ رہی تھی۔ افسوس اس بات کا تھا کہ اس کے پاس اتنے روپے تھے ہی نہیں۔

دوسرے شو میں مرتضٰی نے اس بے ہنگم عورت کو اسٹیج پر ناچتے دیکھا۔ وہ "ناچ" کے نام پر عجیب و غریب حرکتیں کر رہی

تھی اور ہال میں بیٹھے شائقین نے قہقہے لگا لگا کر چھت پھاڑ رکھی تھی جب کہ اسٹیج پر مرتضٰی کے علاوہ تین مزید اداکار موجود تھے۔ مرتضٰی نے ان سب کی آنکھوں میں تاسف کی پرچھائیاں دیکھیں۔ وہ سب یقیناً اس ''عورت'' کے حالات سے واقف تھے۔ تب ہی اس کے دکھ کو محسوس کرکے دکھی ہو رہے تھے۔

مرتضٰی پہلے اپنے دکھ پر پریشان تھا اور اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس سے زیادہ دکھی لوگ بھی اس فیلڈ میں خوار ہو رہے ہیں۔



''کھانا کھائیں گے؟'' نسرین نے نظریں جھکائے بے حد امید بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔ مرتضٰی کے جھکے کندھے، مایوس آنکھیں اور سب سے بڑھ کر کلین شیوڈ چہرہ اسے ہر کہانی کی تفصیل سمجھا رہا تھا۔ وہ لاؤنج میں بھی نہیں بیٹھا تھا بلکہ سیدھا بیڈروم میں چلا آیا تھا اور اب بیڈروم میں بھی وہ بستر پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں کبھی کبھی سامنے دیوار کی جانب اٹھتی تھیں اور پھر جھک جاتی تھیں۔ دیوار پر ایک آرٹ پیس نمایاں تھا جس پر سورۃ رحمٰن کی آیت لکھی تھی۔ وہ اس آیت کو دیکھتا تھا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر نظریں جھکا لیتا تھا۔

''چائے بنا لاؤں؟'' نسرین نے بے حد آزردہ ہو کر اس کی حالت دیکھی تھی۔ اسے اس شخص سے محبت تھی، اب سے نہیں، بہت بچپن سے، تب سے جب اس شخص کی ہر ادا میں بجلیاں بھری ہوتی تھیں۔ قسمت نے اس شخص کو کہاں لا کھڑا کیا تھا۔ وہ اس کی جانب دیکھتی رہی پھر آنکھوں میں آئی نمی کو چھپانے کی خاطر اٹھ کر باہر چل دی۔

''نسرین! میرے پاس بیٹھ جاؤ...... مت جاؤ خدا کے لیے۔'' وہ دروازے کے قریب پہنچی تھی کہ لجاجت بھری آواز سنائی دی۔ وہ تڑپ کر مڑی اور مرتضٰی کے قریب چلی آئی۔

''میں کہیں نہیں جا رہی...... مگر آپ ایسے مت بیٹھیں...... میرے دل کو ہول اٹھتے ہیں۔'' وہ اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی تھی۔ مرتضٰی نے بس ایک نظر اس کی جانب دیکھا تھا پھر دوبارہ سے نظریں جھکا کر اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھنے لگا۔

''وہ سب بہت مشکل ہے...... اتنا مشکل...... کہ میں...... تمہیں بتا نہیں سکتا...... دیکھو انہوں نے...... میرا کیا حال کر دیا...... دیکھو میرا...... چہرہ...... میری جانب دیکھو نسرین......'' وہ بولتا بولتا یک دم اس کی جانب مڑا تھا۔

''کیا میں ویسا ہی لگتا ہوں...... جیسا صبح گھر سے نکلنے سے پہلے...... لگ رہا تھا...... نہیں نا...... اب...... میرا چہرہ مسخ ہو گیا ہو گا...... میں بہت ذلت سے گزر کر آیا ہوں...... بہت ذلت ہے...... نسرین...... بہت ذلت ہے...... مجھے مرد نہیں رہنے دیا انہوں نے...... مجھے کتا بنا دیا ہے...... تم میرے ساتھ رہ لوگی نا...... ایک کتے کے ساتھ رہنا...... بہت ذلت آمیز ہے۔''

وہ ہوش کی دنیا سے کہیں بہت آگے نکلا ہوا لگ رہا تھا۔ نسرین نے اس کے سرد ہوتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور انہیں گرم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا دل پہلے ہی بوجھل تھا۔ مرتضٰی کی واپسی ساڑھے تین بجے ہوئی تھی اور ساڑھے تین بجے تک وہ آیت کریمہ کی تسبیح کرتی جلے پیر کی بلی کی طرح لان میں ٹہلتی رہی تھی۔

''ایسی باتیں مت کرو...... سب ٹھیک ہو جائے گا...... اللہ اپنے بندوں کو اتنا نہیں آزماتا۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بہت ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔

اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکنے لگے تھے اور اس کے ہاتھوں کی گرفت نسرین کے ہاتھوں پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ وہ

نسرین کی جانب دیکھنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔

''مجھے عورتوں کے جیسے کپڑے پہننے کو دیئے...... مجھے بہت شرم آ رہی تھی...... میرے گالوں، آنکھوں اور ہونٹوں پر اتنی سرخی لگا دی...... مجھے روز یہی سب کرنا پڑے گا۔ ہر روز میں...... یہی کام کروں گا...... یہی گندا کام...... تم میرے لیے دعا...... میرے لیے دعا کرو......''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ نسرین نے اس کے گرد اپنے بازو حمائل کیے اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ اتنا زیادہ رو رہا تھا کہ ایک منٹ بعد ہی نسرین کا دوپٹہ بھیگ گیا تھا۔ نسرین بھی اس کے ساتھ رونے لگی تھی۔



مجبوری کا نشہ، ہوش نہیں کرتا، مایوس کر دیتا ہے اور مایوسی انسان کو موت کی طرح بے حس کر دیتی ہے۔ وہ بھی بے حس ہو گیا تھا۔ حالات کی چکی نے پیس پیس کر اسے آٹا بنا ڈالا تھا۔

وہ اپنے آپ سے اس قدر لاپروا ہو چکا تھا کہ کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ پہلے کی طرح کسی چیز میں گرم جوشی سے حصہ لینا تو اسے بھول چکا تھا۔ گاؤں سے کوئی رشتہ دار ملنے کے لیے آ جاتا تو بیٹھا خاموشی سے اسے تکتا رہتا۔ مہمان بے چارا خود ہی بول کر تھک جاتا اور واپس چلا جاتا۔ طاہر ملک اسے مسلسل ڈراموں میں کام دے رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک اسے ہر ڈرامہ میں ہیجڑہ یا اسی ٹائپ کا ''کچھ'' بننا پڑتا۔ اسی پر کیا موقوف، اسٹیج کی دنیا میں زیادہ تر اداکاروں کو ایسے ہی گھٹیا کردار نبھانے پڑ رہے تھے جو اداکار اثر و رسوخ والے تھے، وہ تو بچ جاتے تھے لیکن چھوٹے اور مجبور فنکار واقعی مجبوریوں کے بندھن میں بندھے تھے۔ جس ہفتے مرتضٰی کے شوز چل رہے ہوتے، ان دونوں اس کی حالت لیبر پین میں مبتلا عورت کے جیسی ہو جاتی۔ آنکھوں میں موت رقصاں نظر آتی اور ہونٹوں پر جامد خاموشی جب کہ جسم کے باقی اعضاء حالت سجدہ میں گڑگڑاتے محسوس ہوتے تھے۔ جب وہ گھر واپس آتا تو نسرین کا دل چاہتا واقعی اسے دل کے کسی کونے میں چھپا لے۔

ارتضٰی کے معمولات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے تھے۔ حوالات کا چکر لگا لینے کے بعد وہ پہلے سے زیادہ ڈھیٹ ہو گیا تھا۔ وہ اس چیز کو ایڈونچر قرار دیتا تھا۔ اسے اس بات کی کوئی شرمندگی نہیں تھی کہ اس کے باپ نے اپنی روح کو رہن رکھ کر اسے حوالات سے چھڑوایا تھا۔ وہ ابھی بھی مرتضٰی کے ساتھ پیسوں کے لیے بحث کرتا اور پھر طعنوں اور گالی گلوچ پر اتر آتا۔ ''میرا باپ...... ڈرامے باز...... ایک ناکام آدمی ہے...... اگر کسی کے گھر پیدا ہونے میں انسان کا اپنا اختیار ہوتا تو میں کبھی اس شخص کے گھر پیدا نہ ہوتا۔''

وہ نسرین کے سامنے حقارت سے کہا کرتا تھا اور وہ حیرانی سے سوچتی کہ تربیت میں کمی کہاں رہ گئی تھی جب کہ وہاں تربیت میں کمی نہیں تھی بلکہ سرے سے تربیت کے آثار ہی نظر نہیں آتے تھے۔ اپنے Lums کے فرینڈز کے ساتھ وہ زندگی کو انجوائے کرنے میں لگا تھا اور دوسری جانب اس کا باپ گھل گھل کر مر رہا تھا۔

زندگی کی ڈگر وہی تھی، بس اب یہ ہوا تھا کہ مرتضٰی کے اندر امید اور حوصلہ نہیں رہا تھا۔ وہ اتنا جل کڑھ چکا تھا کہ اس کے اندر جلنے کڑھنے والا مواد ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ معاشرے کی حالت دیکھتا اور افسردہ ہو جاتا۔ اسے لگتا تھا، اس کی اس حالت کا ذمہ دار کسی نہ کسی طرح یہ معاشرہ بھی ہے۔

لوگ جوق در جوق ان ڈراموں کو دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ خواتین کے بیٹھنے کا الگ انتظام ہوتا تھا اور وہ حیرانی سے دیکھتا رہ جاتا کہ بہت سی عورتیں بھی ایسی چیزوں کی شوقین تھیں۔ ڈراموں کی آڑ میں جو کچھ ہو رہا تھا، لاتعداد لوگ اس کو دیکھنے

آتے تھے۔ وہ لوگ جو روپے خرچ کر کے ہال میں یہ سب دیکھنے آتے تھے "فقط دیکھنے" سے ان کے نفس کا پیٹ نہیں بھرتا تھا، اس لیے وہ ٹھونک بجا کر دیکھنا چاہتے تھے۔ سو "یہ" انتظام الگ تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے عورتوں کو ذلیل ہوتے اور عزت دار لوگوں کو انہیں ذلیل کرتے دیکھتا اور پھر بے حسی کا لبادہ اوڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے کام میں لگ جاتا۔

ایک عجیب سی صورتِ حال تھی جو اسے ہر گزرتے دن کے ساتھ تھکاتی جا رہی تھی۔ وہ سب کام جو مخصوص علاقوں میں ہوا کرتے تھے، وہ ہی کام اسٹیج کی آڑ میں کھلم کھلا ہو رہے تھے۔ اس کے پورے خاندان میں کبھی کسی نے لائیو مجرا نہیں دیکھا ہو گا جب کہ وہ یہ سب دیکھتا اور پھر اپنی تمام حسیات کے مردہ ہو جانے کی دعا کرنے لگتا۔

اس روز اس نے ایک طوائف کو اپنی سترہ سالہ بیٹی کے دام کھرے کرتے دیکھا اور یہ دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کو خریدنے والا اس کا کالج فیلو طلحہ نیازی تھا۔ طلحہ نیازی میانوالی میں کتنی اچھی پوسٹ پر کام کر رہا تھا، یہ کسی سے بھی ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ اس نے خوشبوؤں کی طرح مہکتے اس شخص کو ایک طوائف کا سودا کرتے دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

جن دنوں وہ اپنی مرضی سے اسٹیج کر رہا تھا، ان دنوں طلحہ نیازی اسے بہت بری طرح اگنور کرنے لگا تھا اور ایک بار اس نے اعتراف بھی کیا تھا کہ وہ اسٹیج پر اس قسم کے گھٹیا کام کرنے والے سے دوستی کیا، سلام دعا بھی نہیں رکھنا چاہتا۔ اس کا اشارہ "ایکٹنگ" کی طرف تھا اور اب جو کچھ وہ خود کر رہا تھا، اس کے لیے پتا نہیں اس نے کوئی سزا مقرر بھی کی تھی یا نہیں۔

وہ طلحہ نیازی کو وہاں دیکھ کر اتنا بے چین ہوا کہ گرین روم سے اٹھ کر میک اَپ روم میں آ گیا کیونکہ وہاں بے حد رش لگا تھا اور وہ کچھ لمحے صرف اپنے ساتھ گزارنا چاہتا تھا اسے بیٹھے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ رانا اکمل بھی ادھر آ گیا۔ رانا اکمل گورا چٹا اور بہت دبلا سا لڑکا تھا۔ وہ "عورت" کے گیٹ اَپ میں ہی تھا۔

"بھٹی صاحب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی مصنوعی پلکیں اتارتے ہوئے اس سے سوال کر رہا تھا۔

"عاقبت بگڑ چکی ہے، باقی تو سب خیریت ہے۔" مرتضیٰ کے منہ سے پھسلا تھا۔ اکمل نے آئینے میں سے ہی اس کی جانب دیکھا اور بہت غور سے دیکھا۔ پلکیں اتار کر اب وہ جیولری اتار رہا تھا۔

"آپ نے یہ سب کچھ دل سے قبول نہیں کیا...... ہے نا؟" دونوں بازوؤں سے وہ کانچ کی سرخ چوڑیاں اتار رہا تھا۔ کانچ کی چوڑیوں کے آپس میں ٹکرانے سے جلترنگ سی پیدا ہو رہی تھی۔ کسی کو اتنی خوبصورت آواز سے نفرت ہو سکتی ہے...... شاید ہی...... لیکن مرتضیٰ کو تھی۔

"تم نے کر لیا ہے؟" اس کے سوال کا جواب دیئے بغیر مرتضیٰ نے پوچھا۔ وہ اب جھمکے کانوں سے چھڑا رہا تھا۔

"میرا دل ہی مر چکا ہے...... مجھ سے آپ کیا پوچھتے ہیں...... دل نہیں مرتا تو میرے چھوٹے چھوٹے بچے بھوک سے مر جاتے...... اب میں کچھ نہیں سوچتا...... جب شروع میں یہاں آیا تھا تو گھر واپس جا کر خوب روتا تھا...... واش روم میں گھس جاتا...... پانی کا نلکا کھول دیتا اور پھر دھاڑیں مار کر روتا...... میری بیوی سمجھتی ہے، یہ بہت عزت والا کام ہے...... بہت پرہیز گار عورت ہے...... مجھے اس حلیے میں دیکھ لیا تو وہیں پھڑک کر مر جائے گی...... اس کے پاس جاتا ہوں تو شرمندگی سے نظریں نہیں اٹھا پاتا...... لیکن کیا کروں...... مجھے اس کام کے علاوہ کچھ بھی نہیں آتا...... زیادہ پڑھنے لکھنے کا شوق بھی نہیں تھا، بچپن سے ہی بس نقلیں شقلیں کرتا رہتا...... پہلے پہل بہت اچھا کام مل جاتا تھا۔ جس میں روح بھی خوش رہتی تھی اور دل بھی...... اب تو نہ جانے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ جس ڈرامے میں ایسے ویسے ڈائیلاگز نہ ہوں تو ہال سے فرمائشیں آنے لگتی ہیں۔

یہ سارے نام نہاد عزت دار لوگ اگر واقعی تفریح کی خاطر یہاں آتے ہیں تو ہم یہاں کیا جھک مار رہے ہیں۔ ہر ڈرامہ میں اس امید پر پکڑتا ہوں کہ شاید اب کی بار مجھے یہ سب نہ کرنا پڑے مگر ہر بار مایوسی ہوتی ہے۔ ہر بار ماں بہنوں کی گالیاں، گندے لطیفے اور گھٹیا حرکتیں...... بھٹی صاحب آپ خود بتائیں، ہم یہ سب کیوں کرتے ہیں۔ یہ لوگ، یہ نام نہاد عزت دار لوگ ان چیزوں کو انجوائے کرتے ہیں تو طاہر ملک جیسے لوگ دھڑا دھڑ ایسی چیزیں پروڈیوس کر رہے ہیں۔ میرا ایک بھائی ہے، اس کی سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز کی دکان ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اسٹیج والے مجروں کی سی ڈیز اتنی بکتی ہیں کہ بس...... کیبل والے خریدتے ہیں اور پھر جب دل چاہتا ہے لگا دیتے ہیں...... یہ ہے ہمارا معاشرہ بھٹی صاحب! یہاں چینی مہنگی مگر عیاشی سستی ہے۔ لوگ بھیک مانگ کر گزارا کرتے ہیں مگر ہر گھر میں کیبل ضرور موجود ہے۔ موبائل ٹیکنالوجی سستی ہے اور آٹا دالیں مہنگی......

اللہ قسم میں یہ نہیں کہتا کہ ہم اچھے لوگ ہیں مگر وہ لوگ جو یہ سب دیکھنے آتے ہیں، وہ ہم سے زیادہ گندے ہیں...... بھٹی صاحب! یہ لوگ اچھے ہو جائیں تو ہم کیوں اپنی روحوں کو ذلیل کریں...... دھڑا دھڑ ڈرامے ہو رہے ہیں، ریکارڈنگز ہو رہی ہیں، سینما ہاؤسز تیزی سے تھیٹرز میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ پروڈیوسرز اپنی ٹیمیں لے کر چھوٹے شہروں میں جا رہے ہیں، مجرے پلس لچر بے ہودہ گفتگو سے بھرتے تماشے پیش کیے جا رہے ہیں۔ یہ سب کیا ہے بھٹی صاحب اور یہ سب کیوں ہے۔"

وہ دونوں حلیے سے انتہائی مضحکہ خیز لگ رہے تھے لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر ہنس بھی نہیں رہے تھے، انہیں ہنسی آ کیسے سکتی تھی۔ وہ دونوں کچھ دیر اسی طرح بیٹھے رہے۔ آج دو ہی شو تھے، اس لیے درمیان میں کافی وقت تھا۔

"المیہ یہ ہے بھٹی صاحب! کہ اب ہم المیوں پہ نہیں روتے بلکہ ہنستے ہیں...... یقین نہ آئے تو اپنے آپ کا تماشا بناتے ہوئے ذرا غور سے ہال میں دیکھ لیجئے گا۔"

رانا اکمل جھکے کندھے لیے اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ مرتضیٰ نے اسے تسلی دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ گیا تھا، اسے اس کے لفظ لفظ پر یقین تھا۔ آج اس ہال میں اس کا آخری شو تھا، اس کے بعد پندرہ دن تک وہ فری تھا۔ پندرہ دن وہ اپنی دکان پہ ڈٹ کے لگانا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ طاہر ملک کا قرضہ چکانے کے بعد وہ دوبارہ کبھی اس جگہ کا رخ نہیں کرے گا۔ ارادوں میں پختگی ہو تب بھی لازم نہیں کہ وہ پورے ہو جائیں اور اگر ارادے فقط پختگی سے پورے ہوں تو پھر ان کے ٹوٹنے سے انسان خدا کو کیسے پہچانے۔

آخری شو معمول کے مطابق شروع ہوا تھا۔ ہر چیز ویسی ہی تھی جیسی ہو سکتی تھی۔

جب پہلا مجرا شروع ہوا تو وہ اسٹیج پر پڑے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ موٹی سی عورت خوب تھرک تھرک کر اپنے ہر عضو کی مدد سے سامنے بیٹھے شائقین کو لبھا رہی تھی۔ ایسے وقت میں مرتضیٰ ہال میں بیٹھے لوگوں کی جانب دیکھتا رہتا تھا۔ آج ہال میں عام دنوں سے زیادہ رش تھا کیونکہ آج اسٹوڈنٹس کچھ زیادہ ہی تھے۔ ایک منچلا گروپ زیادہ ہی ہلڑ بازی کر رہا تھا۔ مجرا پیش کرنے والی طوائف پر جو فقرے کسے جا رہے تھے، وہ بھی اسی گروپ کی سمت سے آ رہے تھے۔

رقص ختم ہوا تو ہال میں تالیاں اور سیٹیاں ایک ساتھ بجی تھیں۔ اسی گروپ کی جانب سے کسی نے کوئی فقرہ کسا تھا۔

"استغفر اللہ......" مرتضیٰ نے دل ہی دل میں توبہ کی اور ناگواری کو دل میں دباتے ہوئے اس سمت میں دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ پہاڑ لرزے تھے، نہ زمین ہلی تھی مگر زلزلہ آ گیا تھا کیونکہ وہ جس کی جانب دیکھ رہا تھا، اسے وہ بہت اچھی طرح سے پہچانتا تھا اور وہ شخص میک اَپ میں ہونے کی وجہ سے مرتضیٰ کو پہچان نہیں پایا تھا لیکن جتنے غور سے وہ مرتضیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ اس

سے پتا چلتا تھا کہ پہچان کا یہ مرحلہ چند لمحوں بعد سر ہو جائے گا۔

اس نے اپنے بائیں پہلو میں بے چینی کی عجیب لہر محسوس کی۔



''تم ہو بہو بھٹی صاحب کی کاپی ہو۔'' طاہر ملک نے اس کو سر سے لے کر پیر تک گھورتے ہوئے کہا۔ ارتضٰی خاموشی سے اس کی نظروں سے خائف اسی کی جانب دیکھتا رہا۔ اسے فون کرنے پر اس نے فوراً روپے دینے کی ہامی بھر لی تھی اور اب ٹھیک ایک گھنٹے بعد ارتضٰی اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اسے پہلے کبھی کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اپنے باپ سے مشابہت رکھتا ہے۔ اسے اپنے لمبے قد، کسرتی جسم اور گورے رنگ پر (فخر تھا) جب کہ اس کا باپ اس کے بالکل برعکس تھا۔

''مجھے بہت افسوس ہے ان کی وفات کا...... وہ ہمارا سرمایہ تھے...... بہت کمال کے ایکٹر تھے...... بہت ہی کمال کے...... حافظہ بھی غضب کا تھا...... سب سے آخر میں اسکرپٹ ان کو ملتا تھا اور سب سے پہلے یاد کر لیتے تھے۔ ان کی اداکاری پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔''

وہ ہونٹ بھینچ بھینچ کر تعزیت کی کوشش کر رہا تھا جب کہ ارتضٰی پہلو بدلنے میں مصروف تھا۔ اسے فقط کچھ رقم درکار تھی جو وہ اس شخص سے ادھار لینے کے لیے آیا تھا۔ گھر پر وہ صرف تایا مصطفٰی کو بتا کر آیا تھا۔ جنہوں نے اسے جلدی واپس آنے کے لیے کہا تھا اس نے کبھی اپنے باپ کی نصیحت برداشت نہیں کی تھی مگر اب باپ کے مرنے کے بعد وہ ہر ایک کی نصیحت کو سننے بلکہ برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''جنازہ کتنے بجے ہے؟'' طاہر ملک نے اس کی خاموشی سے اُکتا کر پوچھا۔

''نمازِ عشاء کے بعد...... پونے نو ہو جائیں گے۔'' وہ حلق میں آیا تھوک نگل کر بولا۔ اسے پہلی بار زندگی میں ہر شے سے خوف محسوس ہوا تھا۔

''ہوں...... دیکھو برخودار...... پانچ سات ہزار سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... سال پہلے کی بات ہے، ہم یہاں ایک ڈرامہ کر رہے تھے وہی ایکٹر جس کی انٹری اسٹیج پر چل رہی تھی، اس کی ماں کے مرنے کی اطلاع آ گئی۔ ہم نے فوراً دس ہزار کی رقم اپنے بندے کے ہاتھ شاہدرہ بھجوا دی اور ڈرامہ ختم ہوتے ہی اس ایکٹر کو اطلاع دی...... بے حد مشکور ہوا...... اگلا شو تین گھنٹے بعد تھا...... میں نے اسے بڑا زور لگایا کہ جا بچے ماں کا جنازہ اٹھا آ مگر آفرین ہے بھئی...... میں کہتا ہوں آفرین ہے اس بچے پر۔ کہنے لگا، نہیں ملک صاحب! رقم پہنچ گئی، اب اپنی ذمہ داری پوری کر کے جاؤں گا۔ اگلا پورا شو اس نے اتنے حوصلے سے کیا کہ ہم سب حیران رہ گئے۔ مجال ہے جو اس نے آنسو ٹپکنے دیا ہو آنکھ سے...... وہ تالیاں بجیں کہ کسی کے لیے نہ بجی ہوں گی۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس ایک بچی ہوا کرتی تھی...... اب تو خیر کام نہیں کرتی...... بوڑھی ہو گئی ہے...... ایکٹنگ تو نہیں آتی تھی اسے...... ملکہ رقص تھی...... کیا ریما ناچتی ہو گی جیسا وہ ناچتی تھی...... بڑے بڑے رئیس جیب خالی کر دیتے تھے۔ چھ ماہ پہلے کی بات ہے، وہ بھی اسٹیج پر تھی...... رقص شروع ہوا تھا ابھی...... اس کا باپ بیک اسٹیج بیٹھا پان کھا رہا تھا...... دل کا دورہ پڑ گیا...... ہسپتال لے جانا پڑا۔ وہ وہاں رقص کرتی رہی، پیچھے باپ کا کلمہ شہادت پڑھنے والا وقت ہو گیا...... اس بچی نے بھی ذمہ داری کا ثبوت دیا...... ڈرامہ پورا کیا پھر باپ کے جنازے میں گئی...... اسٹیج کی دنیا ہی ایسی ہے...... بڑی ہمت چاہیے یہاں آنے کے لیے...... وہ کون ہے اپنا شیخ زبیر...... کیا خوبصورت بات کہتا ہے انگریزی میں...... دنیا ایک اسٹیج ہے بھائی اور ہم سب اداکاری ہی تو کرتے ہیں۔''

وہ شاید شیکسپیئر کو شیخ زبیر کہہ رہا تھا۔

''شیخ زبیر بھی ایک بڑا آدمی تھا، تمہارا باپ بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ موت بڑا چھوٹا نہیں دیکھتی، اسے تو آنا ہی ہوتا ہے...... مرنا برحق ہے...... اصول ہے نا...... جو اس دنیا میں آیا، وہ مر کر ہی جائے گا...... سب ہی ایک نہ ایک دن مر جاتے ہیں...... ویسے بھٹی صاحب کو ہوا کیا تھا؟''

اسے یک دم جیسے اصل بات یاد آ گئی۔

''ہارٹ اٹیک۔'' وہ سر جھکا کر بولا۔ اس کو ڈر تھا کہ کوئی اس کی آنکھوں سے اس کے باپ کی موت کی اصل وجہ نہ جان لے۔ کسی کو پتا نہ چل جائے کہ ہارٹ اٹیک تو بہانہ ہے، بس اصل وجہ تو وہ خود تھا۔

''ہوں...... ان کی صحت ویسے پہلے سے خراب رہنے لگی تھی مگر یہ حالات نہیں تھے کہ راتوں رات کوچ کر جاتے...... ابھی ساڑھے تین بجے تو میں ان سے ملا تھا۔ گیٹ اَپ میں تھے...... میں نے ایک دو مذاق کر دیئے...... لوگ انہیں ہیجڑے کے رول میں بہت پسند کرتے تھے...... اسی کا گیٹ اَپ تھا...... میری باتیں سن کر خاموش رہتے تھے...... پہلے سے کافی کم گو ہو گئے تھے۔ مگر اسٹیج پر وہ جگتیں مارتے تھے کہ ہنس ہنس کر سارا زمانہ پیٹ پکڑ لیتا تھا۔''

اسے پھر اصل موضوع بھول گیا۔ ارتضٰی کو باپ کا گیٹ اَپ یاد آیا۔ اسے وہ باتیں یاد آئیں جو اس کے اور اس کے باپ کے درمیان ہوئی تھیں۔

''طاہر صاحب! مجھے ذرا جلدی ہے، میرا کام ذرا جلدی کر دیں پلیز۔''

وہ درخواست کر رہا تھا۔ باپ کے چلے جانے سے اسے کیسے کیسے لوگوں کے آگے ہاتھ جوڑنے پڑ رہے تھے۔

''ہم سب جلدی میں ہوتے ہیں بچے...... خیر...... نام کیا ہے تمہارا؟''

طاہر ملک کے چہرے کے تاثرات بدلے بدلے سے لگ رہے تھے۔ اس نے اپنا نام بتا دیا۔

''مجھے گھما پھرا کر بات نہیں کرنی آتی برخوردار! روپے میں دے دیتا ہوں مگر بھٹی کی موت سے میرا جو نقصان ہوا ہے، اسے کون پورا کرے گا...... کسی نہ کسی کو تو اسے پورا کرنا ہی ہے۔''

وہ ٹیبل کی دراز سے روپے نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ بہت کچھ سمجھتے ہوئے بھی ناسمجھی کے انداز میں اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ بساط ہمیشہ الٹتی نہیں ہے، کبھی کبھی وہ انسان کو الٹا دیتی ہے۔ ارتضٰی بھٹی آج تک جس زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے کھڑا تھا، وہ اس کے قدموں کے نیچے سے کھینچ لی گئی تھی۔



اس نے زندگی میں کبھی کوئی چوری نہیں کی تھی لیکن وہ اپنے گھر میں ایسے داخل ہوا تھا جیسے چور داخل ہوتے ہیں۔ اس کی توقع کے عین مطابق لاؤنج کی لائٹ آن تھی اور ارتضٰی کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے شاید گیٹ کھلنے کی آواز سن لی تھی، تب ہی وہ اس طرح سے چلانے لگا تھا۔ مرتضٰی نے لرزتے ہاتھوں سے گیٹ بند کیا اور بائیں پہلو میں ہونے والی بے چینی کو نظر انداز کر کے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا لان عبور کرنے لگا۔ رات کافی سے زیادہ گزر چکی تھی، تب ہی چاند کی جولانی عروج پر تھی۔ روشنی ہوتے ہی اس کا سحر ختم ہو جانا تھا، اس لیے وہ اپنی تمام تر روشنی اس لمحے دنیا پر نچھاور کر دینا چاہتا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس میں رات کی رانی کی مہک شامل تھی۔ ان سب چیزوں کے ساتھ ارتضٰی کی آواز بھی تھی جو اس کے سُست قدموں کو مزید سُست کر رہی تھی۔

''میرا دل چاہتا ہے، میں مر جاؤں...... اس گھر میں نہ رہوں، اس دنیا میں نہ رہوں، اس شخص کے سامنے نہ رہوں۔''

مرتضیٰ نے لاؤنج کے جالی والے دروازے سے اندر کی جانب دیکھا۔

''تم آرام سے بیٹھ کر میری بات کیوں نہیں سن لیتے...... تمہارا باپ پہلے ہی بہت پریشان ہے، خدا کے لیے اسے مزید پریشان مت کرنا۔ میں تمہیں سب بتا دیتی ہوں۔'' نسرین اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''وہ پیدائشی پریشان ہیں، میں نے انہیں کبھی پُرسکون نہیں دیکھا...... جن لوگوں کو پریشان ہونے کا شوق ہو، وہ پھر پریشان ہی رہتے ہیں...... ڈرامہ باز ہیں وہ، آپ کے میرے سامنے ڈرامے کرتے ہیں...... وہاں ہال میں آپ دیکھتیں انہیں...... مما...... میں آپ کو کیسے بتاؤں...... وہ کیا لگ رہے تھے...... آپ انہیں دیکھ لیتیں تو واقعی شرم سے مر جاتیں۔''

مرتضیٰ چلانے لگا تھا۔ نسرین نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ مرتضیٰ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ قیامت تب تک قیامت رہتی ہے، جب تک سامنے نہ آ جائے۔ ارتضیٰ نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی جانب دیکھا وہ نظریں چراتا اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا تھا مگر ارتضیٰ نے اسے روک لیا۔

''میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو...... تم جو سوچتے ہو...... مجھے جیسا بھی سمجھتے ہو...... میں ویسا ہی ہوں...... بالکل ویسا...... میں اچھا انسان نہیں ہوں...... تم ٹھیک کہتے ہو، میں واقعی ڈرامہ باز ہوں...... میں بہت تھکا ہوا ہوں...... مجھے سو لینے دو...... مجھے آج کی رات سو لینے دو...... میں صبح تم سے تفصیلی بات کر لوں گا۔''

وہ بہت لجاجت بھرے لہجے میں بولا تھا۔ ارتضیٰ کو پتنگے لگ گئے۔

''تم واقعی اچھے انسان نہیں ہو...... تم ایک نفسیاتی کیس ہو...... ایسا کرنے سے نہ جانے تمہاری کون سی حس کو تسکین ملتی ہے...... مما! آپ اس شخص کی ڈھٹائی دیکھیں...... کتنے آرام سے اعتراف کر لیا کہ میں ایک ڈرامہ باز ہوں...... یہ ہمارے سامنے ہمیشہ معصوم بن جاتا ہے...... غلط کام کرو گے تو تھکن ہو گی۔''

اس کا اندازِ تخاطب اس قدر بدلا ہوا تھا کہ نسرین کو ٹوکنا پڑا۔

''اپنے بابا سے اس لہجے میں بات مت کرو ارتضیٰ!''

''نہیں ہے یہ میرا باپ...... باپ ایسے نہیں ہوتے...... جنہیں اپنی عزت کا خیال ہو نہ اولاد کی عزت کا...... انہوں نے مجھے ہمیشہ ذلیل کروایا ہے...... ہمیشہ...... ان کی وجہ سے میں لوگوں سے ملنے سے کتراتا ہوں کہ کہیں کوئی یہ نہ پوچھ لے کہ میرا باپ کیا کرتا ہے۔ اچھا بھلا میں مطمئن تھا کہ دکانداری میں لگ گئے ہیں مگر جن کے دماغ خراب ہو جائیں، انہیں عزت راس نہیں آتی...... یہ کسی عزت کے مستحق نہیں ہیں۔''

مرتضیٰ نے یک دم سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا پھر وہ نسرین کو دیکھنے لگا۔

''اس سے پوچھو، یہ وہاں کیا کر رہا تھا؟'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے نسرین سے کہا۔

''میں وہاں تمہارا جنازہ پڑھ رہا تھا...... یہی سننا چاہتے تھے نا...... میرا دل چاہتا ہے، میں مر جاؤں یا تم مر جاؤ تاکہ ہم دوبارہ کبھی ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھ سکیں...... کبھی بھی نہیں۔''

وہ اب بھی چلا کر بولا تھا۔ مرتضیٰ نے مدد طلب نظروں سے نسرین کی جانب دیکھا۔

''مجھ سے پوچھو، یہ وہاں کیا کر رہا تھا...... یہ وہاں پیسے کما رہا تھا...... اس لیے نہیں کہ اسے پیسہ اپنے لیے چاہیے بلکہ اس لیے کہ وہ تمہاری کسی بات کو رد کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ تمہارے لیے پیسہ بنا رہا تھا وہ وہاں......''

''بھٹی صاحب پیسہ کے لیے یہ سب نہیں کرتے...... کوئی پیسہ کے لیے اس غلاظت میں نہیں اتر سکتا، کوئی پیسہ کے لیے یہ گھٹیا کام نہیں کر سکتا...... کوئی پیسہ کے لیے اپنا تماشا نہیں بنوا سکتا۔''

''بنوا سکتا ہے...... اولاد کی خاطر انسان بہت کچھ بنوا سکتا ہے...... میں تمہاری خاطر اپنی کھال کی جوتیاں بنوا سکتا ہوں۔'' مرتضیٰ کسی کی جانب دیکھے بغیر بولا تھا۔

''یہ دیکھیں......'' ارتضیٰ نے آگے ہو کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

''یہ میرے جڑے ہوئے ہاتھ دیکھیں اور معاف کریں مجھے...... میری خاطر کچھ نہیں کیا آپ نے...... میرے دوست! مجھے وہاں زبردستی نہ لے جاتے تو شاید مجھے کبھی آپ کے کرتوتوں کا پتہ نہ چلتا۔ میرا ایک ایڈونچر آپ کی ذات کو میرے سامنے بالکل عیاں کر گیا ہے۔ آپ چلے جائیں میرے سامنے سے......''

مرتضیٰ نے ایک بار پھر سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہا۔ وہ اس کی اولاد تھا، اس کا بیٹا، جسے پانے کی خاطر وہ رو رو کر دعائیں مانگتا تھا۔ وہی بیٹا آج اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ اسے بات کرنے کی تمیز بھی نہیں رہی تھی۔ مرتضیٰ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھا اور پھر کسی کی جانب دیکھے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ بیڈروم میں داخل ہوتے ہی اس کی سب سے پہلی نظر دیوار پر لگی سورۃ رحمٰن کی آیت پڑتی تھی۔

''تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔''

یہ فریمڈ آیت اسے سعدی نے دی تھی۔ ان دنوں وہ ٹی وی کا مشہور اداکار ہوا کرتا تھا۔ اس کے یہاں اولاد نہیں تھی جب کہ سعدی کی شادی ہو چکی تھی اور وہ دو جڑواں بیٹوں کا باپ تھا۔ سعدی نے کہا تھا کہ اس کو بیڈروم میں لگا دو اور بھابی سے کہنا۔ صبح و شام اس آیت کی تسبیح کیا کریں اور صبح شام کی اس تسبیح نے اسے ارتضیٰ انعام کی صورت دیا تھا۔

''تمہارا بیٹا بہت پیارا ہے...... شکر ہے تم پر نہیں گیا...... خدارا اس کے منہ پر انکل سعدی نہ چڑھا دینا...... یار! کوئی تو ہو جو مجھے میرے صحیح نام سے پکارے۔ بھائیوں کے بچے مجھے چاچو سعدی یا ماموں سعدی کہتے ہیں۔ یہ مجھے انکل صدیق کہے گا۔''

سعدی جب ارتضیٰ کو دیکھنے آیا تو اس نے اسے گود میں لے کر کہا تھا۔ وہی ارتضیٰ جو گود میں بیٹھ کر معصومیت سے اسے ''بابا'' کہہ کر بلاتا تھا، آج اسے اس طرح مخاطب کر رہا تھا جیسے وہ گلی کا کتا ہو۔

وہ اپنے بیڈروم میں داخل ہو کر دھیرے سے چلتا بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ذہن میں ارتضیٰ کے فقرے گونج رہے تھے اور آنکھوں کے سامنے اس کا شعلہ اگلتا چہرہ تھا۔ چند لمحوں بعد وہ بستر پر لیٹ گیا تھا۔ اسے اپنا سانس بہت تیز چلتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے بائیں پہلو میں ہونے والی بے چینی درد میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اسے یہ درد بہت معمولی محسوس ہوتے تھے۔ اس نے دایاں ہاتھ بائیں جانب سینے پر رکھ کر بہت آہستگی سے بہت نرمی سے سہلایا تھا۔ اسی دم نسرین کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے ایک نظر دیکھنے کے بعد دوبارہ اس کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ نسرین دھیرے دھیرے چلتی بیڈ کے قریب فرش پر بیٹھ گئی پھر اس نے اپنا سر مرتضیٰ کے قدموں میں رکھ دیا۔ اس کی سسکیوں کی آوازیں کمرے میں گونجنے لگی تھیں۔

''نسرین! مجھے ایسے ذلیل مت کرو۔'' اس نے بہت دھیمی آواز میں کہا تھا۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اپنے پاؤں نسرین کے شکنجے سے چھڑا سکتا۔

''میری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی۔ مجھے نہیں پتا۔ میں نے کہاں غلطی کی۔ آپ مجھے معاف کر دیں مرتضیٰ۔''

وہ سسک رہی تھی۔

''نسرین الماری سے ارتضیٰ کے بچپن کی تصویروں والا البم نکال لاؤ۔''

اس نے شریک حیات کی بات کا جواب دیئے بغیر التجائیہ لہجے میں فرمائش کی تھی۔

''آپ ان تصویروں کو بھول جائیں...... میں صبح ہی وہ سب تصویریں جلا دوں گی...... جب زندہ انسان اپنے نہ رہیں تو تصویروں کو اپنائے رکھنا بے کار ہے۔''

''پلیز...... میں ان تصویروں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں التجائیہ عنصر بڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر نسرین اس کی جانب دیکھتی رہی پھر وہ اٹھ کر الماری کی جانب بڑھ گئی۔

تصویروں والا ایک البم نہیں تھا بلکہ ارتضیٰ کی بے شمار تصاویر تھیں۔ مرتضیٰ کو ہر اہم موقع پر اس کی لاتعداد تصاویر اتارنے کا شوق تھا۔ البم کھول کر وہ بہت آہستگی سے تصاویر دیکھنے لگا۔ وہ ہر تصویر دیکھتا اور پھر ارتضیٰ کی تصاویر پر ہاتھ پھیرنے لگتا۔ اس کا انداز بے حد میکانکی تھی۔ نسرین نے حیرانی سے اس کی جانب دیکھا۔ ''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟'' اس نے بغور مرتضیٰ کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا تھا۔ مرتضیٰ اس تصویر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ جب ارتضیٰ نے سکول جانا شروع کیا تھا۔ نسرین کے سوال پر اس نے نظروں کا زاویہ بدل کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر بہت میٹھی سی مسکراہٹ تھی۔

''میرا بیٹا...... یہ میرا بیٹا ہے...... ارتضیٰ بھٹی۔'' وہ تصویر کی جانب انگلی سے اشارہ کر کے بولا تھا۔ نسرین اس کے بالکل قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے دل میں عجیب عجیب سے خیالات آنے لگے تھے۔ وہ دونوں کافی دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے۔ مرتضیٰ تصویروں کو اور نسرین مرتضیٰ کی جانب دیکھتی رہی۔ مرتضیٰ ایک کے بعد ایک البم کھولتا جا رہا تھا۔ دور کہیں مرغ کے بانگ دینے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ نسرین نے اُکتا کر وہ ساری البمز مرتضیٰ کے آگے سے ہٹا لیں۔ وہ چاہتی تھی۔ مرتضیٰ جی بھر کر دل کی بھڑاس نکال لے مگر وہ منہ سے کچھ بول نہیں رہا تھا۔

''ابھی...... میرے پاس رہنے دو انہیں...... پلیز......'' وہ ایک البم کو سینے سے لگا کر بولا تھا۔ نسرین بے ساختہ رو پڑی۔ اسے روتا دیکھ کر مرتضیٰ نے فوراً البم چھوڑ دی۔ نسرین نے وہ البم اٹھا کر دور پھینک دی۔

''نسرین! مجھے سلا دو...... مجھے نیند نہیں آتی...... مجھے تھوڑی دیر کے لیے سلا دو۔''

اس کے انداز بالکل بچکانہ تھے۔ نسرین محبت سے آگے بڑھی۔ مرتضیٰ نے اپنا سر اس کے زانو پر رکھ دیا۔ وہ بہت پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔ ہر عورت بالآخر صرف ماں ہو جاتی ہے۔ اسے لگ رہا تھا، مرتضیٰ چھوٹا سا بچہ ہے جسے وہ لوری دے رہی ہے۔ مرتضیٰ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پر دھیرے دھیرے سکون پھیل رہا تھا۔ جب نسرین کو لگا کہ وہ سو چکا ہے تو اس نے بہت آہستگی سے جھک کر اس کے ماتھے کو چوما تھا۔ اس کی اسکن میں بسی میک اَپ کی مہک تھی۔ مرتضیٰ نے یک دم آنکھیں کھولیں۔

''نسرین! تم بہت اچھی ہو...... بہت اچھی...... اباجی کو کہنا کہ انہوں نے مجھے زندگی کی ہر نعمت دی...... تم سب سے اچھی نعمت ہو...... ان سے کہنا...... مجھے معاف کر دیں۔''

وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ نسرین کا دل رکنے لگا۔ مرتضیٰ کے ساتھ کچھ غیر معمولی ہو رہا تھا۔

''اباجی سے کہنا...... مجھے...... ضرور معاف...... کر دیں...... وہ مجھے معاف...... کر دیں...... گے...... نا...... تم...... بھی...... مجھے...... معاف...... کر دینا۔'' اس کی آواز رک رہی تھی۔

''مرتضیٰ! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا...... آپ کو کیا محسوس ہو رہا ہے؟'' نسرین اس کے چہرے کو ہلانے جلانے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''میں...... ٹھیک ہوں...... تم مجھے...... سلا دو...... مجھے...... بہت اچھا...... لگ رہا ہے۔ لا...... الہ...... الا...... اللہ۔ لا...... الہ...... الا...... اللہ...... مجھے بہت نیند آ رہی ہے...... میرا سر...... دبا دو......''

اس نے بہت پُر سکون ہو کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ نسرین نے آہستگی سے اس کا سر اپنے زانو سے تکیے پر منتقل کیا اور باہر کی جانب بھاگی۔ اس نے سب سے پہلے ارتضیٰ کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

''دفع ہو جاؤ...... سب یہاں سے...... مجھے آپ لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ بند دروازے کے پیچھے سے چلا کر بولا تھا۔ نسرین پچھلی جانب بنے کمروں کی جانب بھاگی تھی۔ اکبر کا کمرہ اسی طرف تھا۔ اکبر کو لے کر جب وہ اپنے بیڈروم میں آئی تھی۔ تو سب ختم ہو چکا تھا۔ مرتضیٰ ابدی نیند سو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر بے حد سکون تھا۔ ایسا سکون جو بہت سالوں سے اس نے زندگی میں محسوس نہیں کیا تھا۔

○......❖......○

''میرا دل چاہتا ہے، میں مر جاؤں یا تم مر جاؤ تا کہ ہم دوبارہ کبھی ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھ سکیں۔''

کوئی اس کے کانوں میں بہت زور سے چلایا تھا، اتنی زور سے کہ وہ دہل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ڈریسنگ روم کے کونے میں لگے زرد بلب کی روشنی میں اس کے سامنے ایک تیز رنگوں والا زنانہ لباس پڑا تھا۔ انتہائی فٹنگ والی قمیص جس پر جا بجا شیشے لگے تھے۔ ٹراؤزر جس پر لمبے لمبے سلیس تھے اور رسی نما دوپٹہ...... یہ تھا وہ لباس جو اسے پہننا تھا۔ قمیص کے ننھے شیشوں میں اسے اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔ اسے پہلی بار اپنے خوبصورت چہرے سے بے انتہا نفرت محسوس ہوئی۔ وہ اس چہرے کے عشق میں مبتلا تھا۔ یہ عشق ایسے ہی ختم ہوا تھا جیسے ریت ہتھیلی میں سے پھسل جاتی ہے۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو گرا تھا۔ ہر آنکھ جب زچگی کے عمل سے گزر کر آنسو پیدا کرتی ہے تو تکلیف سہتی ہے اور جو آنکھ پہلی دفعہ زچگی کے عمل سے گزرے اس کی تکلیف حد سے زیادہ ہوتی ہے۔ ارتضیٰ بھٹی نے اپنی بائیں آنکھ میں بے پناہ درد محسوس کیا۔

اس کے دل میں پہلی بار یہ خواہش جاگی کہ وہ اپنے باپ کو ایک لمحے کے لیے زندہ سلامت اپنے سامنے دیکھ سکتا، اسے دیکھ سکتا اور اس کے لمس کو محسوس کر سکتا۔

طاہر ملک نے پیسے دینے کی جو شرط رکھی تھی، وہ اس کے لیے ناقابلِ قبول تھی لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ کہیں اور سے پیسے لا نہیں سکتا تھا۔ اسے سمجھ میں آ گیا تھا کہ ''مجبوری'' آخر کس چڑیا کا نام ہوتا ہے۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ جب مجبوری آپ کو گلے لگاتی ہے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ آج اسے پہلی مرتبہ زندگی نے لڈو کا دانہ بنا کر کھیل کا آغاز کیا تھا اور وہ آغاز میں ہی ادھ موا ہوا جا رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کے مرنے پر صرف روپے کا ہی انتظام کر پایا تھا اور یہی اس کے لیے سب سے زیادہ مشکل کام ثابت ہوا تھا۔ روپے اکبر کو دے کر وہ تھیٹر ہال میں چلا آیا تھا کیونکہ اسے ایسا ہی کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔

''تمہارا باپ'' آپا کبریٰ'' کا رول کر رہا تھا...... رول تو تمہارا بھی وہی ہو گا...... مگر تم ڈائیلاگز مت یاد کرو...... میں تمہارا دکھ سمجھ سکتا ہوں...... تم بس اسٹیج پر اِدھر اُدھر چھلانگیں مارتے پھرنا...... پہلے دن یہی کافی ہے۔''

ڈائریکٹر نے طاہر ملک کی ہدایات کے مطابق اسے اس کا کردار سمجھایا تھا جب کہ وہ اس کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔ وہ مسلسل گھڑی کی جانب دیکھتا رہا تھا۔

''سوا بارہ...... اب بابا کو نہلا کر کفن پہنا چکے ہوں گے...... مما اب رو نہیں رہی ہوں گی مگر ان کی سوجی ہوئی آنکھیں بابا پر جمی ہوں گی...... بڑے ابا جی (دادا) کو تو اطلاع ہی نہیں دی...... جب میت سلانوالی پہنچے گی تو انہیں پتا چلے گا...... وہ کتنا دکھی ہوں گے۔'' وہ ذہن میں ان تمام مناظر کو لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ آج اسے تمام رشتے ان کے اصلی ناموں کے ساتھ یاد آ رہے تھے۔ حالانکہ وہ ہمیشہ ان رشتوں کو حقارت سے ہی مخاطب کرتا رہا تھا۔ اس کا غرور، اس کا طنطنہ آج سب ختم ہو چکا تھا۔ اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور چہرے پر مسکین سی بے چارگی تھی۔

''تم ہو بہو بھٹی صاحب کی کاپی ہو۔'' طاہر ملک نے اسے دیکھتے ہی کہا تھا۔ قمیص کے شیشوں میں اس کا عکس اس کا تو نہیں تھا، وہ واقعی بھٹی صاحب کی کاپی تھا۔ زندگی کا کوئی ری پلے نہیں ہوتا لیکن انسان کا ری پلے اس کی اولاد کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ غلام مرتضیٰ بھٹی کا ری پلے ارتضیٰ بھٹی جو ہمیشہ اپنے باپ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا رہا تھا۔ آج اس زرد روشنی والے ڈریسنگ روم میں واقعی آج اپنے باپ کی کاربن کاپی لگ رہا تھا۔

''چھوٹے بھٹی صاحب! جلدی کرو...... ہماری باری بھی آنی ہے جناب...... جلدی باہر آؤ۔''

کسی نے ڈریسنگ روم کا دروازہ کھٹکھٹا کر کہا تھا۔ وہ ذرا بھی نہیں چونکا تھا۔ اس نے رخ موڑ کر ڈریسنگ روم کے دروازے کی جانب دیکھا۔ ایک وقت آیا تھا کہ اس کے باپ نے بھی چونکنا چھوڑ دیا تھا۔

''اب بابا کو گاڑی میں لٹا رہے ہوں گے...... مما ان کے ساتھ ہوں گی...... مما ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ تایا مصطفیٰ اور ماموں عنایت اللہ بھی اسی گاڑی میں مما کے ساتھ بیٹھے ہوں گے۔ مما بار بار تابوت کے اوپر لگے گلاس کیس میں سے بابا کے چہرے کی جانب دیکھ رہی ہوں گی۔''

وہ تصور کی آنکھ سے سب دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کبھی زندگی میں اپنے باپ کا ساتھ نہیں دیا تھا لیکن آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے باپ کے آخری سفر میں قبر تک اس کا ساتھ دے پاتا۔ دروازہ ایک بار پھر زور سے بجایا گیا تھا۔ اس نے قمیص اٹھا کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ اسے وہ کپڑے پہننے ہی تھے۔ ہمت کر کے اس نے ان کپڑوں کو اپنے جسم پر سجانا شروع کیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اب لگاتار آنسو گر رہے تھے۔ ایک کے بعد ایک اسے اپنے باپ کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ محبت، وہ شفقت جو وہ اس پر لٹاتا تھا اور وہ بدتمیزی جو بدلے میں وہ اپنے باپ کے ساتھ کرتا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ بوسے جو اس کے باپ نے اس کی پیشانی پر دیئے تھے اور وہ جھنجلاہٹیں جو وہ اپنے باپ کو دیتا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے اپنے باپ کا چہرہ آ گیا۔ اس کی جھنجلاہٹ، بدتمیزی اور کسی سخت جملے پر اس کی آنکھوں میں جو عجیب سی بے چارگی آ جاتی تھی۔ ارتضیٰ کو وہی بے چارگی یاد آ گئی وہ ڈریسنگ روم سے فوراً نکل آیا۔ وہ وہیں کھڑا رہتا تو شاید مر جاتا۔ وہ اس وقت اپنے آپ کو اتنا دکھی محسوس کر رہا تھا کہ اس نے اپنے حلیے کی بھی پروا نہیں کی۔ قمیص جو بے حد تنگ تھی، اس کے کسرتی جسم کے ساتھ چپک کر وہ بے حد مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ ٹراؤزر کے سلٹ میں سے اس کی پنڈلیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔

''سوہنیو زپ تے بند کر لو۔''

کسی کی زنانہ آواز آئی تھی اور پھر ایک ہاتھ اس کی پشت پر دھیرے دھیرے چلنے لگا تھا جب تک زپ نہیں بند ہوئی تھی، وہ سانس روکے کھڑا رہا تھا۔ زپ بند ہونے کے ساتھ ہی ایک بے ہنگم قہقہہ ابھرا تھا۔

''اپنے باپ کے جیسا شرمیلا ہے۔'' اس نے مڑ کر ان کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھیں، بے حد عجیب و

غریب تھیں۔ ڈریسنگ روم سے باہر نکلتے وقت وہ ان پر ایک نظر ڈال چکا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جب کل وہ انہی عورتوں کو اسٹیج پر رقص کرتے اور بے ہودہ مذاق کرتے دیکھتا رہا تھا، تب وہ اسے عجیب و غریب نہیں لگی تھیں۔ تب اسے انہیں دیکھنے میں بہت مزا آ رہا تھا۔

''میک اَپ کروا لو چھوٹے بھٹی صاحب!'' کسی جانب سے آواز آئی تھی۔ وہ فوراً اس کیبن کی جانب چلا گیا تھا۔

''یہ بھٹی صاحب کا بیٹا ہے؟'' اس نے میک اَپ مین سے پوچھا تھا۔ اس کی مردانہ آواز سن کر ارتضیٰ کو اندازہ ہوا کہ وہ ''مرد'' ہے۔

''آپ اِدھر بیٹھ جاؤ۔'' ایک شخص نے اسے کرسی دی۔ وہ جھجکتے ہوئے اس پر بیٹھ گیا تھا۔ سامنے لگے شیشے میں اب اسے اپنا مکمل عکس نظر آ رہا تھا۔ اس کی دونوں جانب دو لوگ میک اَپ کروا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کو وہ عورت سمجھ رہا تھا جب کہ وہ مرد تھا جب کہ دوسری جانب ایک عورت تھی جس نے ابھی تک ایک جملہ بھی نہیں بولا تھا۔ جس سے یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ واقعی عورت ہے یا مرد۔

میک اَپ مین نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا تھا پھر مختلف چیزوں کو اس کے چہرے پر پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ لڑکا کافی تیزی سے ہاتھ چلا رہا تھا۔ اسی دوران کمرے میں بیٹھے عورت نما مرد نے اپنے ڈائیلاگز دہرانے شروع کر دیئے تھے۔ ان ڈائیلاگز کو سن کر ارتضیٰ شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔

جب وہ کل ہال میں بیٹھا یہ سن رہا تھا، تب اسے یہ سب ایڈونچر لگ رہا تھا اور اب جب اسے سب کے سامنے یہ پرفارم کرنا تھا تو اسے شرم آ رہی تھی۔

''اس کو پوچھو، یہ وہاں کیا کر رہا تھا؟'' اس کے کانوں میں اپنے باپ کا کہا گیا جملہ نہ جانے کہاں سے بنا دستک دیئے چلا آیا اور دل ایک بار پھر پاتال میں گرنے لگا۔

درد کا ذائقہ ہوتا ہے جو انسان محسوس کرے۔ اسے اس درد کا ذائقہ مانوس لگا۔ یہ ذائقہ اس کا باپ چکھ چکا تھا۔ یہ درد اس کے باپ کے حصے میں اس کی وجہ سے آیا تھا۔

''تمہیں شرم آنی چاہیے یہ سب کرتے ہوئے...... تم ایک نفسیاتی کیس ہو...... تمہارا مسئلہ کیا ہے آخر...... کر کیوں رہے ہو تم یہ سب...... صرف اس لیے کہ خود کو تسکین پہنچا سکو۔ مجھے مت بتاؤ کہ تم نے یہ سب پیسے کے لیے کیا...... کوئی پیسے کے لیے اس غلاظت میں نہیں کود سکتا...... کوئی پیسے کے لیے یہ گھٹیا کام نہیں کر سکتا۔ کوئی پیسے کے لیے...... کوئی پیسے کے لیے...... کوئی پیسے کے لیے......''

اس کے کان مسلسل اپنے کہے گئے جملے سن رہے تھے۔

اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا جب کہ میک اَپ مین اسے پُرسکون رہنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ میک اَپ مکمل کر کے اسے آئینے کے بالکل سامنے کر دیا تھا۔

وہ ارتضیٰ بھٹی نہیں بلکہ واقعی ''آپا صغریٰ'' نامی ہیجڑا لگ رہا تھا۔ اس نے خود اپنا ایسا مضحکہ خیز روپ کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن وہ ہنس نہیں رہا تھا۔ ایسا لازمی نہیں کہ مضحکہ خیزی ہمیشہ ہنسانے کا باعث ہو۔ وہ آئینے کے سامنے بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ اب اس کے تصور میں کوئی فلم نہیں چل رہی تھی۔ اس کے ذہن میں باپ کی جو تصویر آ رہی تھی، وہ ''غلام مرتضیٰ بھٹی'' کی نہیں تھی بلکہ ''آپا کبریٰ'' کی تھی۔

''بارہ بجے ڈرامہ شروع ہوگا...... پہلے سین سے ہی تمہاری انٹری ہے...... بھٹی صاحب ''کبریٰ'' کے نام سے مشہور تھے اور تم دیکھنا تمہیں ''صغریٰ'' کے رول میں بہت پذیرائی ملے گی۔ تمہیں کچھ نہیں کرنا، بس پندرہ منٹ بعد ایک ٹھمکا ٹھمکا لگا لینا...... اس چیز سے پبلک بہت خوش ہوتی ہے۔''

کوئی بہت قریب آکر اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تمام اداکار اب ایک جگہ اکٹھے ہو رہے تھے۔

''یوم حساب کبھی بھی ہوسکتا ہے۔'' اس کے ذہن میں آخری فقرہ گونجا تھا۔ ڈرامہ شروع ہونے میں پانچ منٹ ہی باقی تھے۔



ڈرامہ شروع ہوتے ہی پورا ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔

پچھلی نشستوں کے عین اوپر نصب بڑے بڑے بلب گل ہونا شروع ہوئے تھے۔ روشنی بہت سرعت سے سیاہ لبادہ اوڑھ کر تاریکی کا روپ دھارنے لگی۔ لمحہ بھر میں تمام ہال اندھیرے کی موسلا دھار پھوار سے بھیگ چکا تھا۔ اسٹیج پر لگا بھاری سرخ پردہ سرکنے لگا۔ تالیوں کی گونج دھیرے دھیرے دم توڑنے لگی۔ لوگ ہال میں موجود کرسیوں پر بیٹھے پردے کے ہٹ جانے کے منتظر تھے۔ سارا ہال انسانی سروں سے بھرا نظر آرہا تھا اور ایسے میں کسی نے اپنی بھوری آنکھوں سے ان انسانی سروں پر نظر ڈالی۔ کل وہ بھی انہی کے درمیان تھا، آج وہ ان کے سامنے آکھڑا تھا۔

''شرمندگی، ملال، پشیمانی، ذلت، گندگی، مجبوری، تاسف، روپے، بھوک، نفس، پچھتاوا، دکھ، مایوسی اور توبہ۔''

صغریٰ آپا کے ذہن میں لفظ گونج رہے تھے، احساس نہیں۔ احساس مر چکا تھا۔

بھوری آنکھوں والا وہ لڑکا جس نے لڑکیوں کے جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھے جس کے چہرے پر سرخ رنگ کا میک اَپ تھا۔ یک دم اسٹیج پر گر گیا۔ ایسے جیسے سجدے میں گرتے ہیں۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔

''کلمہ شہادت، کلمہ شہادت، کلمہ شہادت۔''

وہ روتے روتے چلا رہا تھا۔ سارے ہال میں تالیاں بجنے لگیں اور سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ آپا صغریٰ کی پہلی انٹری لاجواب تھی۔

اس طرح یہ کہانی وہاں ختم ہوئی، جہاں ڈرامہ شروع ہوا تھا۔



دشتِ ظلمت میں

''دامن سے لے کر آستینوں تک یہ والا ڈیزائن اس طرح سے چھاپنا کہ درمیان میں خم بن جائے۔''

اس نے قمیص کا کپڑا پھیلا کر رکھتے ہوئے انگلی سے نشاندہی کی۔ حیدر نے خاموشی سے اس کی ہدایت کو سنا پھر متعلقہ ڈیزائن والا کاربن پیپر نکالنے لگا۔ اس کے چہرے سے اس کی پسندیدگی کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ اپنی عادت کے برخلاف وہ اسے مشورہ دینے کی بجائے چپ چاپ کاربن پیپرز کے پلندے میں کھویا ہوا تھا۔ اس کو مصروف اور اس درجہ لاتعلق دیکھ کر مریم دکان کا جائزہ لینے لگی۔ وہ کافی عرصہ بعد حیدر کی دکان پر آئی تھی، اس لیے اسے بہت سی نئی تبدیلیاں نظر آرہی تھیں۔ گزشتہ مہینے حیدر نے نئی پیکو مشین خریدی تھی جس کے لیے اسے ایک نیا ملازم رکھنا پڑا تھا۔ اب اس کی دکان پہ بشمول اس کے تین لڑکے ہوتے تھے۔ ایک لڑکا پیکو کرتا تھا جب کہ دوسرا چھپائی کا کام سنبھالتا تھا۔ دو ملازموں کی بدولت اب حیدر کا کام ان کی نگرانی و رقم کی وصولی، دھاگوں یا اس قسم کی دوسری چیزوں کی فروخت تک محدود ہو گیا تھا۔ مریم چونکہ گھر کی فرد تھی، اس لیے اس کی قمیص کی چھپائی حیدر خود کر رہا تھا مگر اس کے چہرے پہ خفگی کے آثار نمایاں تھے اور مریم اس کی خفگی دور کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ کوئی ایسی چیز تلاش کر رہی تھی جسے موضوع گفتگو بنا کر وہ اسے مخاطب کر سکے۔ اسے بالآخر مختلف رنگوں کے دھاگوں کی نلکیوں سے سجی الماری میں ایک چیز نظر آ ہی گئی۔ وہ ایک موٹی سی کتاب تھی۔ مریم نے ہاتھ بڑھا کر اس کتاب کو اٹھا لیا جس پر بی اے انگلش گائیڈ بک لکھا تھا۔

''یہ کس کی کتاب ہے؟'' صفحہ در صفحہ پلٹتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔ حیدر نے ایک نظر اسے دیکھا پھر اس کے ہاتھ سے وہ کتاب تقریباً چھیننے والے انداز میں پکڑ کر بند کی اور اسی جگہ پر رکھ دی جہاں سے مریم نے اٹھائی تھی۔ مریم کو حد درجہ بے عزتی کا احساس ہوا مگر یہ احساس نیا نہیں تھا۔ وہ گزشتہ کئی دن سے حیدر کا یہی رویہ برداشت کرتی چلی آرہی تھی۔ حیدر اس کی حالتِ زار سے بے خبر وہی کپڑا میز پر رکھ کر ہاتھوں کے دباؤ سے اس پر پڑی سلوٹیں دور کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے اس پر متعلقہ ڈیزائن والا کاربن پیپر بچھا لیا۔ وہ کافی پسند کیے جانے والا ڈیزائن تھا اور بار بار چھپائی کے باعث کچھ بوسیدہ ہو چکا تھا۔ اسی دوران دو خواتین آگئیں جنہیں دھاگے اور موتی وغیرہ خریدنے تھے۔ حیدر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ حالانکہ اس کا ملازم پہلے ہی ان خواتین کو ڈیل کر رہا تھا۔ حیدر کا انداز دیکھ کر مریم کا معصوم دل مزید دکھی ہو گیا۔

''مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے اور ان سے کتنی محبت سے بات کر رہا ہے۔'' اس نے آنکھوں میں آئی ہلکی ہلکی نمی کو پیتے ہوئے خود کلامی کی۔ حیدر اس کا فرسٹ کزن تھا۔ پھپھا جی کی وفات کے بعد پھپھو اپنے سسرال میں رہنے کے بجائے ان کے گھر آگئی تھیں۔ اس کے بعد انہیں سسرال سے لینے کوئی آیا نہ ہی انہوں نے خود واپس جانا مناسب سمجھا۔ بھائی نے بھی بہن

کا بہت ساتھ دیا اور زندگی کے ہر معاملے میں ان کی مدد کی کیونکہ اللہ کا دیا بہت کچھ تھا ان کے پاس۔ اپنی زمین، دو بھینسیں، ذاتی مکان، بچوں کے جوان ہونے تک اس عادت میں مزید پختگی آتی چلی گئی۔ مریم اور عمر دو ہی بہن بھائی تھے۔ حیدر نے ان کی تکون کو مکمل کر دیا تھا۔ ان تینوں میں بہت گہری دوستی تھی۔ وہ ہر کام ایک ساتھ کرنے کے عادی تھے۔ حیدر نے سکول جانا شروع کیا تو ایک ہی ضد لگائے رکھی۔

''عمر اور مریم کو ساتھ لے کر سکول جاؤں گا۔''

''عمر تو ابھی بہت چھوٹا ہے اور مریم لڑکی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ سکول نہیں جا سکتی۔'' ماموں نے سمجھایا تو وہ اور بھی بھڑک اٹھا۔

''واہ جی واہ...... مریم لڑکی ہے...... جب یہ مریم کی بچی کرکٹ کھیلتے ہوئے مجھے اور عمر کو چوکے مارتی ہے، تب آپ کہتے ہیں کہ مریم تو میرا بیٹا ہے اور اب یہ مریم لڑکی ہو گئی۔''

وہ تنک کر بولا تو انہیں اس پر اور بھی پیار آیا۔ انہوں نے اس کے گالوں کو چومتے ہوئے اسے گود میں اٹھا لیا۔ وہ جانتے تھے کہ تینوں بچے ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں اور ان کا ایک دوسرے کے بغیر گزارا نہیں، اس لیے وہ ماسٹر صاحب سے خصوصی اجازت لے کر آئے کہ کچھ دن تین سالہ مریم کو اس کے ساتھ بیٹھنے دیا جائے۔ یوں ننھی مریم اس کے ساتھ لڑکوں کے سکول جانے لگی، لیکن اس سے حیدر کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ حیدر کے کلاس فیلوز اور سینئر لڑکے مریم کو اتنا پیار کرتے، اس سے دوستی کرنا چاہتے تو حیدر آگ بگولا ہو جاتا اور ان سے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا۔

''یہ تو بالکل میری گڑیا ہے۔'' ایک دن ماسٹر صاحب نے مریم کو گود میں بٹھا کر پیار کرتے ہوئے کہا تو حیدر کی شکل دیکھنے والی تھی۔ وہ ماسٹر صاحب سے جھگڑا نہیں کر سکتا تھا مگر اس دن کے بعد سے اس نے مریم کو ساتھ لے جانے کی ضد نہیں کی۔ اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر مریم نے ماسٹر صاحب سے دوستی کر لی تو کیا ہوگا۔



''ذرا دھیان سے کرنا۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''مجھے مشورہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر غرایا۔ مریم اس کی دوسری بدتمیزی پر پہلے کی طرح پھر خاموش ہو گئی۔ حیدر نے اسفنج کو ہلکے ہاتھ سے نچوڑ کر کاربن پیپر پر رکھ دیا۔ وہ مریم کو ستانا نہیں چاہتا تھا مگر نہ جانے کیسے جو وہ نہیں چاہتا تھا، وہی ہو گیا تھا۔ کاربن پیپر بوسیدہ ہونے کے باعث درمیان میں سے پھٹ گیا تھا اور ساری روشنائی کپڑے کو پھول بوٹوں سے آراستہ کرنے کی بجائے داغ دار کر گئی۔ وہ دونوں کچھ لمحے تک اس ہلکے سبز رنگ کے کپڑے کو تکتے رہے پھر مریم کے منہ سے ''ہاہ'' کی صورت سسکی نما آواز نکلی۔

''کوئی مسئلہ نہیں، کوئی مسئلہ نہیں۔ ڈھل کر صاف ہو جائے گا۔ پکا رنگ نہیں ہے، ایک دھلائی کی مار ہے۔'' حیدر کا خود ساختہ خول لمحہ بھر میں چٹخ گیا تھا۔ وہ پشیمانی سے کہنے لگا۔

''بیڑا غرق ہو تمہارا حیدر! یہ کیا کر دیا تم نے۔ ہائے میرے اللہ! کتنا پسند تھا مجھے یہ رنگ۔ پھپھو نے کتنے شوق سے مجھے یہ تین سو روپے کا سوٹ لے کر دیا تھا۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی جب کہ حیدر کہنے لگا۔

''یہ دھل کر صاف ہو جائے گا مریم! سرف ایکسل ہے نا۔''

''مروتم، سرف ایکسل کے بچے۔ میری ہر خوشی سے تمہیں پتا نہیں کیوں آگ لگ جاتی ہے۔''

وہ جل کر بولی پھر اس کے ہاتھ کے نیچے سے وہ قمیص کا کپڑا کھینچ کر نکالا اور تن فن کرتی اس کی دکان سے باہر نکل گئی۔ اس کی امی ساتھ والی دکان سے دوپٹے رنگوا رہی تھیں۔ اس نے پلٹ کر ایک بار بھی حیدر کی جانب نہیں دیکھا تھا جس کے دل پر ایک بات نقش ہو کر رہ گئی تھی۔

''میری ہر خوشی سے تمہیں پتا نہیں کیوں آگ لگ جاتی ہے۔''



''ناراض ہو؟'' حیدر نے یک دم سوال کیا۔ نل کے نیچے پڑے پانی سے بھرے ٹب میں مریم کا متحرک ہاتھ رک گیا۔ منشی چاچا کچھ دیر پہلے آموں سے بھرا ٹوکرا دے کر گئے تھے۔ مریم صحن میں ایک طرف لگے نل کے پاس بیٹھی آم دھونے میں مصروف تھی۔ حیدر چوکی لے کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''نہیں، میں کیوں ناراض ہونے لگی تم سے۔'' وہ بے حد لاتعلقی سے بولی تو حیدر اس کے انداز پر کٹ سا گیا مگر کچھ کہنے کی بجائے اس نے بھی اسی ٹب میں ہاتھ ڈال دیئے اور مریم کے ساتھ مل کر آموں کو غسل دینے لگا۔ یہ اس کے بچپن کی عادت تھی۔ وہ مریم کی ناراضی دور کرنے کے لیے اسی طرح ان کے کاموں میں اس کی مدد کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا اور اس دوران اگر وہ اسے مخاطب کر بیٹھتی تو پھر خوب ہنستا۔

''ارے گلابی سنڈی! تم مجھ سے ناراض ہو بھئی؟ اتنی جلدی بھول کیوں جاتی ہو۔ یاد نہیں تم نے قسم کھائی تھی کہ اب مجھ سے بات نہیں کرو گی؟'' وہ اسے چڑانے کو کہتا تو مریم خاموش ہو جاتی۔

''مان لو گلابی سنڈی! تم میرے بغیر رہ ہی نہیں سکتیں۔'' وہ سینہ تان کر کہتا تو مریم اس کے بال کھینچنے لگتی پھر وہ دونوں ہنس دیتے اور ناراضی ختم ہو جاتی مگر اس بار کی ناراضی عجیب ہی تھی، جس میں خفگی سے زیادہ لاتعلقی اور اجنبیت تھی۔ مریم ٹب میں اس کے ہاتھوں کو حرکت کرتا دیکھتی رہی پھر اس نے آہستگی سے اپنے ہاتھ ٹب سے باہر نکال لیے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھتی حیدر نے اس کا بھیگا ہاتھ تھام لیا۔

''یہ ٹھیک نہیں ہے مریم!'' وہ بہت بے چارگی سے بولا جیسے خود اپنے آپ سے تنگ آ چکا ہو۔ گزشتہ کئی دنوں سے اس کے دل میں جو اتھل پتھل مچی تھی، وہ خود بھی اس سے عاجز آ چکا تھا۔ مریم اس کی ماموں زاد تھی۔ وہ ماموں جس نے اسے اس کے ابا کے انتقال کے بعد باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ آج کل جو سوچ رہا ہے، اس کی بھنک کسی کے کانوں تک پہنچے۔ مبادا ماموں سمجھیں کہ وہ اپنی اوقات بھولتا جا رہا ہے۔ اسے اپنی اور اپنی امی کی عزت کا بہت پاس تھا مگر آج کل حالات جس نہج پر چل رہے تھے، وہ بھی ناقابلِ برداشت تھے۔ اس کے دل میں اپنی کم مائیگی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی اس ذہین و فطین، گوری چٹی کزن کے سامنے خود کو بہت کمتر محسوس کرنے لگا تھا۔ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اسے ہمیشہ سے اپنے لمبے چوڑے کسرتی جسم پہ اور اپنے قد و قامت پہ ناز محسوس ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس جیسی شاندار شخصیت والا لڑکا پورے خاندان میں کوئی دوسرا نہیں ہے، مگر جب مریم کا ایف ایس سی کا رزلٹ آیا تو اسے احساس ہوا کہ صرف لمبا چوڑا شاندار سراپا کافی نہیں ہوتا۔ اپنا آپ ثابت کرنے کے لیے کچھ اور خصوصیات بھی ہونی چاہئیں جو اس میں موجود نہیں تھیں اور تب ہی اسے احساس ہوا کہ وہ مریم کے لیے کچھ مختلف قسم کے محسوسات کا شکار ہو رہا ہے۔ ان دنوں مریم انٹری ٹیسٹ کی تیاری کرنے لگی اور حیدر نے مسجد جا کر پانچوں وقت باجماعت نماز ادا کرنا شروع کر دی۔ سب کا خیال تھا کہ وہ مریم کے لیے دعا کرتا ہے مگر وہ عجیب سے خدشات میں گھرا رہتا۔

''اگر مریم ڈاکٹر بن گئی تو ماموں مجھ جیسے چھاپے والے کو کبھی اپنی قابل بیٹی دینا پسند نہیں کریں گے۔''

وہ اکثر سوچتا اور پھر خود ہی شرمسار رہتا۔ وہ خود سمجھ نہیں پاتا تھا کہ وہ مریم کی کامیابی سے جلنے کیوں لگا ہے۔ حالانکہ تینوں بچوں میں بڑا ہونے کے باعث ماموں، ممانی اسے بہت عزت دیتے تھے مگر پھر بھی وہ سب سے خائف رہنے لگا۔ اس کی بد دعاؤں کا نتیجہ تھا شاید کہ مریم انٹری ٹیسٹ میں فیل ہوگئی۔ حیدر کو لگنے لگا جیسے محاذوں پہ خاموشی چھا گئی ہے۔ اسے اطمینان ہونے لگا تھا مگر مریم اس کے اطمینان کی دشمن تھی۔

''میں بی ایس سی نہیں کروں گی، میں کچھ اور کرنا چاہتی ہوں۔ کچھ ایسا جسے کر کے مجھے سکون ملے۔ میں اپنے آپ کو اسی فیلڈ سے منسلک رکھنا چاہتی ہوں، جس کے میں نے خواب دیکھے تھے۔ میں ڈاکٹر نہیں بن سکی مگر میں نرس تو بن سکتی ہوں۔'' اس نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ اخبار میں چھپنے والے کسی اشتہار نے اسے پھر سے حیدر سے دور کرنے کے اسباب پیدا کر دیئے۔

''میں نرسنگ کرنا چاہتی ہوں ابو!'' اس نے اسی روز کھانا کھاتے ہوئے سب کے سامنے ابو جی کو مطلع کیا۔ حیدر کو بعض لوگوں کی خبر نہیں تھی مگر خود اس نے خاموشی سے چمچ پلیٹ میں رکھ کر کھانے کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ اس کی بھوک ہی اُڑ گئی تھی۔ ماموں نے ہنس کر بات ٹال دی مگر اس کا دل چاہا کہ دو جوتے لگا کر اس ہٹ دھرم لڑکی کو قاضی صاحب کے سامنے لے جا کر کھڑا کرے اور اس موہنی صورت ضدی لڑکی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا پابند کر لے مگر وہ یہ سب صرف سوچ سکتا تھا۔ آنے والے دنوں میں مریم کی ضد بڑھتی گئی اور ماموں مسلسل انکار کرتے گئے وہ چاہتے تھے مریم بی ایس سی کر لے مگر مریم کے ذہن و دل پہ سفید اوور آل چپک کر رہ گیا تھا۔

''حیدر...... میرے اچھے بھائی...... تمہاری بات تو ابو جی ضرور مان لیں گے۔ تم میری سفارش کر دو نا۔ یہ میرا خواب ہے حیدر! یہ پورا نہیں ہوا تو میں مر جاؤں گی۔ میں سچ مچ مر جاؤں گی۔''

وہ ایک دن اس کے کندھے پہ سر رکھ کر روتے ہوئے کہنے لگی۔ اس کی اس فرمائش پر حیدر تقریباً تڑپ اٹھا۔ اسے لفظ ''بھائی'' یک دم ہی برا لگنے لگا مگر مریم کا رونا بھی برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے دل کو مار کر اس نے ماموں کو منا لیا تھا۔ حیدر نے خود مریم کے فارمز اور فیس وغیرہ جمع کروائی تھی مگر ہر مقام پر وہ اپنے آپ کو مزید کھوکھلا اور بے جان محسوس کرتا۔ وہ چڑچڑا ہوتا جا رہا تھا۔ عجیب سی قنوطیت اسے گھیرے رکھتی اور لوگ شکوہ کرتے رہتے کہ وہ بدل گیا ہے۔ وہ جانتا تھا، وہ تبدیل نہیں ہوا مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے دل میں اپنی کم مائیگی کا بڑھتا ہوا احساس اسے کمزور کر رہا تھا۔

''حیدر...... حیدر کے بچے...... میرا ہاتھ چھوڑو۔''

وہ اس کا ہاتھ پکڑے سوچ کی نہ جانے کون سی سیڑھی چڑھ رہا تھا کہ مریم نے اس کی پیشانی پر دوسرا ہاتھ مار کر اسے ہوش کی دنیا میں واپس لانا چاہا۔ حیدر نے دھیرے سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''حیدر...... !تمہیں کیا ہو گیا ہے...... تم بہت بدل گئے ہو...... تم ایسے تو نہیں تھے۔'' مریم نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ وہ شاید کبھی حیدر کی کیفیت کو سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اونچا مزید اونچا اڑنے کی لگن اسے کسی اور طرف دھیان دینے کا موقع کم ہی دیتی تھی۔

''میں کیا کروں مریم! میرا جی آج کل بہت اداس رہنے لگا ہے۔'' حیدر نے تھک ہار کر کہہ ڈالا۔

''مجھے ہر چیز سے الجھن ہوتی ہے۔ دل چاہتا ہے خود مر جاؤں یا سب کو مار ڈالوں۔'' مریم کے خاموش رہنے پر وہ مزید

گویا ہوا۔

''میری وجہ سے اداس ہو نا؟'' مریم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے یک دم سوال کیا تو حیدر اثبات میں سر ہلا گیا۔ مریم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری تھی۔

''بہت محبت کرتے ہو نا مجھ سے؟'' مریم نے ایک بار پھر سوال کیا تو وہ ہکا بکا ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔ وہ بات جو وہ مہینوں سے خود سے کہتے ہوئے بھی شرما رہا تھا، وہی بات مریم نے بہت آرام سے کہہ ڈالی تھی۔

''عمر کی حالت بھی تمہارے جیسی ہو رہی ہے، وہ تمہاری طرح چڑچڑا تو نہیں ہوا مگر بہت اداس رہنے لگا ہے۔ میں جانتی ہوں تم دونوں مجھے چڑانے کے لیے مجھ سے جھگڑا کرتے ہو مگر حقیقتاً تم دونوں کو مجھ سے بہت محبت ہے۔'' اس کی بات سن کر وہ گہرا سانس بھر کر رہ گیا۔

''تم بالکل بے وقوف ہو مریم!'' وہ بے چارگی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''ایویں...... کوئی نہیں...... تم خود ہو گے بے وقوف۔''

وہ ناک چڑھا کر بولی پھر صحن کے بیچوں بیچ پڑی چارپائی پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنے والے دنوں کے حوالے سے ایک نیا عزم صاف دکھائی دے رہا تھا اور حیدر کو اس کے ان ہی عزائم سے ڈر لگتا تھا۔ وہ دو سال بعد والی مریم کا تصور کرنے کی کوشش کرتا تو سادہ لباس میں چوٹی باندھے معصومیت سے مسکراتی ہوئی مریم کی بجائے ایک نہایت طرحدار اسٹائلش لباس میں ملبوس اونچی ہیل اور کھلے بالوں کے ساتھ منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی بولتی ایک لڑکی اس کے سامنے آجاتی۔ کلف لگے شلوار قمیص میں ملبوس اپنے آپ کو شہزادہ سمجھنے والا حیدر، مریم کے سامنے ایک دم ہی چغد لگنے لگتا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس قسم کی سوچوں کو جھٹک نہیں پاتا تھا۔

''مریم! ایک بات پوچھوں؟'' اس نے وہیں نل کے پاس بیٹھے بیٹھے مریم کو مخاطب کیا۔

''نہیں۔'' وہ فوراً بولی پھر بے وجہ ہنسنے لگی۔

''تم بالکل بدل گئے ہو حیدر! اب تم مجھ سے اجازت لے کر بات کیا کرو گے۔ ارے میں وہی مریم ہوں جسے تم گلابی سنڈی اور چتکبری سنڈی کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔'' وہ شگفتہ سے انداز میں اسے اس کے بدلے ہوئے رویے کا احساس دلانے لگی۔ حیدر بھی اب کی بار کھل کر مسکرایا۔

''میں چاہے سو بار بدل جاؤں مریم! مگر تم کبھی مت بدلنا۔ ایسی ہی رہنا معصوم، اپنی اپنی سی۔'' وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی سی آواز میں بولا تو مریم کی بولتی بند ہو گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے حیدر کو مزید مسکرانے پر مجبور کیا۔

''اتنی بھی بے وقوف نہیں ہو مریم!'' یہ بات اس نے خود سے کہی اور مریم نہ جانے کیوں بس پاؤں کی انگلیوں کو تکے جا رہی تھی۔



گھڑی کی سوئیاں نہ جانے کیا بجا رہی تھیں جب اس کی آنکھ کھلی۔ کھڑکیوں کے پردے ابھی تک نہیں ہٹائے گئے تھے جس کی وجہ سے کمرے میں تاریکی کا راج تھا اور سامنے دیوار پر لگی گھڑی اسے صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے دو تین بار آنکھیں جھپکیں پھر منہ کھول کر جمائی لی۔ اس کے سارے وجود پر عجیب سی کسلمندی اور بیزاری چھائی ہوئی تھی۔ اس کا

جب جب اپنی ممی سے جھگڑا ہوتا تھا، تب تب یہی بیزاری اس کے پورے وجود پر چھا جاتی تھی۔ اس نے کروٹ بدلی اور سائیڈ ٹیبل پر پڑی اپنی رسٹ واچ اٹھا کر ٹائم دیکھنے لگا۔ بارہ بجنے میں چند ہی منٹ باقی تھے۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اس کا خیال تھا ابھی ساڑھے چھ یا سات کا وقت ہوا ہوگا۔

''یعنی کہ حد ہوگئی۔ ایک ممی کا موڈ مجھ سے آف ہو جائے تو سارا گھر مجھ سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔'' اس نے گردن جھٹک کر خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ اسے جلد از جلد اُٹھ کر پارک میں واک کے لیے جانا تھا، جہاں اس کی اپنے پاپا کے ساتھ ملاقات متوقع تھی مگر ممی کے ساتھ ہونے والے جھگڑے نے سب چوپٹ کر دیا تھا۔ اسے پاپا کے ساتھ بہت سی باتیں ڈسکس کرنا تھیں، جو وہ اب نہیں کر سکتا تھا کیونکہ پاپا ایک ماہ کے لیے تھائی لینڈ جا رہے تھے۔ اسے رات والے جھگڑے کے متعلق بھی پاپا کو مطلع کرنا تھا۔ روٹین کے مطابق وہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب گھر واپس آیا تو ممی پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں۔ انہوں نے اپنے ذرائع سے اس کے میٹرک کا رزلٹ پتا کروا لیا تھا اور وہ اس بار بھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ حالانکہ اس سال وہ دوسری بار میٹرک کا امتحان دے رہا تھا۔

''تمہارے رزلٹ کا کیا بنا سنی؟'' ممی نے سنجیدگی سے استفسار کیا تھا۔ وہ لاؤنج میں پڑے فریج کا دروازہ کھولے پانی کی بوتل نکال رہا تھا۔ ان کے انداز نے اسے چونکایا تھا۔ گزشتہ سال رزلٹ اناؤنس ہونے پر ممی نے اس کی جس انداز میں آؤ بھگت کی تھی، وہ اسے بھی بھولا نہیں تھا۔ وہ جواب دینے کی بجائے بوتل کا ڈھکن کھول کر پانی پینے لگا۔

''میں نے تم سے تمہارے رزلٹ کے متعلق پوچھا ہے سنی؟'' ممی اب کی بار اونچی آواز میں بولیں۔ انہیں اپنے سوالات کا نظر انداز کیے جانا سخت ناپسند تھا۔

''ابھی رزلٹ اناؤنس نہیں ہوا ممی! میرا خیال ہے ابھی کچھ اور دن لگ جائیں گے۔'' وہ جل تُو جلال تُو کا وِرد کرتے ہوئے بظاہر اطمینان سے بولا تھا۔ اس کا یہی اطمینان انہیں مزید سلگا گیا۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو، اپنے باپ کی طرح تم بھی مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو۔'' وہ چلا کر بولیں۔ ان کے غیض سے وہ ہمیشہ ہی خائف رہتا تھا۔

''میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہا ممی! بلکہ سچ......''

''شٹ اپ...... جسٹ شٹ اَپ۔'' انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میں تمہارے سارے کرتوتوں سے واقف ہوں۔ تم ساری زندگی کچھ نہیں کر پاؤ گے، بس مجھے شرمندہ کرواتے رہو گے اور میرا دل جلاتے رہو گے۔ تمہیں تو اس بات پر بھی کوئی شرمندگی نہیں ہوتی کہ تمہارے باقی کلاس فیلوز تم سے آگے نکل چکے ہیں اور تم ابھی تک میٹرک ہی کلیئر نہیں کر پائے۔ میرے کتنے......''

''میں نے آپ سے کہا تھا ممی! میں سائنس سبجیکٹ نہیں پڑھنا چاہتا۔ ان فیکٹ میں پڑھ ہی نہیں سکتا۔ مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں ہے مگر آپ نے زبردستی......''

''زبردستی...... زبردستی...... شیم آن یو سنی! میں نے تمہیں آپشن دیا تھا کہ تم......''

''نہیں ممی!'' وہ دونوں مسلسل ایک دوسرے کی بات کاٹ کر اپنا اپنا نقطۂ نظر واضح کر رہے تھے۔

''اسے آپشن نہیں کہتے جو آپ نے میرے سامنے رکھا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ اگر میں نے سائنس سبجیکٹس نہیں پڑھے تو آپ مجھے سڈنی، بڑے ماموں کے پاس بھجوا دیں گی، اس لیے مجھے مجبوراً سائنس سبجیکٹس ہی پڑھنے پڑے، ورنہ آپ جانتی

ہیں میں کامرس پڑھنا چاہتا تھا۔'' وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہوگیا۔ وہ بھی کچھ دیر کو خاموش ہوگئی تھیں کیونکہ بات وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اس نے پاپا کے مشورے سے کامرس پڑھنی چاہی تو ممی نے اس ایشو کو اَنا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ وہ کسی قیمت پر اسے کامرس نہیں پڑھنے دینا چاہتی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی رہیں پھر ان کے چہرے پر بے بسی و بے چارگی کے تاثرات در آئے۔ ان کی خفگی کسی اور جذبے میں ڈھلنے لگی۔

''اس شخص نے تم پر کوئی جادو کر دیا ہے جو تم میری کسی بات کو سننے پر تیار نہیں ہوتے۔ تم میری اولاد نہیں ہو، تم صرف اس شخص کی اولاد ہو۔ تمہیں کبھی بھی میرا احساس نہیں رہا۔ میں نے تمہاری بہتری کے لیے اپنا آپ قربان کر ڈالا مگر پھر بھی تم اس شخص کے نام کی تسبیح کرنے سے باز نہیں آئے۔ تم نے کبھی مجھے اچھا سمجھا ہی نہیں۔ حالانکہ میں نے تمہارے لیے......'' آنسو ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

ممی کے دل میں ہمیشہ پاپا کے لیے غبار رہتا تھا۔ اس کے ممی پاپا کے بیچ اس کی پیدائش کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد علیحدگی ہوگئی تھی۔ اس کے بعد پاپا نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ممی کے دل میں موجود غلط فہمیوں کو دور کر سکیں، مگر وہ اپنی ہر کوشش میں ناکام رہے تھے۔ اپنے بچوں سے ملاقات کے لیے بھی انہیں کورٹ سے آرڈر حاصل کرنا پڑا تھا مگر ایک جنگ وہ ممی سے لڑے بغیر ہی جیت چکے تھے۔ ان کا بیٹا مکمل طور سے ان کے قابو میں تھا اور یہی بات اس کی ممی کو تاؤ دلائے رکھتی تھی۔ وہ کورٹ آرڈر کی وجہ سے اسے اپنے پاپا سے ملنے سے نہیں روک سکتی تھیں مگر وہ اس پر ہر معاملے میں نہایت سختی روا رکھتی تھیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ ان سے اتنا خائف رہتا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ماں سے محبت نہیں کرتا تھا۔ انہیں اس طرح سے روتا دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا وہ ان کے قریب آ کر جھجکتے ہوئے کارپٹ پہ ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''آئی ایم سوری ممی! آپ پلیز روئیے مت۔ ٹرائی ٹو انڈرسٹینڈ می ممی! میں نے بہت کوشش کی مگر......'' وہ ان کے بہتے آنسو دیکھ کر بے حد پشیمان تھا۔

''میں کیا کروں ممی! میرا اس طرف رجحان ہی نہیں ہے۔ مجھے بائیولوجی، کیمسٹری وغیرہ بالکل سمجھ میں نہیں آتے۔'' اس کی ممی نے اپنے گھٹنوں پر رکھے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے۔

''تمہیں احساس ہے میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا۔ تمہیں بہتر سے بہتر چیز فراہم کرنے کے چکر میں، میں نے خود کو بھی فراموش کر ڈالا۔ کتنی رقم خرچ کی میں نے تم پر۔ مہنگی کتابیں، بہترین ٹیوٹر، اعلیٰ انسٹی ٹیوٹ، کسی ایک چیز کی...... ایک چیز کی تو لاج رکھی ہوتی سنی!'' وہ ایک بار پھر رونے لگیں۔

''مجھے پلیز معاف کر دیجیے ممی! پلیز ممی......''

''تم ہر جگہ مجھے شرمندہ کرواتے ہو۔ تم کیسے بیٹے ہو سنی! بیٹے ایسے تو نہیں ہوتے۔ بیٹے تو ماؤں کا مان ہوا کرتے ہیں۔ تم ایسے کیوں ہو سنی!'' اب کی بار وہ بلکنے لگیں۔ یہ سلسلہ مزید چل سکتا تھا مگر دفعتاً فون کی بیل بج اٹھی۔ ممی نے بہتے آنسو پونچھ کر فون اٹھا لیا۔ دوسری جانب اس کے پاپا تھے۔

''وہ تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔'' انہوں نے سختی سے کہہ کر فون بند کر دیا جب کہ وہ بے چینی سے پاپا کے فون کا منتظر تھا۔

''آپ کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا ممی!'' اس کا اتنا کہنا قیامت ہوگیا۔

''تمہیں میرے جھوٹ یا سچ کی پروا نہیں ہونی چاہیے۔ تم صرف اپنی پروا کرو یا پھر اپنے باپ کی۔ تمہاری بلا سے میں

جیوں یا مروں۔ وہ ہے نا، تمہارا باپ......'' انہوں نے اس کے پاپا کے لیے بلا دریغ دو تین گالیوں کا استعمال کیا۔

''آپ مجھے گالیاں دے دیجئے مگر پاپا کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ یک دم مشتعل ہو کر بولا۔ اس کا لہجہ اتنا اونچا تھا کہ لحہ بھر کو اس کی ممی بھی خاموش ہو گئیں۔

''تمہیں میرے ساتھ زیادہ زبان چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں سے اٹھو، اپنے کمرے میں جاؤ۔ اب کی بار میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتوں گی۔ آج کی تاریخ میں لکھ لو، ٹھیک چھ ماہ بعد میں تمہیں سڈنی بھجوا دوں گی۔ مجھے تمہارے جیسے پیراسائٹ کی ضرورت نہیں ہے۔'' ان کی بات سن کر وہ بدک اٹھا۔

''آپ شاید اپنے حواسوں میں نہیں ہیں ممی! میں کبھی سڈنی نہیں جاؤں گا۔ آپ کو میرے جیسے پیراسائٹ کی ضرورت نہیں ہے تو کوئی بات نہیں، میں پاپا کے پاس چلا جاتا ہوں۔'' اس نے انہی کے انداز میں ہٹیلے پن سے کہا۔ اسے جواب دینا بھی انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ وہ خاموشی سے اٹھیں اور اپنے کمرے کی سمت چل دیں۔

''تم جانتے ہو میں اپنے فیصلے تبدیل نہیں کرتی۔'' لاؤنج کا دروازہ چھوڑنے سے پہلے انہوں نے کہا۔

''میں بھی آپ ہی کا بیٹا ہوں ممی!'' وہ چلا کر بولا لیکن اس کی آواز در و دیوار سے ٹکرا کر واپس آ گئی تھی۔ ممی کمرے سے جا چکی تھیں۔ وہ کافی دیر تک وہیں بیٹھا کھولتا رہا پھر اس نے سینٹرل ٹیبل پر پڑا کرسٹل کا نفیس سا گلدان اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

''میں مر کر بھی آسٹریلیا نہیں جاؤں گا، کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں۔ آپ لکھ لیجئے ممی! میں نہیں جاؤں گا۔'' وہ کافی دیر تک اونچی آواز میں بڑبڑاتا رہا۔ اپنے کمرے میں آ کر بھی اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے موبائل سے پاپا کے موبائل پہ کال کرتا رہا مگر کوئی رسپانس نہیں آ رہا تھا۔ کافی دیر تک غصہ کرنے کے بعد وہ بستر پہ گر گیا اور چھوٹے بچوں کی طرح رونے لگا۔ یونہی روتے روتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ عام حالات میں تو اماں بی اسے صبح جگا دیا کرتی تھیں مگر جب بھی اس کا اور ممی کا جھگڑا ہوتا تو وہ بھی اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتیں کہ بہر حال ملازمہ تھیں اور مالکن کے مزاج کے مطابق چلنے میں ہی عافیت سمجھتی تھیں۔

اسے ممی کے ساتھ ساتھ باقی گھر والوں پہ بھی غصہ آنے لگا۔ اس کی بہن بالکل اس کی ممی کی کاربن کاپی تھی۔ اسے جب ضرورت ہوتی تو وہ بھائی سے محبت سے بات کر لیتی تھی، ورنہ اپنی دنیا میں مگن رہتی۔ اس کے لاتعداد فرینڈز اور ایک عدد منگیتر ہی اس کی زندگی کا محور تھے۔ ایسے میں وہ بے چارا خود کو بہت مِس فٹ محسوس کرتا۔ وہ ممی سے یا بہن سے کوئی بھی بات ڈسکس نہیں کر سکتا تھا۔

''میں بھی دیکھتا ہوں ممی مجھے پاکستان چھوڑنے کے لیے کس طرح مجبور کرتی ہیں۔'' یہی سب سوچتے ہوئے وہ بستر سے اتر کر زمین پہ کھڑا ہو گیا۔ اپنی ٹی شرٹ اتار کر اس نے بیڈ پر پھینک دی اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے مسلز پھلا پھلا کر دیکھنے لگا۔ اچھی خوراک اور ورزش کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کافی بڑا دکھائی دیتا تھا۔ اپنا جائزہ لینے کے بعد وہ دیوار گیر الماری کی جانب بڑھا۔ سی ڈی پلیئر کے پاس آ کر اس نے ایک سی ڈی منتخب کر کے چلا دیا۔ والیوم فل کر کے وہ وارڈروب کی سمت آیا پھر کپڑوں کے نیچے سے اس نے مارون گولڈ کا پیکٹ نکالا تھا۔ یہ لت اسے چند دن پہلے لگی تھی۔ سگریٹ سلگا کر اس نے پیکٹ کو دوبارہ چھپایا اور خود بیڈ پر ڈھیر ہو کر سگریٹ اور میوزک سے لطف اندوز ہونے لگا۔



''میں تزئین بخاری ہوں۔'' مریم نے اس آواز پہ سر اٹھا کر دیکھا پھر جھجکتے ہوئے اپنے سامنے کھڑی اس دراز قامت لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ اس لڑکی کے مقابلے میں مریم گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی بلکہ اس پہ کیا موقوف شہر کے سب سے بڑے ہسپتال کے نرسنگ سکول کے اس ہال میں موجود بہت سی لڑکیاں کافی سے زیادہ گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ کا شکار تھیں۔ کلاس میں یہ ان سب کا پہلا دن تھا۔ ایسی صورتِ حال میں تزئین بخاری کے اس کے ساتھ والی کرسی پر آ کر بیٹھنے اور مخاطب کرنے میں پہل کرنے سے مریم کو بہت ڈھارس ملی۔

''میں مریم چوہدری ہوں۔'' اس نے جھجکتے ہوئے اپنا نام بتایا۔

''نائس ٹو میٹ یو...... ویسے تمہیں تعارف کی ضرورت نہیں۔ تمہارے مارکس اتنے اچھے ہیں کہ تقریباً ساری کلاس تمہیں تمہارے نام سے مخاطب کرنے کی بجائے آٹھ سو نمبر والی لڑکی کہہ کر تمہارا ذکر کر رہی ہے۔'' تزئین نے سابقہ انداز میں کہا تو مریم کو شرم سی آ گئی۔ پہلی تعارفی کلاس میں اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس نے میڈم کو اپنے کُل نمبرز بھی بتائے تھے۔ میڈم کے ساتھ ساتھ پوری کلاس بھی کافی متاثر ہوئی تھی۔ آٹھ سو یا آٹھ سو سے زیادہ نمبرز لے کر پری میڈیکل پاس کرنا اتنی حیرانی والی بات نہیں تھی۔ حیرانی والی بات یہ تھی کہ اتنے شاندار مارکس لے کر ایک لڑکی نرسنگ پڑھنے چلی آئی تھی۔ میڈم نے سب لڑکیوں کو مریم کے لیے تالیاں بجانے کے لیے کہا تھا، تب بھی مریم شرما سی گئی تھی۔

''ارے تم ایسے شرما رہی ہو جیسے آٹھ سو نمبر تمہارے دولہا کا نام ہے۔'' تزئین نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ مریم کی شکل ایک بار پھر دیکھنے والی تھی۔ اس کی دودھیا رنگت پہ سرخی پھیلنے میں بس لمحہ لگتا تھا۔ اسے تزئین کی بات عجیب سی لگی۔ وہ شرما نہیں رہی تھی، بس اسے تعریف سمیٹنے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔

''مجھے لگتا ہے، میں اس کلاس کی واحد گھوڑی ہوں، باقی سب تو میرے مقابلے میں بکریاں لگ رہی ہیں۔'' اس کی خاموشی سے اُکتا کر تزئین نے کہا تو مریم کو ایک بار پھر مسکرانا پڑا۔ وہ اس کی بات کی تردید کیے بغیر کلاس کا جائزہ لینے لگی۔ وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہہ رہی تھی۔ کلاس کی باقی لڑکیاں بشمول مریم کے اتنی دراز قامت نہیں تھیں جتنی کہ تزئین اور یہی قد و قامت اسے نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا تھا۔

''تمہاری اسکن بہت خوبصورت ہے، کیا استعمال کرتی ہو؟''

اب کی بار بھی تزئین کے سوال نے مریم کو الجھا دیا۔ وہ باقی لڑکیوں کی طرح گھبراہٹ و ہچکچاہٹ کا ذکر کرنے کی بجائے عجیب ہی باتیں کر رہی تھی۔

''پہلے میری اسکن بھی بہت اچھی ہوتی تھی، فریش اور گلوئنگ پھر پمپلز ہونا شروع ہو گئے۔ دراصل مجھے میک اَپ کرنے کا بہت شوق ہے۔ ہر وقت چہرے پہ الا بلا تھوپنے کے باعث یہ حشر ہو گیا۔'' وہ مسکراتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں اپنے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ مریم ایک بار پھر مصنوعی انداز میں مسکرائی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ تزئین کو سننے سے زیادہ بولنے سے دلچسپی ہے۔ وہ مریم کے استفسار کیے بغیر مریم کو بتانے لگی کہ اس کی چکنی جلد کے لیے وہ کون کون سے ٹوٹکے استعمال کرتی ہے۔ مریم کو ایسی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لائف بوائے صابن سے نہانے والی اور لسی سے بال دھونے والی مریم چوہدری کے لیے اسکربنگ، کلینزنگ، اسٹرنجنٹ وغیرہ جیسے الفاظ بہت نئے اور انوکھے تھے۔ وہ تزئین کی باتیں نہایت عدم دلچسپی سے سن رہی تھی، جب ایک نہایت مہین سی آواز اس کو سنائی دی۔

''آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟'' اس نے بائیں طرف بیٹھی لڑکی سے استفسار کیا۔

"جی..... میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں نے پہلی کلاس نہیں لی تھی، آپ مجھے کورس آؤٹ لائن بتا دیں گی؟" وہ لڑکی پہلے سے بھی زیادہ دھیمے اور مسکین سے لہجے میں بولی۔ مریم کو دل ہی دل میں تھوڑا سا اطمینان ہوا کہ کوئی لڑکی اس سے بھی زیادہ گھبراہٹ کا شکار تھی، وگرنہ تو وہ خود کو ہی سب سے زیادہ پزل محسوس کر رہی تھی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" مریم نے اپنی نوٹ بک کھولتے ہوئے اس سے پوچھا۔ تزئین ان دونوں کو باتیں کرتا دیکھ کر کسی اور لڑکی کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

"روبینہ یاسمین۔" وہ لڑکی بولی۔ اس کی آواز بہت باریک تھی اور اس کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے ابھی رو دے گی۔

"میں آپ کو آؤٹ لائن لکھوا دیتی ہوں مگر آپ پریشان مت ہونا۔ ابھی تو ابتداء ہے، اس لیے بہت مشکل لگے گا مگر ظاہر ہے ہم انٹر تک یہی باتیں بہت مرتبہ پڑھ چکے ہیں، اس لیے....."

"میں نے تو ابھی میٹرک کیا ہے۔" وہ مریم کی بات کاٹ کر بولی۔

"اچھا....." وہ حیرت سے بولی۔

"پہلے سال جنرل نرسنگ میں ہمیں اناٹومی، فزیالوجی، کیمونٹی میڈیسن، نیوٹریشن، انگلش اور مائیکرو بائیالوجی پڑھائیں گے۔ پہلے تین ماہ صرف بنیادی چیزیں پڑھائیں گے پھر....."

"فزیالوجی کے اسپیلنگ بتا دیں پلیز۔" روبینہ اس کی بات کاٹ کر سر جھکائے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی تو مریم کے منہ کا زاویہ بگڑتے بگڑتے رہ گیا۔

"واٹ ربش۔ تمہیں فزیالوجی کے اسپیلنگ بھی نہیں آتے۔ لاؤ میں لکھ دیتی ہوں کورس آؤٹ لائن۔"

مریم کے کچھ کہنے سے قبل تزئین نے روبینہ کے ہاتھ سے نوٹ بک لے کر اس پر کورس آؤٹ لائن لکھنا شروع کر دی۔

جب اس نے Physiology کو Fysiology لکھا تو مریم نے گہرا سانس بھر کر اپنی نوٹ بک اس کے سامنے رکھ دی، تا کہ وہ اس پر سے نقل کر کے کورس آؤٹ لائن لکھ دے۔ ساری کلاس ہی تقریباً اپنی اپنی نوٹ بکس کھولے اسی قسم کے کاموں میں مشغول تھی۔ سب کے چہروں پر فکرمندی کے اثرات غالب تھے، کیونکہ پہلی ہی کلاس میں میڈم بتا چکی تھیں کہ جنرل نرسنگ کے لیے کوالیفائی کرنے کے لیے انہیں ٹیسٹ والے مرحلے سے گزرنا پڑے گا جو تین ماہ بعد ہونا تھا۔ اس ٹیسٹ کو کلیئر کرنے کی صورت میں ہی وہ کوالیفائی کر سکتی تھیں، وگرنہ نہیں۔

کورس آؤٹ لائن لکھ کر دینے کے بعد تزئین اب روبینہ کو پیڈی کیور اور مینی کیور کے متعلق بتا رہی تھی۔



"میں نے نرسنگ اس لیے جوائن کی کہ میں دکھی انسانیت کی خدمت کر کے یسوع مسیح کے نیک اور پیارے بندوں میں اپنا نام لکھوانا چاہتی ہوں۔" ستارہ مسیح نے سینے پہ صلیب بناتے ہوئے کہا تو ہال میں موجود بہت سی لڑکیوں نے بھی صلیب کا نشان بنایا۔ وہ تینوں ایک ہی رو میں بیٹھی یہ سب کارروائی دیکھ رہی تھیں۔ ستارہ مسیح کی بات سن کر مریم نے تالیاں بجائیں تو روبینہ بھی اس کی تقلید میں تالیاں بجانے لگی۔ جب کہ تزئین نے چیونگم چباتے ہوئے صرف ناک چڑھانے پر اکتفا کیا۔ مزاج کے تفاوت کے باوجود ان تینوں کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہاں پر اسی فیصد لڑکیاں کرسچین تھیں۔ دس فیصد کچھ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھتی تھیں، جب کہ باقی پانچ فیصد مسلمان لڑکیاں تھیں۔ ان پانچ فیصد مسلمان لڑکیوں میں اگر مریم اپنی ہم مزاج لڑکی ڈھونڈنے نکلتی تو شاید اسے سارا سیشن اکیلے ہی گزارنا پڑتا، اس لیے اس نے روبینہ اور تزئین کی دوستی کو نہ

صرف قبول کر لیا تھا بلکہ ہاسٹل میں وہ تینوں ایک ہی کمرے میں اپنی الاٹمنٹ کروا چکی تھیں۔

ہاسٹل کے اس بڑے سے ہال میں یہ پارٹی سینئرز کی طرف سے نئی آنے والی لڑکیوں کے لیے ارینج کی گئی تھی۔ سب ہی لڑکیاں باری باری وہ وجہ بتا رہی تھیں جس کی وجہ سے انہوں نے نرسنگ کو بطور کیریئر اپنانے کا سوچا تھا۔

"مجھے بچپن سے ہی میڈیسن پڑھنے کا شوق تھا۔ میڈیکل میں ایڈمیشن نہ ہو سکا تو میں نے یہاں ایڈمیشن لے لیا۔" اپنی باری پہ مریم نے اعتماد سے کہا۔ پہلے دن کی نسبت اب وہ کافی پُراعتماد ہو چکی تھی۔

"مجھے بھی شوق ہی ہے جی۔" روبینہ نے اپنی باری آنے پہ مخصوص انداز میں کہا۔ بہت سی لڑکیوں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ روبینہ کا لہجہ ہی کچھ اس قسم کا تھا۔

"مجھے شوق ہی نہیں بلکہ جنون ہے۔" تزئین سپاٹ سے لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں سے جھانکتا طنز مریم سے مخفی نہیں رہا تھا۔ اس کے دل میں شدت سے خواہش جاگی کہ وہ اس موضوع پر تزئین سے کھل کر بحث کرے مگر اسے موقع نہ مل سکا۔ ڈنر کے بعد پارٹی کا اختتام ہوا تو وہ اپنے کمروں میں آ گئیں۔ مریم نے تہیہ کر رکھا تھا کہ آج کی رات تزئین سے وجہ دریافت کر کے رہے گی کہ اس نے یہ پروفیشن کیوں اپنایا، جب کہ وہ اسے اس قدر ناپسند کرتی تھی۔ روبینہ کے سونے تک اسے انتظار کرنا پڑا مگر اس کے سونے کا اطمینان کرنے کے بعد وہ خود کو ایک لحہ بھی روک نہ پائی۔

"تزئین! تم نے بتایا نہیں کہ تم نے نرسنگ کیوں جوائن کی؟" اس نے اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے سوال کیا۔ تزئین اپنے ہاتھوں کا مساج کر رہی تھی۔ اس کی بات سن کر لحہ بھر کے لیے رک سی گئی پھر مریم کی طرف دیکھ کر بولی۔

"تم نے پوچھا بھی تو نہیں کہ میں نے نرسنگ کیوں جوائن کی؟" اس کے انداز نے مریم کو الجھن میں مبتلا کیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید تزئین اس سوال کو ٹال دے گی۔

"میں پوچھوں گی تو تم بتا دو گی؟" اس نے ایک اور سوال کیا۔

"ویل..... بتا دوں گی..... یقیناً بتا دوں گی..... تم سے میں کچھ نہیں چھپاؤں گی کیونکہ مجھے اگلے چار سال تک تمہارے ساتھ اسی کمرے میں رہنا ہے مگر....." اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی پھر اپنے بستر سے اٹھ کر اس کے بستر پر آ کر اسی کے سرہانے پہ سر ٹکا کر لیٹتے ہوئے بولی۔

"مگر پھر تمہیں بھی اصل وجہ بتانا پڑے گی۔"

"میں ہال میں سب لڑکیوں کے سامنے بھی بتا چکی ہوں اور اب پھر ایک بار بتا دیتی ہوں کہ میرا شوق مجھے اس فیلڈ میں لایا۔ میں صرف اسی فیلڈ میں کامیاب ہو سکتی تھی، اس لیے میں نے اسے بطور پروفیشن اپنانے کے لیے یہاں ایڈمیشن لے لیا۔" مریم نے ایک ہی سانس میں کہا تو تزئین کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی جس نے مریم کو کسی قدر الجھا دیا۔

"تمہیں شاید میری بات کا یقین نہیں ہے بلکہ تمہیں کسی کی بھی بات کا یقین نہیں آتا۔ ہال میں جب دوسری کلاس فیلوز نے یہ سب کہا تب بھی تمہارے چہرے پہ ایسی ہی مسکراہٹ تھی جیسی اب تمہارے چہرے پر ہے۔" وہ جل کر بولی تو تزئین ہنس دی۔

"میرے چہرے پہ ایسی مسکراہٹ اس لیے آتی ہے کہ میں تم سب لوگوں کے کھوکھلے لہجے با آسانی پہچان سکتی ہوں۔ اگر کوئی یہ لڑکی کہے کہ وہ نرسنگ کی طرف اس لیے آئی کہ اسے شوق ہے تو مجھے یہ اس صدی کا سب سے بڑا لطیفہ لگتا ہے۔ بھلا کوئی انسان اپنی ضرورت کو اپنا شوق کیسے کہہ سکتا ہے۔" وہ سادہ سے انداز میں ایک تلخ سی بات کہہ رہی تھی۔ مریم کو اس کی

بات سے اتفاق نہیں تھا مگر وہ خاموش رہی تا کہ تزئین اپنی بات مکمل کرے۔

''تم جانتی ہو میں نے یہ فیلڈ کیوں اپنائی؟ کیونکہ اس میں مجھے اتنے روپے مل جائیں گے کہ میں اپنی بہت سی معاشی ضروریات باآسانی پورا کرنے کے قابل ہو جاؤں گی، کسی بھی اور پروفیشن کو اپنانے کے لیے۔ سب سے پہلے مجھے اس کے متعلق سب پڑھنا پڑے گا اور پھر جاب حاصل کرنے کا ایک نا ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا، جب کہ نرسنگ میں تو ابتدائی مہینوں میں ہی الاؤنس ملنے لگتا ہے۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے سانس لینے کو رکی۔

''یہ صرف اور صرف میری ضرورت ہے مریم! تم جانتی ہو میرے باپ نے میری امی کو تب چھوڑ دیا تھا جب میں صرف تین دن کی تھی۔ میری امی کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے دوسری بیٹی کو جنم دیا تھا جب کہ میرے باپ کو بیٹے کی خواہش تھی۔ میری امی مجھے اور میری دو سالہ بہن کو لے کر اس دنیا کی ٹھوکریں کھانے کے لیے شوہر کے گھر کو چھوڑ کر آنے کے لیے مجبور کر دی گئیں۔ امی نے ایک پارلر میں ہیلپر کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ وہ ساری زندگی روپے جمع کرنے کی کوشش کرتی رہیں تا کہ اپنا ذاتی پارلر بنا سکیں، دن رات کی محنت کے باوجود وہ کبھی اتنے روپے جمع نہیں کر پائیں۔ میری بہن نے سترہ سال کی عمر میں ایک بوتیک میں جاب کر لی اور آج تک وہیں جاب کر رہی ہے۔ اس کے پاس کبھی اتنی رقم جمع نہ ہو سکی کہ اس بوتیک سے خود اپنے لیے ایک سوٹ ہی خرید سکے۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر لہجہ سسک رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں، میری امی اور میری بہن ہمیشہ اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کے لیے سسکتی رہیں گی۔ ان دونوں کو ملنے والے دو دو ہزار روپے ہمیں زندگی کی ہر چھوٹی آسائش کے لیے ترسانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے مجھے دیکھ کر شاید تمہیں یہ لگتا ہو کہ میں بہت مال دار لڑکی ہوں مگر یہ سب ملمع کاری ہے جو میں نے خود پر کی ہوئی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ مجھے غریب سمجھ کر دھتکاریں۔ میں اپنی امی اور بہن کی طرح ترس ترس کر جینا نہیں چاہتی۔ میں ائیر ہوسٹس کے لیے قومی ائیر لائن میں بھی اپلائی کر چکی ہوں۔ میں نے ماڈلنگ کے لیے بھی آڈیشن دیئے ہیں مگر وہاں میری قسمت نے ساتھ نہیں دیا، اس لیے میں نے اس فیلڈ کو اپنا لیا۔ حالانکہ میری امی کی اخلاقیات پہ اس بات سے بہت کاری ضرب پڑی ہے مگر پھر بھی میں خوش ہوں کہ ان پر فی الحال بوجھ نہیں بنوں گی۔ الاؤنسز ملنا شروع ہوں گے تو میں امی اور باجی سے ایک روپیہ لینا بھی چھوڑ دوں گی۔'' مریم خاموشی سے اس کی بات سن رہی تھی، مگر بات مکمل ہو جانے پہ وہ تڑپ کر بولی۔

''تمہاری امی تمہارے اس فیصلے سے ناخوش کیوں ہیں؟'' تزئین نے جواب دینے کی بجائے ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

''اتنی معصوم مت بنو مریم! میری امی تو میرے عزائم سے ویسے بھی خائف رہتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں چند روپوں کی خاطر ہر حد پار کر سکتی ہوں۔ انہیں میرا کوئی بھی کام کرنا پسند نہیں ہے۔ انہیں ائیر ہوسٹنگ ناپسند ہے، انہیں ماڈلنگ ناپسند ہے، انہیں نرسنگ ناپسند ہے۔ شاید انہیں میں بھی ناپسند ہوں۔ ہر وہ کام جو ہمیں جلدی امیر کر سکتا ہے، انہیں ناپسند ہے۔'' مریم کو تزئین کی باتیں بہت عجیب اور تکلیف دہ لگ رہی تھیں۔ اس کے ابو نے بھی اس کے اس فیلڈ کو اپنانے کے فیصلے کی مخالفت کی تھی مگر اس کی ضد کے آگے ان کی ایک نہیں چلی تھی، مگر اس کے ابو کے دل میں تزئین کی امی کی طرح کے خدشات نہیں تھے۔



''مریم......'' ناشتہ کے فوراً بعد وہ اپنا یونیفارم پریس کر رہی تھی، جب عقب سے تزئین کی آواز سنائی دی۔ اس نے منہ

سے کچھ کہنے کی بجائے صرف گردن موڑ کر دیکھنے پہ اکتفا کیا۔

''میں امید رکھتی ہوں کہ جو کچھ میں نے رات کو تم سے ڈسکس کیا، وہ سب تم بھول چکی ہو گی۔'' تزئین کے لہجے میں اس قدر سادگی و بے بسی تھی کہ مریم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ مریم سے اپنا ہر راز کہہ دینے کے بعد اب خدشات کا شکار تھی۔ مریم نے استری کا پلگ اتارا اور تزئین کے قریب آ گئی۔

''میں نے تمہیں دوست کہا ہی نہیں دل سے تسلیم بھی کیا ہے اور جسے میں دوست مان لیتی ہوں، اس کے ساتھ میں مرتے دم تک دوستی نبھاتی ہوں۔ رات جو کچھ تم نے مجھ سے کہا، میں نے سب بھلا دیا ہے۔'' وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر محبت سے بولی۔ تزئین کے چہرے پر تشکرانہ جذبات ذرا کی ذرا چمکے پھر وہ اپنی جون میں واپس آتے ہوئے بولی۔

''ایک بات کا دھیان رکھنا۔ آئندہ کبھی مجھ سے سورج ڈھلنے کے بعد اتنی محبت سے کچھ مت پوچھنا۔ میرا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔'' مریم زور سے ہنس دی، اسی وقت روبینہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''تم مجھ پر ہنس رہی تھیں نا؟'' ہاسٹل میں اور پھر نرسنگ سکول میں بہت سی لڑکیوں کے ساتھ وقت گزار کر وہ اپنے بارے میں کچھ محتاط ہو چلی تھی۔

''ارے نہیں پاگل۔ دراصل میں نے مریم کو لطیفہ سنایا تھا، اس لیے یہ ہنس رہی تھی۔ تم نے شاور نہیں لیا؟'' تزئین نے اس کو ٹالنے والے انداز میں کہا، پھر اس کا خشک سر دیکھ کر استفسار کیا۔

''میں نے تو کچھ نہیں لیا۔'' روبینہ ناسمجھی کے انداز میں بولی تو تزئین اور مریم دونوں ہی ہنس دیں۔ روبینہ کی انگریزی کافی سے زیادہ خراب تھی۔

''تزئین نے پوچھا ہے تم نہائیں کیوں نہیں؟'' مریم نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ روبینہ نے کندھے پہ رکھا تولیہ بستر پر پھینکا اور خود تزئین کے بستر پر دھپ سے بیٹھ گئی۔

''میں اس غسل خانے میں نہیں نہا سکتی، وہاں اتنا بڑا لال بیگ ہے اور دیوار کے ساتھ ایک چھپکلی بھی چپکی ہے۔ مجھے بے پردگی کا احساس ہوتا ہے۔'' روبینہ کے اس طرح سے کہنے پہ وہ دونوں پھر سے ہنس دیں۔

''او چک جھمرہ کی شہزادی! تم یہاں کیا کرنے آ گئی ہو، وہیں چک جھمرہ میں رہتیں نا۔ یعنی میڈم کو چھپکلی کے سامنے بے پردگی کا احساس ہوتا ہے۔'' تزئین نے شگفتہ سے انداز میں اسے چڑانا چاہا۔ مریم کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بکھری۔ اسے گھر کی یاد آ گئی تھی۔ اسے بھی چھپکلی اور دوسرے حشرات وغیرہ سے بہت ڈر لگتا تھا۔ برسات کے دنوں میں جب کیڑے مکوڑے نکلتے تو وہ چیخنے چلانے لگتی۔ حیدر اس کا خوب مذاق اڑاتا اور پھر جب امی یا پھپھو میں سے کوئی آ کر پوچھتا تو عمر مسکین سی شکل بنا کر کہتا۔

''دیکھیں نا مامی! دولہا بھائی پہلی بار گھر آئے ہیں اور مریم بی بی کس طرح شرما رہی ہیں۔'' اس کا اشارہ کاکروچ یا مینڈک وغیرہ کی طرف ہوتا۔ مریم کا غصے سے برا حال ہو جاتا، جب کہ باقی سب مسکرانے لگتے۔ اب بھی یہ سب یاد آیا تو وہ مسکرانے لگی پھر تزئین اور روبینہ کو آپس میں الجھتا چھوڑ کر وہ خود غسل خانے کی سمت چل دی۔ گھر سے نکلتے ہی اسے لگنے لگا تھا جیسے وہ بہت بہادر ہو چکی ہے اور وہ لڑکی جو شہد کی مکھی سے بھی ڈرا کرتی تھی، اسی غسل خانے میں کپڑے تبدیل کرنے چل دی، جہاں ایک کاکروچ موجود تھا اور دیوار سے چھپکلی بھی چپکی تھی، کیونکہ یہاں کوئی حیدر یا عمر نہیں تھا جو اس کی تسلی کی خاطر جوتا لے کر چھپکلی کے پیچھے بھاگتے۔ اسے یہاں اکیلے رہنا تھا اور بہت سی مشکلات کا اکیلے ہی مقابلہ کرنا تھا۔

○……❖……○

''مجھے لگتا ہے اگر ہم پاپا کے ساتھ رہا کرتے تو ہم سے زیادہ خوش قسمت کوئی نہ ہوتا۔'' ڈبل روٹی کے دو سلائسز کے بیچ آملیٹ کو سیٹ کرتے ہوئے اس نے اپنی بہن سے کہا جو اس کے ساتھ والی چیئر پر بیٹھی اورنج جوس گھونٹ گھونٹ اپنے اندر منتقل کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر لاپروائی اور بے نیازی کا عنصر نمایاں تھا۔

''تمہیں نہیں لگتا کہ اگر......''

''اماں بی! میرا بریک فاسٹ لے بھی آئیے۔'' اس کی بہن اس کی بات کاٹ کر بولی۔ وہ ناشتے میں جوس کے بعد بوائل انڈہ کھاتی تھی جو ٹیبل پر موجود نہیں تھا۔ اپنی بہن کے اس طرح سے بات کاٹ دینے سے وہ جی بھر کر بدمزہ ہوا۔

''بولو نا ماہی! تمہیں کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا۔'' وہ اپنا تیار کردہ سینڈوچ نگلتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

''تم چھوٹا بائٹ نہیں لے سکتے۔'' اس کی بہن نے ناگواری سے اپنی ننھی سی ناک چڑھا کر کہا۔

''تم میری بات کا جواب نہیں دے سکتیں۔'' وہ اسی کے انداز میں بولا۔

''نہیں، اس لیے کہ مجھے تمہاری بے سرو پا باتوں میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ میں ممی کے ساتھ رہنے کو بھی اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی سمجھتی ہوں۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولی۔

''گو ٹو ہیل (بھاڑ میں جاؤ) تم ہو ہی احسان فراموش...... جب بڑی بڑی اماؤنٹس (رقوم) چاہیے ہوتی ہیں تو کیسے پاپا کے ساتھ اپنا رویہ درست کر لیتی ہو۔ بھاگ بھاگ کر ان کے پاس جاتی ہو اور جب مطلب نکل جاتا ہے تو پھر ممی کی چمچی بن جاتی ہو۔'' وہ اپنی بہن کو کھا جانے والے انداز میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اسی اثناء میں اماں بی ناشتے کے مزید لوازمات میز پر سجانے لگیں۔ وہ دونوں ان کی موجودگی کے باعث چپ ہو گئے تھے مگر ان کی نگاہوں میں ایک دوسرے کے لیے اس قدر بیزاری تھی کہ اماں بی پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔

''تم دونوں جھگڑا کر رہے تھے؟'' اماں بی ان کی آیا تھیں اور وہ دونوں ہی اماں بی سے بہت اٹیچڈ تھے۔

''ہم دونوں نہیں۔ صرف یہ لڑ رہا تھا مجھ سے...... آپ جانتی ہیں اماں بی! جھگڑے کی عادت مجھے نہیں، اسے ہے۔'' اس کی بہن نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا تو وہ بھڑک اٹھا۔

''ہاں میں تو لڑاکا طیارہ ہوں۔ ہر وقت ہر ایک سے جھگڑنا میری تو فیورٹ ہابی ہے۔'' وہ اپنے آگے رکھی پلیٹ کھسکاتے ہوئے بولا۔ پلیٹ سامنے رکھے جوس سے بھرے گلاس سے ٹکرائی۔ گلاس لڑکھڑایا اور جوس کناروں سے چھلک کر ڈبل روٹی کے سلائسز پر گرا۔ اماں بی نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ گزشتہ کچھ دنوں سے وہ کچھ زیادہ ہی چڑچڑا ہوتا جا رہا تھا۔ غصیلا تو وہ بچپن سے ہی تھا مگر اب ہر ایک سے بدتمیزی کرنا جیسے اس کی عادت بن چکی تھی۔ انہیں اس کی اسی سرکشی سے خوف آتا تھا۔

''ارے بیٹا! بہن نے ایسا تو نہیں کہا جو تم اس قدر بے قابو ہو رہے ہو۔ دیکھو ذرا کیا حشر کر دیا تم نے۔'' ان کا اشارہ میز کی ابتر حالت کی جانب تھا۔ اس نے ایک نظر میز کی جانب اور دوسری اماں بی پر ڈالی۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے لبالب بھری تھیں۔ اماں بی کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ اٹھارہ سالہ جوان لڑکا بالکل آٹھ سالہ بچے کی طرح لگ رہا تھا۔

''مجھے تم سے نفرت ہے، سب سے، تم سب قابلِ نفرت ہو۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اماں بی اور اس کی بہن نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا پھر دونوں نے ہی ایک دوسرے سے نظر چرا لیں۔

''بچہ ہے، جذباتی ہو جاتا ہے۔ بیگم صاحبہ بھی تو زبردستی اسے سڈنی بھجوا کر اچھا نہیں کر رہیں۔'' اماں بی نے جوس سے بھیگے سلائس الگ پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''بچہ ہے......؟ اماں بی! اٹھارہ سال کا ہو چکا ہے، بچہ نہیں رہا، آپ جانتی ہیں یہ اسموکنگ کرنے لگا ہے۔ میں نے خود اس کو دیکھا ہے۔ بعد میں وارڈ روب چیک کی تو وہاں سگریٹ کا پیکٹ بھی ملا اور آپ کہتی ہیں......'' اس کی بہن کو جوشِ جذبات میں پتا نہیں چلا کہ وہ اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو چکا ہے۔

''ہاں نہیں ہوں میں بچہ...... بہت بڑا ہو چکا ہوں اور کرتا ہوں میں اسموکنگ، تمہیں کیا۔ میں وہی کروں گا جو میری مرضی ہو گی۔ میں نے تو کبھی تمہیں نہیں روکا کہ اپنے درجن بھر بوائے فرینڈز سے فون پر لمبی لمبی باتیں نہ کرو۔ ان کے ساتھ گھومنے مت جاؤ، پھر تم کیوں میری ہر بات میں دخل اندازی کرتی ہو؟'' وہ چبا چبا کر بولنے لگا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ بھی اس کی حالت سے ڈر گئی۔

''میں تم سے بات نہیں کر رہی......''

''تم مجھ سے بات نہیں کر رہیں مگر میرے بارے میں تو بات کر رہی ہو۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر غرایا۔

''دیکھو سنی! میرے ساتھ زیادہ زبان چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ممی کا غصہ مجھ پر مت نکالو۔ تمہیں ممی کے ساتھ رہنا ہے یا پاپا کے ساتھ، یہ تمہارا پرسنل پرابلم ہے۔ میرے ساتھ بدتمیزی مت کرو، ورنہ میں ممی کو بتا دوں گی کہ تم اسموکنگ کرتے ہو۔'' اس کی بہن کے دھمکی آمیز لہجے نے اسے مزید سلگا دیا۔

''او شیور، وائے ناٹ...... تم ابھی جا کر ممی کو بتا دو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ پرسوں تم ممی سے لیلیٰ کے گھر پارٹی میں جانے کی پرمیشن لے کر گئی تھیں مگر لیلیٰ تو ایک ہفتہ قبل اپنے پیرنٹس کے ساتھ میونخ روانہ ہو چکی تھی۔ لیلیٰ کا بھائی میرا دوست ہے۔ پرسوں تم جب واپس آئی تھیں تو میں جاگ رہا تھا اور تم جس لڑکے کے ساتھ واپس آئی تھیں، اسے میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ وہی تھا نا افتخار علی...... ممی کے بزنس پارٹنر اطہر علی کا بیٹا...... تمہیں ممی نے پہلے بھی منع کیا تھا نا کہ اس لڑکے کے ساتھ میل جول ختم کر دو، تم ممی کو بتاؤ گی تو میں بھی......'' وہ اس قدر اطمینان سے بول رہا تھا جب کہ اماں بی بے بسی و بے چارگی سے بہن بھائی کے اس جھگڑے کو دیکھ اور سن رہی تھیں۔ دونوں کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

''میں تمہارا منہ توڑ دوں گی، تمہیں شرم نہیں آتی......''

''ہاں مجھے شرم نہیں آتی اور تم مجھے ہاتھ لگا کر دکھاؤ۔ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔'' وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اماں بی لرز اٹھیں۔

''بس بیٹا! خدا کے واسطے بس کرو، بہن ہے تمہاری۔'' وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر بولیں۔ ان کی آنکھ سے ٹپ ٹپ گرتے آنسو اسے شرمسار کر رہے تھے۔ اس اتنے بڑے گھر میں اسے صرف اماں بی سے ہی محبت تھی۔ وہ دھپ دھپ کرتا ڈائننگ روم کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

''سمجھتا کیا ہے خود کو، میں تو اب کبھی اس سے بات نہیں کروں گی۔ ممی کے ساتھ کرے اتنے نخرے۔ میں ایسا رویہ نہیں برداشت کر سکتی۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

○……❖……○

''حیدر بھائی! اپنی گھیا توری کالی ہوگئی ہے نا۔'' عمر نے محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چڑانے والے انداز میں کہا۔ مریم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ تین ماہ قبل عمر جب اس طرح کی کوئی بات کرتا تھا تو مریم بلا جھجک اپنا جوتا اس کی پشت پر رسید کرنے کو بھاگتی تھی مگر اب شاید حالات بدل گئے تھے۔ وہ کنفرمیشن لیٹر لینے کے بعد پہلی مرتبہ گھر آئی تھی اور سب گھر والے اس کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے تھے جیسے وہ کسی سلطنت کی ملکہ ہے۔ امی نے اس کے لنچ کے لیے اپنی ایک موٹی تازی مرغی قربان کی تھی۔ پھپھو اپنے ہاتھوں سے خربوزے کی قاشیں کاٹ کاٹ کر اسے کھلانے پہ تلی ہوئی تھیں۔ حیدر آتے جاتے صرف شرمیلی مسکراہٹ اچھالنے پر اکتفا کر رہا تھا اور عمر جو پہلے کبھی اس کے نام کے ساتھ باجی یا آپا جیسی کوئی چیز نہیں لگاتا تھا، گزشتہ ایک دن سے اسے آپی مریم کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔

''کیا میری ترقی ہوگئی ہے؟'' اس نے عمر سے سوال کیا۔ وہ اس کے منہ سے آپی مریم سن کر ہی حیران پریشان ہوگئی۔

''ویسے تو مجھے یقین ہے ایسا نہیں ہوا لیکن اگر سچ مچ ایسا ہو چکا ہے تو یہ یقیناً اس صدی کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔'' حیدر نے ہونٹ سکیڑ کر افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ مریم نے چارپائی پہ پڑا تکیہ اسے دے مارا۔ جب کہ اس نے ہاتھ میں پکڑا پانی سے لبالب بھرا اسٹیل کا گلاس اس پر انڈیل دیا۔ اس کے بعد وہ تینوں پہلے کی طرح ایک دوسرے کو چڑانے اور ستانے لگے۔ عمر نے اسے ''گھیا توری'' کہا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

''گھیا توری کالی تو نہیں ہوئی مگر سکڑ کر ہری مرچ جتنی ہوگئی ہے۔'' حیدر نے ٹکڑا لگانا ضروری سمجھا۔ وہ تینوں صحن میں بچھی چارپائیوں پہ بیٹھے تھے۔ امی اور پھپھو صحن میں ہی بنے مٹی کے چولہے پر ہنڈیا چڑھائے رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ مغرب کی اذان ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ تاریکی نے صحن میں اپنا پھن پوری طرح پھیلا لیا تھا۔ صحن میں چولہے کے پاس ایک زرد رنگ کا بلب روشن تھا جس کی زرد زردسی روشنی سارے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ گھر بھر کی چہیتی ولاڈلی تھی۔ اس کے گھر میں موجود ہونے سے ایک عجیب طرح کی رونق سارے گھر میں محسوس کی جا سکتی تھی۔ عمر کسی کام سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ وہ دونوں ہی اب ایک چارپائی پر بیٹھے تھے۔ صحن میں لگے نیم کے درخت کے تنے پر ننھے ننھے سے نقطے جگمگا رہے تھے۔

''وہ دیکھو جگنو......'' حیدر نے مریم کی توجہ ان ٹمٹماتے نقطوں کی جانب دلائی۔ مریم اسی سمت دیکھ رہی تھی۔ حیدر اٹھ کر تنے کے قریب گیا اور چند لمحوں بعد وہ ننھے ننھے نقطے اس کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکے تھے۔

''اپنا ہاتھ دو۔'' اس نے مریم کے قریب آ کر کہا۔ مریم نے اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی۔ اب حیدر کے ہاتھ کے جگنو مریم کی ہتھیلی میں منتقل ہوگئے۔ حیدر ایک بار پھر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی مریم نے ہاتھ کھول دیا۔ جگنو ایک ایک کر کے اڑ گئے۔ حیدر نے حیرت سے اس کا یہ عمل دیکھا۔ یہ اس کا پسندیدہ کھیل تھا۔ وہ جگنوؤں کو بوتل میں بند کر کے تاریکی میں رکھ دیتی اور پھر دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی۔

''روشنی قید ہو کر بھی روشنی رہتی ہے پھر اسے قید کرنے کا فائدہ۔'' حیدر کے چہرے پر پھیلے بڑے سے سوالیہ نشان کا جواب دیتے ہوئے مریم نے کہا۔ حیدر چند لمحے یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی، وہ سمجھ نہیں پایا۔

''تم بہت بدل گئی ہو مریم!'' کچھ دیر بعد وہ بولا۔

''کوئی نہیں...... میں تو پہلے جیسی ہی ہوں۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔

''ایسا لگ رہا ہے جیسے مجھ سے زیادہ تم خود کو یقین دلا رہی ہو۔'' حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا، مگر مریم سنجیدہ ہوگئی۔

''مطلب؟'' اس نے استفہامیہ انداز میں کہا۔

''یار! میرے کہنے کا مطلب ہے کہ تبدیلی برحق ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بس اسی طرح تم بھی تبدیل ہوگئی ہو۔''

''مثلاً......؟'' مریم نے مزید سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

''مثلاً یہ کہ پہلے تم جوتے کو جوتا کہتی تھیں، اب شوز کہتی ہو۔ پہلے تم غسل خانے کو غسل خانہ ہی کہتی تھیں، اب باتھ روم کہتی ہو اور پہلے......''

''پہلے میں حیدر کو گدھا کہتی تھی اب میں حیدر کو ڈونکی کہنے لگی ہوں۔'' وہ حیدر کی بات کاٹ کر بولی تو اندر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ابو بھی مسکرا دیئے۔

''اپنے ابو جی کے لیے کون سا لفظ منتخب کیا ہے۔ ہماری گڑیا نے۔'' انہوں نے مریم کے پاس بیٹھ کر شفیق سے لہجے میں پوچھا تو اس نے ''میرے پیارے ابو جی'' کہہ کر ان کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔ اس جذباتی منظر میں گھر کر اصل بات کہیں پیچھے رہ گئی، مگر مریم کے ذہن سے نہ نکل سکی۔ رات کو اپنے بستر پر لیٹ کر وہ حیدر کے اس معصوم الزام کو یاد کرتی رہی اور تاروں سے بھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں تردید کرتی رہی۔ صبح اٹھتے ہی اس نے پھوپھو سے پوچھا تھا۔

''پھپھو جان! کیا میں تبدیل ہوگئی ہوں؟'' پھپھو لکڑیاں چولہے میں دیئے پھونکنی کی مدد سے انہیں سلگانے کی کوشش کر رہی تھیں، اس کی بات سن کر رک گئیں، کھانسیں اور پھر مسکرا دیں۔

''میں کل رات بھابی سے یہی بات کر رہی تھی کہ ہماری مریم بہت بدل گئی ہے۔'' ان کی بات سن کر مریم کا چہرہ اتر سا گیا ہے۔ وہ بات جو اس کے سب گھر والے محسوس کر رہے تھے۔ وہی بات اسے کیوں محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

''میری بیٹی پہلے سے بہت سوہنی، بہت پیاری ہوگئی ہے۔'' وہ گہری سانس بھر کر پراٹھوں کے لیے پیڑے بنانے لگی۔ گھر میں شروع سے سب پراٹھے ہی کھاتے تھے۔ ناشتے میں چائے کے ساتھ رات کا سالن، اچار اور دہی سب کو بہت پسند تھا۔ اس نے سب افراد کے حساب سے گن کر آٹے کے پانچ پیڑے بنائے اور تب ہی اسے احساس ہوا تھا کہ حقیقتاً وہ کچھ نہ کچھ تبدیل ضرور ہوئی ہے۔ وہ بھی بچپن سے پراٹھا کھاتی آئی تھی مگر پہلی بار اس نے اپنے لیے پراٹھا نہیں بنایا تھا۔ اتنے دن تک دودھ اور ڈبل روٹی کا ناشتہ کرتے رہنے کے بعد اب اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ پراٹھا ناشتے میں کھائے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا آٹے کا پیڑا پرات میں رکھا اور اندر کمرے میں چل دی۔ نہ جانے کیا بات تھی اسے رونا آ رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ آنکھیں جھپک جھپک کر آنسو روکنے کی کوشش کرتی رہی مگر ناکام رہی۔ حیدر کسی کام سے کمرے میں آیا تو اسے روتا دیکھ کر پریشان ہوگیا۔

''کیا ہوا ہے مریم!'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔ ''ماموں کو بلا کر لاتا ہوں، وہی تم سے پوچھیں گے۔'' وہ دھمکی آمیز انداز میں بولا۔

''حیدر پلیز! ابو جی کو مت بلانا۔'' اس کے اس انداز پر التجا کرتے ہوئے حیدر خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''اب بولو کیا بات ہے؟ کسی کی بات بری لگی ہے؟'' اس نے بہت محبت سے پوچھا مگر پھر بھی مریم کو اس کا انداز اچھا نہ لگا۔ وہ سب مل کر اسے شہزادیوں والا پروٹوکول دے رہے تھے اور پھر شکوہ بھی اسی سے کر رہے تھے۔ وہ چپ چاپ حیدر کو تکنے لگی کہ وہ بے چارہ خجل سا ہوگیا۔

"تم نے کیا مجھے نظر لگائی ہے؟" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

"میں کیا بہت بدل گئی ہوں حیدر؟" اس نے نم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو حیدر کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ خوانخواہ ہی ہنس دیا۔

"ارے میری بدھوسی مریم! تم بالکل نہیں بدلیں، ویسی ہی ہو۔ احمق اور بے وقوف اور میں بھی وہی حیدر ہوں جو تمہیں تنگ کرنے اور چڑانے کو ایسی باتیں کرتا رہتا ہے۔" وہ پہلے سے بھی زیادہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔ مریم کے دل سے بھاری بوجھ سرکا۔

"میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں کبھی نہیں بدلوں گی۔" وہ اپنی آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے مستحکم لہجے میں بولی۔ اس کا رویا رویا چہرہ بے حد معصوم لگ رہا تھا۔ حیدر کا دل چاہا اس کی پلکوں میں اٹکے آنسو اپنی ہتھیلیوں میں جذب کرلے۔ پہلے تو وہ بہت آرام سے روتی ہوئی مریم کو کندھے سے لگا کر دلاسا دے لیا کرتا تھا مگر گزشتہ تین ماہ نے جیسے ایک نادیدہ پردہ ان دونوں کے درمیان حائل کردیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی خواہش پوری نہ کرسکا۔

"بدل تو میں بھی بہت گیا ہوں یار!" اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔ مریم کب کی اٹھ کر باہر جا چکی تھی۔



"یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟" ایک کرخت سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ شرمندگی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وارڈز شروع ہوئے ابھی چند دن ہی ہوئے تھے۔ پہلے سال ان کی ڈیوٹیز دو سے اڑھائی گھنٹے تک کی ہوتی تھیں مگر ان مختصر ڈیوٹیز میں بھی وارڈز سے وارڈز تک اتنے چکر لگتے تھے کہ وہ تھک جاتی تھیں۔ اس کی ڈیوٹی چلڈرن وارڈ میں تھی۔ پہلی ہی کلاس میں اسے کسی بات پر پروفیسر اختر کمال سے ڈانٹ پڑ گئی تھی پھر چلڈرن وارڈ میں بچوں کے درمیان ان کی چیخ چیخ نے اسے بے حد تھکا دیا تھا۔ اس کے سر میں بہت درد ہو رہا تھا۔ ایک بچے کی ماں واش روم کی طرف گئی تو مریم آکر اس بچے کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ذرا دیر کو ستانے کے خیال سے اس نے شوز اتار کر پاؤں بھی پسار لیے۔ اسی دوران اس دبلی پتلی مگر لمبی سی خاتون نے اسے اس کی غلط حرکت کا احساس دلایا۔

"محترمہ! آپ شاید بھول گئی ہیں کہ آپ اپنے گھر کے لاؤنج میں نہیں بلکہ ہاسپٹل کے وارڈ میں بیٹھی ہیں۔" وہ خاتون تنک کر بولیں۔ مریم نے انہیں پہچان لیا تھا، وہ سینئر موسٹ وارڈ سسٹر زینت آرا تھیں، جنہیں سب میڈم زینت کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ہفتہ بھر قبل جب فرسٹ ایئر کے وارڈز شروع ہوئے تھے، تب ان کی ایک سینئر نے بطور خاص میڈم زینت کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ وہ بہت سخت قسم کی وارڈ سسٹر ہیں جو جونیئر سسٹرز کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتی ہیں۔ مریم اپنی باقی کلاس فیلوز کی طرح ان سے ڈرتی تھی بلکہ ساری فرسٹ ایئر چونکہ ابھی موسٹ جونیئر تھی، اس لیے وارڈ بوائز اور سوئپرز وغیرہ بھی ان پر رعب جمانے کی کوشش کرتے تھے۔ فرسٹ ایئر کے سفید دوپٹے اور نیلی Sash ہی دور سے سمجھا دیتی تھی کہ ان کو دھمکانا آسان ہے۔

"اب کیا مراقبے میں چلی گئی ہو؟" اب کی بار میڈم زینت نہایت کاٹ دار لہجے میں بولیں۔ دوسرے بیڈز پر اپنے اپنے بچوں کے ساتھ لیٹی مائیں اور دوسری تیمار دار عورتیں دلچسپی سے ان دونوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ مریم کو نہایت شرمندگی کا احساس ہوا۔

"مس! میں آپ سے مخاطب ہوں۔" وہ چٹکی بجا کر اسے متوجہ کرتے ہوئے بولیں۔

"آئی ایم سوری میڈم! دراصل...... میں آئندہ......" وہ منمناتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آنسو گالوں پر پھسلنے لگے تھے۔

اسے اس قسم کی ایکسپلینیشن کال بھگتنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ایک لائق فائق طالبہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اساتذہ کی ہمیشہ پسندیدہ رہی تھی مگر یہاں کا نظام ذرا مختلف تھا۔ یہاں استاد صرف استاد نہیں بلکہ باس تھا۔

"میں آئندہ نہیں کروں گی میڈم!" مریم نے خود کو سنبھالتے ہوئے بات مکمل کی۔

"آئندہ......؟ آئندہ کی نوبت کون آنے دے گا۔ میں ابھی جا کر میٹرن سے آپ کی شکایت کرتی ہوں۔ آپ کو احساس ہے آپ نے کس قدر غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی سینئر ڈاکٹر اس طرف آجاتے تو ہم سب کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ ہر جگہ کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور سب لوگوں کو ان اصولوں کے مطابق چلنا چاہیے۔ آپ یہاں مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے آتی ہیں، خود اپنی دیکھ بھال کے لیے نہیں......" میڈم زینت کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی مریم نے ہچکیاں لے کر رونا شروع کردیا۔ شرمندگی، خجالت، خفت اور سب سے بڑھ کر خوف...... وہ خود کو رونے سے روک نہیں پائی تھی۔

"یعنی کہ حد ہوگئی، چوری پھر سینہ زوری۔ بچی نہیں ہو دودھ پیتی کہ ذرا سی بات پر رونے لگو۔" ان کا لہجہ اس قدر سخت تھا کہ مریم کے رونے میں تیزی آگئی۔ میڈم زینت کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہوا۔

"ارے ایسا کیا کہہ دیا میں نے کہ تمہاری آنکھوں میں سیلاب اتر آیا۔ آج کل کی لڑکیاں بھی عجیب ہیں، کسی غلطی پر سرزنش کرو تو شرمندہ ہونے کی بجائے دوسروں کو شرمندہ کرنے لگتی ہیں۔" مریم کے رونے میں کمی آ رہی تھی نہ میڈم زینت کے غصے میں۔ ان کی آواز کی شدت سے دو ایک وارڈ بوائز اور جونیئر ڈاکٹرز بھی شاید تماشا دیکھنے کی غرض سے آکھڑے ہوئے تھے۔

"زینت آپا! کیوں ڈانٹ رہی ہیں بے چاری کو، بس کیجیے......" مریم کے کانوں میں بھاری مردانہ آواز پڑی۔

آنسوؤں کی دھند میں وہ کچھ دیکھ ہی نہیں پا رہی تھی۔

"ان بے چاری کی وجہ سے سب کی مصیبت آسکتی تھی ڈاکٹر! آج میڈم عذرا اور ڈاکٹر اطہر بخاری کا وزٹ ہے۔ آپ جانتے ہیں وہ کس قدر سخت مزاج اور اصولوں کے سخت ہیں۔" میڈم زینت اس شخص کے ساتھ نسبتاً نرم لہجے میں بات کر رہی تھیں۔ مریم کا شرمندگی کے مارے برا حال تھا۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے کہ اس قدر بے عزتی سہنا پڑ گئی تھی۔

"آپ لوگ اسٹوڈنٹ نرسز کے ساتھ زیادہ ہی سختی برت جاتے ہیں۔" اس شخص کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔

"ڈاکٹر! آپ شہ مت دیجیے، آپ کچھ نہیں جانتے۔" میڈم زینت کا لہجہ ناصحانہ سا تھا۔ وہ شخص پھر کچھ بڑبڑایا مگر اس کی آواز بے حد مدھم تھی۔ مریم کو کچھ بھی سمجھ میں نہ آسکا۔

"او کے۔ ایز یو وش۔" وہ شخص کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔ میڈم زینت کی سختی سے سب ہی خائف رہتے تھے۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میڈم زینت نے اس سے پوچھا۔

"مریم چوہدری۔" مریم نے منمناتی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پا چکی تھی۔

"آنسہ مریم چوہدری مسلمان ہیں؟" انہوں نے پھر استفسار کیا۔

"جی......" مریم نے اثبات میں گردن ہلائی

''دیکھو مریم! میں کسی کی دشمن نہیں ہوں، بات اصول کی ہے۔ جب تم آن ڈیوٹی ہو تو تمہیں ایسی غیر ذمہ داری کا ثبوت نہیں دینا چاہیے۔ میں نے تمہیں سرزنش کی ہے۔ اگر میری جگہ ڈاکٹر بخاری ہوتے تو وہ تمہاری نیلی Sash دیکھتے ہی ایک آدھ ہفتے کے لیے تمہیں ٹرمینیٹ کر دیتے۔ ایسی بے ضرر ٹرمینیشنز بعد میں جاب کے حصول میں بہت نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ فرسٹ ایئر میں زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب کی بار میں تمہیں معاف کر دیتی ہوں، دوبارہ یہ غلطی نہ ہو۔'' ان کے جانے کے بعد مریم من من بھر کے قدم اٹھاتی وارڈ سے باہر آ گئی۔ ریسیپشن کے کاؤنٹر پہ اس کی کتابیں پڑی تھیں۔ کتابیں لے کر وہ اردگرد دیکھے بغیر باہر کی سمت چل دی۔ ہاسٹل واپس آ کر بھی اس کا موڈ کافی خراب تھا۔ اسے احساس تھا کہ غلطی اس کی تھی مگر یہ غلطی بہت بے ضرر تھی، اسے اتنی ڈانٹ نہیں پڑنی چاہیے تھی۔ تزئین اور روبینہ مارکیٹ تک گئی تھیں۔

وہ اپنے لیے چائے بنا کر چارپائی پر بیٹھی تھی کہ نگہت آ گئی۔ نگہت ان سے دو سال سینئر اور نہایت پھرتیلی لڑکی تھی۔ مریم کی اس سے اچھی علیک سلیک تھی جو روبینہ کے توسط سے ہوئی تھی۔ روبینہ اور تزئین نے بہت تھوڑے عرصے میں اچھی پی آر بنالی تھی۔

''میں نے سنا ہے تمہیں کالی گھوڑی سے ڈانٹ پڑی ہے؟'' وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولی۔

مریم پہلے تو سمجھی نہیں اور جب سمجھ گئی تو جواب دینے کے بجائے پھر گردن جھکا کر بیٹھ گئی۔ آنسو پھر آنکھ کے گوشوں میں چمکنے لگے تھے۔ اس نے پہلے بھی نگہت اور دوسری سینئر نرسز کے منہ سے ''کالی گھوڑی'' کے بارے میں سن رکھا تھا۔ ہاسٹل میں جونیئر نرسز نے سینئر نرسز کے بہت سے الٹے سیدھے نام رکھے ہوئے تھے۔

''کم آن مریم! اس عورت کی ڈانٹ کا برا مت مانو۔ اس کا بس چلے تو آتی جاتی ہوا کو بھی ڈانٹنے لگے۔'' نگہت اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولی۔ مریم کو اس لمحہ نگہت سے زیادہ ہمدرد اور کوئی نہیں لگا۔

''نہیں نگہت! غلطی میری ہے، مجھے دھیان رکھنا چاہیے تھا۔'' وہ بمشکل بولی تھی۔ دل بے حد بوجھل ہو رہا تھا۔

''جی نہیں، تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے، مجھے اسلم بتا رہا تھا کہ شاید تم ذرا دیر کو آرام کی غرض سے وارڈ میں لیٹ گئی تھیں، اس لیے ڈانٹ پڑی ہے۔ آرام کرنا کوئی غلط بات تو نہیں ہے اور اگر غلط بات ہے بھی تو کم از کم میڈم زینت صاحبہ کو ڈانٹنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ میٹرن نہیں ہے، صرف ایک وارڈ سسٹر ہے۔'' نگہت شاید پہلے سے ہی بھری بیٹھی تھی۔ اس کے انداز میں اس قدر حقارت تھی کہ مریم حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کا ایک دم سے اس قدر جذباتی ہو جانا حیران کن ہی تو تھا۔

''تم جانتی ہو میڈم زنیت نے آج تمہیں کیوں ڈانٹا؟'' نگہت نے آواز کو بے حد مدھم کرتے ہوئے سوال کیا۔

''مجھے انہوں نے بتایا تھا کہ وہ اس لیے سختی سے پیش آ رہی ہیں کہ آج سرجن بخاری کا وزٹ ہے۔ وہ بتا رہی تھیں، سرجن بخاری اصولوں کے بہت پابند ہیں، وہ غیر ذمہ داری برداشت نہیں کرتے۔'' مریم نے ٹھنڈی چائے کا مگ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ اسے نگہت کا رویہ الجھن میں ڈال رہا تھا۔

''تم بہت معصوم ہو مریم! تم کچھ نہیں جانتیں۔'' نگہت تاسف سے بولی پھر اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات دیکھ کر مزید گویا ہوئی۔

''اس نے تمہیں اس لیے ڈانٹا کہ آج سرجن بخاری کا وزٹ ہے اور تم بہت خوبصورت ہو، سمجھیں کچھ؟''

''تم کیا کہہ رہی ہو، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا؟'' مریم زچ ہو کر بولی۔ نگہت اس کے چہرے کی جانب دیکھتی رہی۔ گویا اس کے دل کا حال جاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

''سنو بیوقوف لڑکی! دراصل میڈم زینت نہیں چاہتی تھیں کہ سرجن بخاری تمہیں دیکھیں۔ سرجن بخاری سب سے اپروچ فل سرجن ہیں۔ وہ مینجمنٹ کا حصہ ہیں۔ ان کی فیور حاصل ہو جائے تو سمجھو ہیلتھ سیکرٹریٹ تک رسائی حاصل ہو گئی۔ میڈم زینت کو یہی فیور حاصل ہے اور وہ اسی فیور کو کھو دینے سے ڈرتی ہے۔ اسی لیے اس کے انڈر جتنی بھی خوبصورت لڑکیاں ہوتی ہیں، وہ انہیں سرجن بخاری کے سامنے آنے ہی نہیں دیتی کہ اگر سرجن بخاری کسی اور حسینہ کی زلفوں کے اسیر ہو گئے تو خود اس کا کیا بنے گا، اسی لیے ہر خوبصورت لڑکی کو ڈانٹنا اور بے عزت کرنا وہ اپنا حق سمجھتی ہے۔'' مریم نے ناسمجھی کے انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

''یار...... اتنی بڑی تہمت مت لگاؤ۔'' وہ نگہت کے انداز سے خائف ہو کر بولی۔

''یہ تہمت نہیں ہے، یہ اس ہاسپٹل کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ میں تمہیں اسی لیے یہ سب بتا رہی ہوں کہ تم محتاط رہنا۔ خصوصاً میڈم زینت سے تو دور ہی رہنا، وہ بالکل بھی اچھی عورت نہیں ہے۔ ہاں میٹرن اچھی ہے۔ وہ بہت محبت سے بات کرتی ہے۔'' وہ آخر میں مسکراتے ہوئے بولی مگر مریم مسکرا بھی نہ سکی۔

''اب تم پریشان مت ہو، اچھے برے لوگ تو ہر فیلڈ میں ہوتے ہیں۔ لگن کے ساتھ اپنا کام کرو۔ تمام سینئر ڈاکٹرز کے ساتھ بنا کر رکھو اور پھر میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔'' نگہت نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر حوصلہ دینے والے انداز میں کہا۔ مریم کو حوصلے کی ہی ضرورت تھی۔ وہ نگہت کی باتوں سے بہل گئی۔



''مریم! مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' تزئین نے اس کے ہاتھ سے کمیونٹی میڈیسن کے نوٹس لے کر روبینہ کی چارپائی پر پھینک دیئے۔ وہ ہاتھ میں آئینہ اور پلکر لے کر بیٹھی اپنی آئی بروز ادھیڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے نہایت ناگواری سے تزئین کی جانب دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں بولی۔ اس کے انداز و اطوار اور مزاج میں پہلے کی نسبت بہت تبدیلی آ چکی تھی۔ ہفتہ دس دن قبل اس نے تزئین سے اپنی آئی بروز کی شیپ بنوائی تھی۔ اب اس کی بھنوؤں کے نیچے ننھے ننھے بال نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ کافی دیر سے تزئین سے کہہ رہی تھی کہ دوبارہ سے آئی بروز کی شیپ درست کر دے، مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

''ابھی میرا موڈ نہیں ہے، جب موڈ ہوگا، تب تمہاری آئی بروز کی کاٹ چھانٹ کر دوں گی۔'' روبینہ کو یہی بات بری لگی تھی۔ اتنے بہت سے دن اتنی رنگ برنگ لڑکیوں میں گزار کر وہ کافی کچھ سیکھ گئی تھی۔ اب اسے چھوٹے چھوٹے مذاق بھی برے لگ جاتے تھے اور تزئین کے ساتھ تو اس کی اکثر جھڑپ ہو جاتی تھی۔ اس نے وہی نوٹس اٹھا کر دور کرسی پر پھینک دیئے۔

''اوہو، اب تو روبینہ بھی نخرے کرنے لگی ہیں۔'' اس نے روبینہ کو چڑانا چاہا اور روبینہ چڑ بھی گئی۔

''میرے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ تڑخ کر بولی۔

''بلے بھائی بلے...... مینڈکی کو زکام......'' تزئین کی بات مکمل ہونے سے پہلے مریم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ان دونوں کی روز روز ہونے والی ان جھڑپوں سے وہ بہت تنگ آ چکی تھی۔

''تم مجھ سے کوئی بات کرنے والی تھیں نا؟'' اس نے تزئین کو یاد دلایا۔

''اوہ ہاں، اس فٹے منہ کا منہ دیکھ کر سب بھول جاتا ہے۔'' اس نے روبینہ کی طرف اشارہ کر کے کہا تو روبینہ کھول کر رہ

گئی۔ گزشتہ چار ماہ میں اس میں بہت تبدیلیاں آئی تھیں۔ بہتر سے بہترین کا سفر وہ بہت تیزی سے طے کر رہی تھی، مگر تزئین سے جیتنا ابھی بھی اس کے لیے بہت مشکل تھا۔

''اب تم بک بھی چکو۔'' مریم نے اُکتا کر کہا۔ اسے ابھی وائیوا کی تیاری بھی کرنا تھی۔

''یار...... یہ روبینہ بہت تبدیل ہوگئی ہے۔'' تزئین نے دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے کہا، جہاں سے روبینہ باہر گئی تھی۔

''ٹھیک کہتی ہو اور یہ تبدیلی بہت مثبت ہے۔ تم نے دیکھا، وہ پہلے کی نسبت کتنے اچھے رنگوں کے کپڑے پہننے لگی ہے۔ اس کا اندازِ گفتگو بھی پہلے کی نسبت بہت بہتر ہو گیا ہے۔'' مریم نے اسے سراہتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اسے حیدر کی یاد آئی جو ہاسٹل سے گھر جانے پہ اسے تبدیل شدہ قرار دے رہا تھا۔

''مجھے کہہ رہی تھی کہ تزئین! میری انگلش Vocabulary بہت ویک ہے۔ تم اس کو امپروو کرنے میں ہیلپ کر دو گی؟'' تزئین نے ہو بہو اس کی نقل اتاری تو مریم ہنس دی۔

''تم مجھ سے کیا بات کہنے والی تھیں؟'' اس نے تزئین کی طرف دیکھتے ہوئے پھر پوچھا تو وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئی پھر نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے آنکھیں میچے ایسے ظاہر کرنے لگی جیسے کچھ سوچ رہی ہو پھر مریم کی طرف رخ کر کے بولی۔

''یار لڑکی! تم میری کوئی بات نہیں مانتیں، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں بری نہیں لگتیں۔ دل چاہتا ہے ہر راز تم سے ہی شیئر کروں۔'' اس کا انداز جتانے والا تھا، مریم مسکرا دی۔ چند روز پہلے الاؤنس کی رقم ملنے پہ تزئین نے کچھ فرینڈز کے ساتھ مل کر آؤٹنگ کا پروگرام بنایا تھا مگر مریم نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اسی بات کو ایشو بنا کر تزئین اسے طعنہ دے رہی تھی۔

''اب پھوٹ بھی چکو کیا بات ہے؟'' تزئین کے ایک بار پھر خاموش ہونے پر مریم اس کا کندھا ہلا کر بولی۔

''یار! تم نے سانولی رنگت والا وہ لڑکا دیکھا ہے جس کی داڑھی ہے، جس کی آنکھیں خمار آلود سی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے نیند اس کی پلکوں پہ ٹھہری رہتی ہے۔''

''ہاں...... دیکھا ہے۔'' مریم نے اس کے سوال کا مختصر جواب دیا۔

''کون ہے؟'' تزئین نے دلچسپی سے پوچھا۔

''انضمام الحق۔'' مریم اطمینان سے بولی تو تزئین کے لبوں سے قہقہہ پھوٹ پڑا۔

''میں کرکٹ اسٹیڈیم کی نہیں، اس ہاسپٹل کی بات کر رہی ہوں۔ عام طور سے چلڈرن وارڈ میں نظر آتا ہے۔ بہت سوبر اور سنجیدہ سا لگتا ہے۔ بہت عزت و احترام سے مخاطب کرتا ہے اور پھر......''

''یار ہوگا کوئی، تم وہ بات بتاؤ جو تمہیں مجھے بتانی تھی۔'' مریم اس کی قصیدہ خوانی سے زچ ہو کر بولی۔ وہ اتنے سے دنوں میں ہی تزئین کی عادات کے متعلق بہت اچھی طرح جان گئی تھی۔ وہ جب بھی کسی بات پر ڈپریسڈ ہوتی تھی، تب اسی طرح کی بے سروپا اور بے معنی باتیں کیا کرتی تھی۔ اس کے اپنی امی سے تعلقات بہت اچھی نوعیت کے نہیں تھے بلکہ اس کی امی ابھی تک اس سے ناراض تھیں اور عام طور سے تزئین کی سب سے بڑی پریشانی اس کی امی کا رویہ ہی تھا۔

''امی نے نگین کا رشتہ طے کر دیا ہے۔'' تزئین نے بالآخر اُگل ہی دیا۔

''یہ تو خوشی کی بات ہے، مبارک ہو۔'' مریم نے خوش ہو کر کہا۔ دو ایک بار تزئین نے ذکر کیا تھا کہ اس کی امی جلد از جلد اس کی بڑی بہن کی شادی کر دینا چاہتی ہیں۔

''بہت زیادہ خوشی کی بات ہے۔ وہ شخص جس سے نگین کی شادی ہو رہی ہے، تقریباً اس سے دوگنی عمر کا ہے اور پھر شادی شدہ بھی ہے۔ وہ نگین سے شادی صرف شریعت کا تقاضا نبھانے کی خاطر کر رہا ہے۔'' تزئین دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ اسے بتانے لگی۔ مریم کو بھی از حد افسوس ہوا۔ وہ ابھی تسلی، دلاسے کے لیے الفاظ ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ روبینہ کمرے میں آ گئی۔ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر تزئین نے تکیے کے ساتھ کروٹ بدل لی۔ وہ اپنی آنکھ میں آئی نمی کم از کم روبینہ کو نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ روبینہ اس کے انداز کو اس کی ادا سمجھی، اس لیے ناک چڑھا کر الماری سے کپڑے نکالنے لگی۔ اس نے پہلے الاؤنس کی مد میں ملنے والی تمام رقم اپنی ذات پر خرچ کر ڈالی تھی۔ وہ بہت سے نئے سوٹ لائی تھی۔ نئے جوتے، کاسمیٹکس کا سستا سامان اور تھوڑی سی جیولری بھی خریدی تھی۔

''تم کہیں جا رہی ہو؟'' مریم نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... ستارہ، لیزا اور نگہت وغیرہ ہوٹل میں کافی پینے جا رہی ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ جا رہی ہوں، تم بھی چلو۔'' اس نے بتانے کے ساتھ ساتھ دعوت بھی دے ڈالی۔

''ہوٹل میں کافی پینا، ہاسٹل میں کافی پینے سے مختلف ہوتا ہے کیا؟'' یہ سوال تزئین نے کیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ اس کے چہرے سے غم و الم کے تمام تاثرات غائب ہو چکے تھے۔ وہ غضب کی اداکارہ تھی۔

''نہیں مگر ہوٹل میں مزا آتا ہے نا۔ فلموں میں نہیں دیکھا کبھی۔'' روبینہ سابقہ جھڑپ کو بھلا کر بھولے پن سے کہہ رہی تھی۔

''کیا پتا روبینہ! ہوسٹل میں کافی پی کر بھی زیادہ مزا آئے کیونکہ تمہارے لیے تو کافی کا ذائقہ بھی ایک نئی چیز ہوگی۔ آئی ایم شیور، تم آج پہلی بار کافی پیو گی۔'' تزئین کا انداز طنزیہ نہیں تھا مگر پھر بھی شاید روبینہ کو اچھا نہیں لگا۔ وہ اس کی بات کا جواب دیئے بغیر کپڑے پریس کرنے لگی۔

مریم نے دوبارہ سے اپنے نوٹس اٹھا لیے اور پڑھنے کی کوشش کرنے لگی مگر اسے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ تزئین اپنی قنوطیت کو بھلائے روبینہ کی تیاریوں پر فقرے کسنے میں مصروف تھی، جب کہ روبینہ مسلسل اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوتی کہ وہ تڑخ کر جواب دینے پر مجبور ہو جاتی۔ اس ساری صورتِ حال میں یکسوئی سے پڑھنا تو ناممکن تھا۔ مریم نے بھی نوٹس سائیڈ میں رکھ دیئے اور ان دونوں کی اس نوک جھونک کو دیکھنے لگی۔ روبینہ کے کمرے سے نکلنے کے بعد ہی اس کا خاتمہ ہوا تھا اور مریم نے بھی تب ہی سکون کا سانس لیا مگر یہ سکون بھی عارضی تھا۔

''یار! یہ محترمہ اتنا تیار ہو کر انجوائے کرنے باہر جا سکتی ہے تو ہم کیوں نہیں جا سکتے۔ چلو ہم بھی چلتے ہیں۔'' تزئین نے گویا حکم سنایا۔ مریم کے مسلسل انکار کے باوجود وہ اسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لائی۔

''ہم جائیں گے کہاں؟'' مریم نے اپنے اُڑتے ہوئے دوپٹے کو بمشکل سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ تزئین نے اسے کپڑے بدلنے کی مہلت بھی نہیں دی تھی، ہاں مگر اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک ضرور لگوا دی تھی۔ اسے تزئین کی زبردستی اچھی نہیں لگی تھی مگر اب آسمان کی گہری رنگت کہیں کہیں لہراتی مٹیالی بدلیاں اور پھر چھیڑ چھاڑ کرتی ہوا اسے بہت مزا دے رہی تھی۔

''ہم اُفق کے پار جائیں گے۔'' تزئین ہوا سے بھی زیادہ مستی میں تھی۔ ہاسٹل کے مین گیٹ سے باہر نکلتے ہی وہ لوکل وین میں سوار ہو گئی تھیں۔

O......❖......O

"ممی کا عزم حقیقتاً قابلِ تعریف ہے۔" اس نے ٹماٹو کیچپ کی پلیٹ میں فرنچ فرائز سے دائرے بناتے ہوئے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔ اس کے پاپا کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"تم شاید اپنی ممی کی بے جا ضد کو عزم کہہ رہے ہو۔ وہ صرف اور صرف ضد میں یہ سب کر رہی ہے تاکہ تمہیں مجھ سے دور کر سکے کیونکہ وہ جانتی ہے مجھے تم سے بہت محبت ہے اور میری ہر محبوب چیز اسے چھین لینے کی عادت ہے۔" وہ نہایت طنزیہ انداز میں کہہ رہے تھے۔ اس نے پہلے کبھی اپنے پاپا کو ممی کے بارے میں اس طرح بات کرتے نہیں سنا تھا۔

"نہیں پاپا! ایسی بات نہیں ہے۔ ممی ایسی نہیں ہیں، وہ دل کی بہت اچھی ہیں پاپا!" اس نے فوراً تردید کی۔ اسے ہزار ہا شکایتوں کے باوجود اپنی ممی سے بھی بہت محبت تھی۔ اپنی طرف سے وہ ممی پاپا کے دل میں ایک دوسرے کے لیے موجود کدورت دور کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

"ان فیکٹ میرے برے رزلٹ نے ان کا موڈ اس قدر آف کر دیا ورنہ آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔" اس نے تمام تر ذمہ داری قبول کرتے ہوئے تاسف میں گھر کر کہا۔ اس کا رزلٹ اناؤنس ہوئے تقریباً چھ ماہ کا عرصہ ہو چلا تھا۔ اس کی ممی نے چھ ماہ قبل جو سڈنی بھجوانے کی دھمکی دی تھی، وہ ابھی تک اس پر قائم تھیں مگر چونکہ وہ ابھی اٹھارہ سال کا نہیں ہوا تھا، اس لیے یہ سلسلہ کسی قدر تعطل کا شکار ہو گیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اپنا فیصلہ تبدیل کر چکی تھیں۔

"تمہاری ممی تم سے محبت کرتی ہیں؟ میرے لیے تو یہ ایک بریکنگ نیوز ہے بھئی! جہاں تک میرا خیال ہے، تمہاری ممی کو لفظ "محبت" سے بھی چڑ ہے۔" وہ شگفتہ سے انداز میں کہہ رہے تھے۔ ان کا مقصد ماحول میں پھیلی سوگوار سی فضا کو ختم کرنا تھا۔

"نو پاپا! یو آر کوائٹ رانگ۔ ان فیکٹ حالات نے ممی کو ذرا چڑ چڑا کر دیا ہے۔" وہ وضاحت دیتے ہوئے بولا۔ اکثر وہ اپنے آپ کو عجیب طرح کی صورتِ حال میں الجھا لیتا تھا۔ ممی کے سامنے ہوتا تو پاپا کے متعلق وضاحتیں دیتا اور پاپا کے سامنے ممی کی حمایت میں بولتا۔ وہ دونوں ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ اس کے پاپا بہت بذلہ سنج اور شوخ طبیعت کے تھے مگر کبھی کبھی ان پر بھی قنوطیت کا دورہ پڑ جاتا۔ وہ اسے اس بات پر آمادہ کر رہے تھے کہ وہ ان کے ساتھ ان کے گھر چل کر رہے اور وہ ان کے ساتھ رہنا بھی چاہتا تھا مگر ابھی کیونکہ اس کی عمر اٹھارہ سال نہیں ہوئی تھی اور اٹھارہ سال سے پہلے وہ خود مختاری سے فیصلہ نہیں کر سکتا تھا اور ویسے بھی اپنی ممی اور بہن کے سامنے وہ انہیں چھوڑ دینے کے بلند و بانگ دعوے ضرور کرتا تھا، مگر انہیں اکیلا چھوڑ کر پاپا کے پاس آ کر رہنے کی اس میں بھی ہمت نہیں تھی۔

"تمہارا آئی ڈی کارڈ بن چکا ہے؟" اسے خاموش دیکھ کر اس کے پاپا نے سوال کیا۔

"نہیں۔" اس نے گہری سانس بھری پھر مزید گویا ہوا۔

"ابھی میری عمر اٹھارہ سال ہونے میں کچھ مہینے باقی ہیں۔" اسے پاپا کی کمزور یادداشت پہ ہمیشہ جھنجلاہٹ ہوتی تھی۔ وہ ہر ملاقات میں اس کی عمر کے متعلق سوال کرتے اور ہمیشہ بھول جاتے جب کہ ممی گھنٹے اور منٹ کی تفصیل کے ساتھ اس کی عمر بتا سکتی تھیں۔

"اس کا مطلب یہ کہ تمہارے سڈنی جانے میں ابھی کچھ اور عرصہ لگ جائے گا۔" انہوں نے اپنے سامنے پڑے کافی کے کپ کو واپس ٹرے میں رکھ دیا۔ کافی ٹھنڈی ہو کر بدذائقہ ہو چکی تھی۔

"کم آن پاپا! کچھ اور عرصہ......؟ ساری زندگی لگ جائے گی۔ میں تو کبھی سڈنی نہیں جاؤں گا، مر کر بھی نہیں۔" اس کے پاپا نے تڑپ کر اس کی جانب دیکھا۔

"فضول باتیں مت کرو۔" انہیں اس کی بات سے دکھ پہنچا تھا۔ گزشتہ چھ ماہ سے وہ بہت ہی زود رنج ہو چکا تھا۔ اس کی صحت پہلے کے مقابلے میں کافی گر چکی تھی۔ اس کا قد کاٹھ ان ہی کی طرح لمبا چوڑا تھا اور رنگت اپنی ممی کی طرح بے حد سرخ و سفید تھی، مگر کمزور صحت کی بنا پر وہ بہت شاندار دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر کم سنی کے اثرات کسی قدر معدوم ہونے لگے تھے۔ دوستوں کے صلاح مشورے پر اس نے کافی پہلے سے شیو کرنا شروع کر دی تھی مگر اس کی آواز و انداز میں بچپنا نمایاں تھا۔

"پاپا پلیز! آپ ممی سے بات کیجیے نا، ان کی بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔ وہ آج کل بار بار ایمبیسی فون کر کے نہ جانے کون سی انفارمیشن اکٹھی کرتی رہتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے ہی میرا برتھ ڈے ہوگا، ویسے ہی ممی میرے کندھے پر بیگ ڈال کر مجھے پلین میں بٹھا دیں گی۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا چپس پلیٹ میں پٹختے ہوئے کہا۔ اس کے پاپا اس کی ڈپلومیسی پہ مسکرائے۔ اگر یہی بات وہ کہتے تو ان کا یہ معصوم بیٹا فوراً تردید کرنے لگتا۔

"او کے......او کے ریلیکس......تم پریشان مت ہو...... میں بات کروں گا۔" انہوں نے میز کے اوپر سے ذرا سا کھسک کر اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا اور اس کا دل چاہا کہ وہ ان کے گلے لگ جائے مگر ماحول کا تقاضا تھا کہ وہ خاموشی سے بیٹھا رہے۔ ریسٹورنٹ میں اس وقت کافی رش تھا۔ موسم کی جولانی بھی عروج پر تھی اور وقت بھی شام کا تھا۔ ایسے میں تمام ٹیبلز ہی بھرے ہوئے تھے۔ لوگ مسلسل اپنی اپنی مطلوبہ چیزیں سیلف سروس کے تحت لانے لے جانے میں مصروف تھے، جب کہ ان کی ٹیبل پر سب کچھ ویسے کا ویسا ہی پڑا تھا۔ اس کے پاپا کی کافی ٹھنڈی جب کہ اس کی کولڈ ڈرنک گرم ہو چکی تھی۔

"لاؤ یار! میں اور کافی لے کر آتا ہوں اور تمہارے لیے ٹھنڈی کوک بھی۔" ان کے بیچ پھیلی خاموشی سے اُکتا کر اس کے پاپا نے کہا۔ اس نے ایک نظر کاؤنٹر پر ڈالی پھر گہری سانس بھر کر بولا۔

"بہت رش ہے، لائیے میں لے آتا ہوں۔"

"ینگ مین! میں ابھی بوڑھا نہیں ہوا۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ان کے اس طرح سے کہنے پر وہ بھی مسکرا دیا۔ وہ کاؤنٹر کی سمت بڑھ گئے۔ سفید ٹی شرٹ اور ڈھیلی سی جینز میں وہ کافی ینگ اور اسمارٹ لگ رہے تھے۔ وہ اس کے پاپا کی بجائے بڑے بھائی لگتے تھے۔ اسے اپنے پاپا کی ڈیشنگ پرسنیلٹی پہ ہمیشہ فخر محسوس ہوتا تھا۔ کاؤنٹر کے قریب کھڑی ایک خاتون اس کے پاپا کی جانب ہی دیکھ رہی تھیں اور وہ جس انداز سے دیکھ رہی تھیں، وہ بھی بہت دلچسپ تھا۔ اس کے لبوں پر بہت جاندار سی مسکراہٹ چمکی تھی۔

"مریم! ذرا دیکھنا، وہ لڑکا خود بخود مسکرا رہا ہے۔ یہ پاگل تو نہیں۔" اس کے کانوں میں آواز آئی تھی۔ ساتھ والی ٹیبل پر دو لڑکیاں بیٹھی شاید اسی کے بارے میں بات کر رہی تھیں ان کی سرگوشی نما آواز بھی اس کے کانوں میں بخوبی پہنچ رہی تھی۔ وہ شاید ابھی وہاں آ کر بیٹھی تھیں۔

"آہستہ بولو، اس نے سن لیا تو۔" مریم نامی اس لڑکی نے مزید دھیمی آواز میں کہا۔ وہ اپنی چیئر پر بالکل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں لڑکیاں اب مکمل طور پر اس کی نظروں کے حصار میں تھیں۔ سادہ سے کپڑوں میں ملبوس وہ دونوں لڑکیاں کافی خوبصورت تھیں۔ ان میں سے ایک نے دوپٹہ سر پر پھیلا رکھا تھا جب کہ دوسری لڑکی نے کندھے پر لیا ہوا تھا۔ اس کے اس طرح سے دیکھنے پہ وہ کچھ جھجک سی گئی تھیں۔ کندھے پر دوپٹے والی لڑکی تو پھر بھی کسی قدر بولڈ لگ رہی تھی مگر دوپٹے کے ہالے میں مقید وہ پری وش کچھ گھبرا سی گئی۔ اسے بڑی دلچسپ سی حیرت ہوئی۔ اس نے اپنے اردگرد اس قسم کی لڑکیاں کچھ کم ہی دیکھی

تھیں۔ ذیشان اور افتخار اس کے ساتھ ہوتے تو اس لڑکی کو اپنے فقروں اور شرارتوں سے ٹھیک ٹھاک زچ کر سکتے تھے۔ چھٹی کے وقت گرلز کالجز کے آگے سے اپنی موٹر بائیک پہ چکر لگا کر لڑکیوں پہ فقرے کسنا اس نے انہی سے سیکھا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر ان لڑکیوں کو ہاتھ سے ''ہیلو'' کا سگنل دیا۔

''توبہ آج تو اس قدر رش ہے کہ ہماری باری شاید کل صبح تک آسکے گی۔'' اس کی اس حرکت پر وہ دونوں سٹپٹائی تھیں، اسی دوران اس کے پاپا خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ اس نے جتانے والے انداز میں انہیں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو 'میں نے کہا تھا نا۔'

''آؤ ہم کہیں اور چلتے ہیں۔'' اس کے پاپا نے اسے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنا سیل فون اٹھا کر فوراً کھڑا ہو گیا۔ مین انٹرنس سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے مڑ کر اسی ٹیبل کی جانب دیکھا، جہاں وہ لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ وہ ٹیبل اب خالی تھی وہ لڑکیاں شاید اپنی جگہ تبدیل کر چکی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گیا۔



''کھڑکیاں بند کر دو سسٹر! مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔'' ملک صاحب نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ مریم نے عجیب اُلجھن میں گھر کر کھڑکیوں کی جانب دیکھا۔ اس وی وی آئی پی روم کی تمام کھڑکیاں پہلے ہی بند تھیں۔ جولائی کے مہینے میں اے سی چلنے سے شاید انہیں خنکی کا احساس ہو رہا تھا۔ مریم نے اٹھ کر بے دلی سے اے سی بند کر دیا۔ حالانکہ اسے کافی گھٹن اور گرمی محسوس ہو رہی تھی۔

''مجھے بہت گھٹن محسوس ہو رہی ہے، کیا یہاں کا اے سی ٹھیک کام کر رہا ہے؟'' اے سی بند کر کے ابھی وہ اپنی جگہ پر بیٹھی تھی کہ ملک صاحب نے پھر سے حکم جاری کیا۔ مریم نے بے حد جھنجلا کر انہیں دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بے سدھ پڑے تھے۔ ان کے چہرے پر نقاہت کی زردی کھنڈی تھی۔ مریم کا نرم دل پسیجا۔ وہ خوامخواہ ایک بیمار شخص پر غصہ ہو رہی تھی۔ حالانکہ یہ اس کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ خود کو ڈانٹتی ہوئی اٹھی اور پھر سے اے سی آن کر دیا۔ اے سی کا مین پاور والا بٹن ملک صاحب کے بیڈ کے بالکل اوپر تھا۔ مریم جب اے سی آن یا آف کرنے کے لیے آگے بڑھتی تو اسے بیڈ کے بہت قریب سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ ملک صاحب دواؤں کے زیر اثر غنودگی میں تھے۔ ان کا ایک بازو پہلو میں ٹکا تھا جب کہ دوسرا بیڈ سے نیچے لٹک رہا تھا۔ مریم ان کا بازو ان کے سینے پر ٹکا دیتی مگر وہ پھر سے نیچے ہو جاتا۔ ملک صاحب، مریم کو سکون سے بیٹھنے ہی نہیں دے رہے تھے۔ ان کی طرف سے ہر پندرہ منٹ بعد جاری ہونے والے نئے احکامات اسے متحرک رکھے ہوئے تھے۔

''مجھے پانی پلا دو۔''

''میرے سر میں بہت درد ہے۔ سر دبا دو۔''

''مجھے لحاف اوڑھا دو۔''

''میرا لحاف ہٹا دو۔''

یہ سب کام کرتے ہوئے اسے نگہت پہ بھی غصہ آ رہا تھا۔ مریم کام سے گھبرانے والی لڑکی نہیں تھی، مگر چونکہ اسے ابھی ایسے کاموں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس نے تو ابھی تک دو گھنٹے سے زیادہ والی کوئی ڈیوٹی بھی نہیں دی تھی۔ فرسٹ ایئر میں ہر شفٹ ذرا کم دورانیے کی ہوتی تھی۔ وہ صرف اور صرف نگہت کی وجہ سے اس الجھن میں گرفتار ہوئی تھی۔ نگہت کو کسی ضروری

کام سے اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں جانا تھا اور اس کی نائٹ شفٹ تھی۔ اس نے مریم سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کی جگہ ڈیوٹی کر لے۔ مریم نے بہت مشکل سے ہامی بھری تھی۔ اگر میٹرن اس کی یہ ڈیوٹی لگاتی تو وہ ہنسی خوشی یہ فریضہ سر انجام دے لیتی مگر کسی اور کی جگہ اسے ڈیوٹی دینے سے ڈر لگتا تھا۔

''میرے ہاتھوں سے جان نکل رہی ہے سسٹر! میرے ہاتھ بالکل سن ہو چکے ہیں۔'' ملک صاحب کراہ کر بولے۔ ان کی آواز میں بے پناہ درد تھا۔ مریم ان کی تکلیف کی شدت کو محسوس کر کے ہمدردی کے جذبات سے مغلوب ہو کر آگے بڑھی۔ اس نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار کی شدت کو محسوس کرنا چاہا مگر ان کے جسم کا درجہ حرارت نارمل تھا۔ انہیں ڈرپ بھی نہیں لگی ہوئی تھی۔ نگہت نے مریم کو یہی بتایا تھا کہ ملک صاحب اینگزائٹی کا شکار رہتے ہیں۔ بزنس میں ہونے والے کسی نقصان کے باعث ان کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ وہ ڈاکٹر کے مشورے پر ریلکیس کرنے کے لیے ہاسپٹلائزڈ ہوئے تھے مگر نہ جانے کیوں مریم کو محسوس ہو رہا تھا کہ ملک صاحب کا مسئلہ کچھ اور ہے۔ وہ شاید احساس تنہائی کا شکار تھے، اسی لیے بار بار مریم کو پکارتے تھے۔

''میرے ہاتھوں کو سہلا دو سسٹر! میرے ہاتھ بے جان ہو رہے ہیں۔'' انہوں نے کراہتے ہوئے نیم غنودگی کی حالت میں کہا۔ مریم نے ان کے بھدے ہاتھ پر اپنا نرم و نازک ہاتھ رکھ کر سہلانا شروع کر دیا۔ ملک صاحب کے ہاتھوں پہ موجود سفید کھردرے بال اس کے ہاتھوں میں گدگدی پیدا کر رہے تھے۔ مریم ان کے ہاتھ کی پشت کو سہلا رہی تھی کہ انہوں نے اپنا ہاتھ سیدھا کر لیا۔ قبل اس کے کہ وہ مدہوشی کے زیر اثر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑتے دروازہ آہستگی سے کھل کر تیزی سے بند ہو گیا۔ مریم تو گڑبڑائی ہی تھی، ملک صاحب نے بھی سٹپٹا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ جو انہیں سویا ہوا سمجھ رہی تھی، ان کی اس حرکت پر کچھ حیران ہوئی۔ ابھی وہ ان کا ہاتھ دوبارہ تھامنا چاہتی تھی کہ دروازہ پھر سے کھلا۔ اندر داخل ہونے والی شخصیت کو دیکھ کر وہ حیران ہی نہیں بلکہ پریشان بھی ہو گئی۔ وہ آن ڈیوٹی ڈاکٹر صاحب تھے۔ مریم ان کے چہرے سے واقف تھی مگر ان کے نام سے آگاہ نہیں تھی۔ انہوں نے اوور آل کندھے پر لٹکا رکھا تھا جب کہ اسٹیتھو سکوپ گردن کے گرد لٹکا رہا تھا۔ رات کے اس پہر بھی وہ جاگ رہے تھے۔ حالانکہ مریم نے سینئر نرسز سے سنا تھا کہ رات کی شفٹ کے آن ڈیوٹی ڈاکٹرز عام طور سے اپنے اپنے کمروں میں مورچہ بند ہو کر بیٹھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

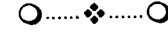
''کیسا محسوس کر رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ شخص ملک صاحب کے بستر کے قریب آ کر دریافت کرنے لگا۔ ملک صاحب نے کیا جواب دیا، مریم سن نہیں پائی۔ وہ دل ہی دل میں ''جل تو جلال تو'' کا ورد کرنے لگی۔ نگہت نے اسے خاص طور سے تاکید کی تھی کہ آن ڈیوٹی ڈاکٹر کو کال کرنے کی کوشش مت کرنا اور کسی بھی طرح کی پرابلم ہو تو اسے خود ہینڈل کرنا کیونکہ ایک تو ملک صاحب کی حالت بے حد تسلی بخش تھی اور دوسرا اس صورت میں نگہت کی جواب طلبی کا اندیشہ تھا۔

''آپ تو ماشاء اللہ بالکل ٹھیک لگ رہے ہیں ملک صاحب! ان شاء اللہ مارننگ میں آپ کو ڈسچارج کر دیا جائے گا۔'' مریم کی طرف ایک نظر ڈالے بغیر ڈاکٹر صاحب نے چیک اَپ مکمل کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''اب آپ کی ضرورت نہیں ہے سسٹر! آپ چل کر میرے کیبن میں بیٹھیے میں ابھی آتا ہوں۔ میرا خیال ہے، آپ کو بہت نیند آ رہی ہے اور آپ کو ایک کپ کافی کی ضرورت ہے۔''

ڈاکٹر نے پہلی مرتبہ مریم کی طرف دیکھ کر کہا۔ ان کی آنکھوں میں اب نیند کا شائبہ بھی نہیں تھا اور ان کے چہرے پر عجیب مبہم سی مسکراہٹ تھی۔ وہ دوبارہ سے ملک صاحب کی طرف متوجہ ہوا تو مریم فوراً اس پرائیویٹ روم سے باہر نکل کر نرسز

کے لیے بنے ہوئے مخصوص کیبن میں آکر واش روم میں گھس گئی۔ اسے جواب طلبی سے ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔ اور اس وقت اسے نگہت پہ سب سے زیادہ غصہ آرہا تھا۔



''کیا آآآ۔'' نگہت نے ساری بات سن کر شہادت کی انگلی منہ میں ڈال کر جس طرح ''کیا آآآآ'' کا نعرہ بلند کیا، اس سے مریم تو جھنجلائی ہی، ساتھ ساتھ دور آئینے میں اپنا عکس دیکھتی روبینہ بھی ہڑبڑا گئی۔ وہ لپ اسٹک لگانے میں مصروف تھی۔ نگہت کی بانگ نے اس کے ہاتھ کا توازن بھی خراب کیا جس سے لپ اسٹک ہونٹوں کے کنارے سے آگے پھیلتی چلی گئی۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا، مگر اس کے چہرے پر نگہت کے لیے ''فٹے منہ تمہارا'' والے تاثرات تھے۔

''کیا تم سارا وقت واش روم میں بیٹھی رہیں؟'' نگہت نے سابقہ حیرانی و پریشانی سے پوچھا مریم نے اسے آنکھ کے اشارے سے خاموش ہو جانے کے لیے کہا کیونکہ وہ روبینہ کے سامنے یہ سارا معاملہ ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ روبینہ سے تو خیر اس کی بہت گہری دوستی ہی نہیں رہی تھی مگر تزئین سے بھی اس نے ابھی یہ ساری بات ڈسکس نہیں کی تھی۔ لیکن نگہت کو بتانا بے حد ضروری تھا، روبینہ اپنی سرگرمیوں میں دوبارہ معروف ہو چکی تھی، اس لیے اس نے ان کی جانب اتنا دھیان ہی نہیں دیا۔

''تو کیا تم سارا وقت واش روم میں بیٹھی رہیں؟'' مریم کے ٹوکنے پر نگہت نے آواز کو بے حد دھیما کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

''نہیں، میں سارا وقت واش روم میں بیٹھی نہیں رہی بلکہ میں واش روم کی چھت سے لٹک گئی تھی۔'' مریم نے بہت جل کر جواب دیا مگر نگہت پہ کوئی اثر نہیں ہوا۔

''ملک صاحب تو بہت خفا ہوں گے؟'' وہ بڑبڑائی، مریم کا سارا دھیان روبینہ کی جانب تھا جس کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ مریم خود بھی یہ سارا معاملہ تفصیل سے ڈسکس کرنا چاہتی تھی مگر اسے روبینہ کے کمرے سے نکل جانے کا انتظار تھا۔

''وہ ڈاکٹر کون تھا جس نے تمہیں ڈانٹا تھا؟'' نگہت نے ایک اور سوال اٹھایا۔ اب کی بار مریم نے اسے گھور کر دیکھا پھر روبینہ کی پروا کیے بغیر بولی۔

''میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں اس ڈاکٹر کا نام نہیں جانتی۔ میں نے دو ایک بار اسے وارڈز میں چلتے پھرتے دیکھا ہے مگر چونکہ مجھے وارڈز میں آتے جاتے بھی صحیح معنوں میں جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے، اس لیے میری بہت سارے لوگوں سے ابھی واقفیت نہیں ہے۔'' نگہت نے اس کے لہجے کی سختی کا قطعاً برا منائے بغیر گردن ہلانا شروع کر دی تھی، گویا اس کی بات سے اتفاق کر رہی ہو۔

''وہ ڈاکٹر مرتضیٰ تو نہیں تھے نا؟'' نگہت نے پوچھا۔

''نہیں بابا، وہ ڈاکٹر مرتضیٰ نہیں تھے۔'' مریم نے اسے تسلی دلائی۔

''وہ ڈاکٹر مرتضیٰ ہو بھی نہیں سکتے۔ انہوں نے میرے کام میں مداخلت کر کے اپنی شامت بلوانی تھی۔'' نگہت نے با آواز بلند خود کلامی کی تھی، مریم نے اس کی جانب حیرانی سے دیکھا۔

''یار! ڈاکٹر مرتضیٰ بہت رحم دل انسان ہیں وہ کسی کو نہیں ڈانٹ سکتے۔ میرا تو وہ بہت خیال رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے جس ڈاکٹر نے تمہیں ڈانٹ پلائی ہے، وہ ڈاکٹر مرتضیٰ نہیں تھے۔'' نگہت اس کی حیرانی بھی رفع کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ

خود کو بھی یقین دلا رہی تھی۔

''مریم! میں اپنے کزن کے ساتھ اپنی خالہ کے گھر جا رہی ہوں۔ میں لیٹ واپس آؤں گی۔'' روبینہ کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ اپنا دوپٹہ شانوں پہ درست کرتی وہ مریم کو اپنے پروگرام کے بارے میں مطلع کر رہی تھی۔ مریم نے مسکرا کر صرف سننے پر اکتفا کیا۔ روبینہ کے لاہور شہر میں اچانک بہت سے رشتے دار پیدا ہو گئے تھے۔ وہ اکثر اوقات ان سب سے ملنے کے لیے جاتی رہتی تھی اور واپسی میں لیٹ ہو جانا اس کا عام معمول تھا۔ جب تک روبینہ کمرے سے نکل نہیں گئی، مریم اس کی جانب دیکھتی رہی۔ روبینہ اتنے سے دنوں میں بہت نکھر گئی تھی۔

''تم نے اس ڈاکٹر کے اوور آل پر لگا بیج نہیں دیکھا تھا؟'' روبینہ کے چلے جانے کے بعد نگہت پھر سے اسی موضوع پر آ گئی۔ وہ بے حد تشویش میں مبتلا تھی۔

''ارے یار! اس نے اوور آل کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ میں دیکھ ہی نہیں پائی اس کے نام والا بیج۔'' مریم نے افسوس سے کہا۔ اسے نگہت کی پریشانی کا احساس تھا اور وہ خود بھی کم پریشان نہیں تھی۔

''میں ایسا کرتی ہوں کہ تمہیں اس شخص کا حلیہ بتانا شروع کرتی ہوں۔ تم خود ہی اندازہ کر لینا۔ کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔'' وہ اس ڈاکٹر کے متعلق بتانے لگی۔

''ہاں میں سمجھ گئی، وہ یقیناً ڈاکٹر عادل تھا۔ مجھے پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ وہ ڈاکٹر عادل کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔'' نگہت نے ناگواری سے ناک چڑھا کر کہا۔

''ستیاناس ہو تمہارا ڈاکٹر عادل...... اس ملک نے تو میرا قیمہ کر دینا ہے۔'' اب وہ بڑبڑا رہی تھی۔ مریم کو اس کی کچھ باتیں سمجھ میں آرہی تھیں اور کچھ بالکل سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ وہ بیک وقت ڈاکٹر عادل اور ملک صاحب کے خوف میں مبتلا تھی۔

''ڈاکٹر عادل میری شکایت تو نہیں کر دیں گے؟'' مریم نے ایک نئی تشویش میں گھر کر نگہت سے پوچھا۔

''تمہیں ڈاکٹر عادل کی پڑی ہے اور مجھے اس ملک سے خطرہ ہے۔'' نگہت اُکتا کر بولی، پھر مریم کے رنگ بدلتے چہرے پر نظر پڑی تو فوراً بات پلٹ کر بولی۔

''ایسی کی تیسی ڈاکٹر عادل کی، بھاڑ میں جائے۔ تمہیں پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں ان سے ایکسکیوز کر لیتی ہوں؟'' اس نے گویا نگہت سے اجازت طلب کی۔ نگہت بدک اٹھی۔

''خبردار جو تم اس شخص کے پاس گئیں۔ تمہیں کیا پتہ وہ کس قدر برا آدمی ہے۔ دنیا کا خبیث ترین آدمی ہے۔ تم نے بہت اچھا کیا جو تم اس کے کیبن میں نہیں گئیں۔ اس انسان نے تو ہمارا جینا ہی حرام کر دیا ہے۔ تم کیا جانو کتنی لڑکیوں کو کافی پلوانے کے بہانے برباد کر چکا ہے۔ ایسے لوگوں کو تو اپنے مرتبے اور مقام کا احساس بھی نہیں ہوتا۔'' نگہت کی باتیں مریم کے لیے کسی قدر انوکھی تھیں اور دل دہلا دینے والی بھی مگر پھر بھی وہ مطمئن تھی کہ نگہت جیسی دوست اس کے ہمراہ تھی جو اسے بہت سی مشکلات سے بچا سکتی تھی۔



چھٹی والے روز خلافِ توقع اس کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا کیونکہ وہ ایک دن پہلے ہی سب کام کر کے فارغ ہو چکی تھی۔ وہ مہینہ بھر بعد ہی گھر جا پاتی تھی، اس لیے اپنے میلے کپڑے وہ ہاسٹل میں ہی دھو لیتی تھی۔ اس نے کل ہی

ہفتہ بھر کے میلے کپڑے دھوئے تھے پھر رات کو انہیں پریس بھی کر لیا تھا۔ وہ چونکہ ذرا جلدی اُٹھنے کی عادی تھی اس لیے روبینہ اور تزئین کے اُٹھنے سے پہلے ہی اس نے اپنی الماری میں کتابوں وغیرہ کی ترتیب درست کی، رات کی چائے کے جوٹھے برتن دھوئے اور اس کے بعد اس نے پریس کیا ہوا یونیفارم بھی دوبارہ پریس کر لیا تھا مگر روبینہ اور تزئین ابھی بھی گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہی تھیں۔ ان کو جگاتے جگاتے اسے بھی نیند آنے لگی اور اس وقت وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تینوں چھٹی کے روز ایک ساتھ ناشتہ کیا کرتی تھیں اور تقریباً ہر اتوار ہی اسے ناشتے کی طلب میں بہت دیر تک بھوکے رہنا پڑتا تھا کیونکہ اس کی دونوں روم میٹس بہت لیٹ اُٹھنے کی عادی تھیں۔

ان دونوں کو کوسنے دیتی وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ سارے ہاسٹل میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ویک اینڈ پہ بہت سی لڑکیاں گھروں کو چلی جاتی تھیں یا پھر اپنے رشتہ داروں کے یہاں وقت گزارنا پسند کرتی تھیں۔ مریم کوریڈور سے گزرتے ہوئے اردگرد کے کمروں کے دروازوں پہ لگے موٹے موٹے تالے دیکھتی لان میں آ گئی، مگر ساڑھے نو بجے ہی سورج کی تابناکی عروج پر تھی۔ صبح کی تیز دھوپ اسے تپتی دوپہر کا مزا دے رہی تھی۔ وہ اُکتا کر دوبارہ کوریڈور کی سمت آ گئی۔

''اماں! میری میتھس کی نوٹ بک پہ دو اسٹارز ملے ہیں۔ ٹیچر کہتی ہیں، ساری کلاس میں علیزے کا میتھس سب سے اچھا ہے۔ میں ہمیشہ ٹین آؤٹ آف ٹین لیتی ہوں اماں۔''

ایک کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے مریم کے کانوں میں آواز پڑی۔ وہ کمرہ کس کا تھا، مریم نہیں جانتی تھی مگر ادھ کھلے دروازے سے فرش پر بیٹھی ایک بچی اسے واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اس بچی کے سامنے جگسا پزل پڑی تھی۔ وہ فرش پر سے اس کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر جگسا پزل کے فریم میں جمع کرنے میں مصروف تھی۔ وہ صحت مند سی گپلو سی بچی، مریم کو پہلی نظر میں ہی بے حد کیوٹ لگی۔ اس کا دل چاہا کہ کمرے کے اندر جا کر اس بچی کو پیار کرے۔ ابھی وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ بچی کی ماں کی آواز بھی سنائی دی۔

''اماں کی چندا! اردو کے بارے میں بھی تو بتاؤ۔ تمہاری اردو کی ٹیچر کہہ رہی تھیں کہ تم اردو کے املا میں بہت غلطیاں کرتی ہو۔''

مریم کے لیے یہ آواز بہت جانی پہچانی تھی۔ میڈم زینت کی آواز تو وہ سینکڑوں آوازوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ اسے حیرت ہوئی میڈم زینت کی بیٹی بالکل بھی ان پر نہیں گئی تھی۔ اس بچی کی رنگت بے حد سرخ و سفید تھی جب کہ میڈم زینت کافی سانولی تھیں۔ مریم نے اندر کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا کہ بہرحال میڈم زینت کبھی بھی اس کی گڈ بکس میں شامل نہیں رہی تھیں۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' میڈم زینت نے اسے اپنے کمرے کے باہر کھڑا دیکھ لیا تھا۔

''السلام علیکم۔'' اس نے گڑبڑاہٹ میں سلام کر ڈالا۔ حالانکہ یہاں اس طرح سے سلام کرنے کا رواج ذرا کم ہی تھا۔

''وسلام...... خیریت؟'' انہوں نے دروازے کے قریب آ کر استفہامیہ انداز میں پوچھا۔ وہ انہیں کوئی مناسب جواب دینے ہی والی تھی کہ پیون اسے بلانے آ گیا۔

''تسی ایتھے کھڑے او، میں تہاڈے کمرے وچ لب ریا سی۔ تہاڈے پائی ہوراں آئے نیں۔''

(آپ یہاں کھڑی ہیں اور میں آپ کو آپ کے کمرے میں تلاش کر رہا تھا، آپ کے بھائی آئے ہیں۔)

اسے خوشگوار جھٹکا لگا۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے گیسٹ روم کی جانب آئی۔ حیدر اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔

''ایہہ بیٹھے نیں تہاڈے پائی جان۔'' پیون بھی اس کے ساتھ ہی بھاگ کر گیسٹ روم تک آیا تھا۔ لڑکیوں سے ملنے کے لیے آنے والے لوگوں سے ٹپ وغیرہ ملنے کی توقع اس کو بہت مستعد کر دیتی تھی۔

''اس احمق سے کہو، میں تمہارا پائی جان نہیں ہوں۔'' حیدر چڑ کر بولا۔ مریم کو اس کے انداز پر خوامخواہ کی ہنسی آئی۔ گزشتہ بار جب وہ گھر گئی تھی تو اس کی امی نے سرسری ساذکر کیا تھا کہ اس کی پھپھو، حیدر کے لیے اس کا رشتہ مانگ رہی ہیں۔ ظاہر ہے یہ بات حیدر بھی جانتا تھا، اس لیے اس کے انداز پہلے کی نسبت کچھ بدل سے گئے تھے۔

''میں تمہیں لینے کے لیے آیا ہوں۔'' ابتدائی علیک سلیک کے بعد حیدر نے کہا۔ سفید لٹھے کے کڑکتے کلف شدہ شلوار قمیص میں وہ خود کو کسی ریاست کا راجہ سمجھ رہا تھا۔ اسے اپنی وجاہت کا بے حد احساس تھا اور گیسٹ روم میں آتی جاتی جھانکتی لڑکیاں اسے باور کرا رہی تھیں کہ وہ اچھا لگ رہا ہے۔ مریم نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

''تمہیں کچھ احساس ہے گلابی سنڈی! اس بار تمہیں پورا ڈیڑھ مہینہ ہو گیا ہے گھر سے آئے ہوئے۔ وہاں سب تمہارے لیے کتنے اداس ہو رہے ہیں۔'' حیدر نے اتنا کہہ کر ملک شیک کے گلاس میں موجود آخری گھونٹ بھی اپنے اندر منتقل کر لیا اور پھر تب تک گلاس منہ سے لگائے رکھا جب تک آخری قطرہ بھی اس کے منہ میں منتقل نہیں ہو گیا۔

''حیدر کے بچے...... شرم کرو...... سب لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔'' اس نے جل کر کہا۔ اسے افسوس ہوا کہ اس نے حیدر کو ملک شیک آفر ہی کیوں کی۔

''ارے تو اس میں شرم والی کیا بات ہے، ماشاءاللہ اتنا خوبرو ہوں۔ لڑکیوں نے دیکھ بھی لیا تو کیا ہوا اور پھر لڑکیاں ہی دیکھ رہی ہیں نا، ان کی مائیں تو نہیں۔ مائیں دیکھتیں تو میں شرماتا بھی کیونکہ ہمارے معاشرے میں داماد تو مائیں ہی پسند کرتی ہیں نا۔'' وہ ڈھیٹ بنا کہہ رہا تھا۔

''یہ لاہور ہے حیدر صاحب! آپ کا بھائی پھیرو نہیں۔ یہاں لڑکیاں اپنی مرضی سے اپنی ماؤں کے لیے داماد چنتی ہیں۔''

وہ اسی کے انداز میں بولی مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

''اچھا یہ تو بڑے مزے کی بات ہے...... تم نے بھی کچھ سیکھ لینا تھا ہمارا بھی کوئی فائدہ ہو جاتا۔ اب ہم کہاں تمہارے لیے خوار ہوتے پھریں گے۔'' وہ اسے چڑاتے ہوئے بولا۔

''ارے تم فکر مت کرو...... میں نے سب سیکھ لیا ہے...... میرے لیے تمہیں کوئی خواری نہیں اٹھانی پڑے گی۔''

مریم نے شرارت کا بدلہ شرارت سے لیا مگر حیدر کے چہرے کا رنگ بدلا، ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہو گیا پھر گہری سانس لے کر بولا۔

''یہ بات تو تم دل سے نکال دو مریم بی بی میں جانتا ہوں یہ خواری تو مجھے ہی اٹھانی پڑے گی کیونکہ یہ میری قسمت میں لکھی ہوئی ہے...... یہ دیکھو میرے ہاتھ پر کتنا واضح ''M'' لکھا ہے۔''

اس نے اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی۔ اس کے دل اور دماغ کی لائن اس طرح سے آپس میں ملتی تھی کہ اگر زندگی کی لائن کو ساتھ ملا کر دیکھا جاتا تو ایسا ہی محسوس ہوتا تھا جیسے ''M'' لکھا ہے۔ حیدر کے چہرے پر پھیلی میٹھی سی سنجیدگی نے مریم کو عجیب سے احساسات سے دوچار کیا، وہ بچی نہیں تھی کہ حیدر کے محسوسات کو سمجھ نہ سکتی۔ وہ پہلے کی نسبت خود کو بہت میچور محسوس کرتی تھی۔ حیدر جب تک بیٹھا رہا اسی طرح کی بے سروپا باتیں کرتا رہا۔ حیدر کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں

آئی تو اس کا موڈ بے حد خوش گوار ہو چکا تھا۔

"تو پیا سے مل کر آئی ہے بس آج سے نیند پرائی ہے۔" تزئین نے اسے دیکھتے ہی گنگنانا شروع کر دیا۔ روبینہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔

"یہ کون تھا؟" تزئین نے شرارتی انداز میں پوچھا۔ وہ شاید گیسٹ روم میں اسے کسی لڑکے کے ساتھ بیٹھا دیکھ چکی تھی۔

"کزن تھا میرا...... حیدر...... میرے بھائی کے جیسا ہے۔" وہ ذرا چڑ کر بولی۔ اسے پتا تھا اب تزئین مزید سوالات کرے گی، اس لیے فوراً بھائی کا حوالہ دیا مگر تزئین نے بات ہی پکڑ لی۔

"ہیں...... سچ تمہارا بھائی بھی ایسا ہی ہے۔ اس کا مطلب تمہارا بھائی بھی بہت ہینڈسم ہے۔ تم نے اس کی منگنی وغیرہ تو نہیں کی ہوگی ابھی، یار پلیز ایسا کرتے وقت ایک بار میرے متعلق ضرور سوچنا۔ میرا اور تمہارے بھائی کا پرفیکٹ کپل بنے گا۔ وہ کیا کہتے ہیں پرفیکٹ میچ۔" وہ آنکھیں بند کیے کہہ رہی تھی۔ مریم کو ہنسی آگئی۔

"بکو نہیں...... تم سے چھوٹا ہو گا وہ۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"ہائے ہائے ایک تو ہر ہینڈسم لڑکا مجھ سے چھوٹا ہوتا ہے اور جو مجھ سے بڑا ہوتا ہے وہ "کزن" ہوتا ہے اور "کزن" پہ پہلا حق تمہارا ہے۔ میں تمہارے حق پہ ڈاکہ نہیں ڈال سکتی۔"

وہ آنکھ مارتے ہوئے بولی۔ مریم خاموش ہی رہی۔ وہ پہلے بھی حیدر کا غائبانہ تعارف کروا چکی تھی اور تزئین، مریم کو اکثر حیدر کے نام سے چھیڑتی تھی۔ چونکہ روبینہ کا بھی کزن اس سے ملنے آتا رہتا تھا اس لیے وہ ان دونوں سے کہا کرتی تھی۔

"یار او ویسے تم لوگ اس معاملے میں کتنے خود کفیل ہو جسے دیکھو اس کا ہی ایک عدد کزن ضرور ہے۔ ایک میں ہی "بے کزنی" پیدا ہو گئی ہوں، اس بھرے جہاں میں۔"

مریم نے چائے اور ناشتے کے لوازمات دیکھنے شروع کیے پھر تزئین سے پوچھا۔

"روبینہ کہاں ہے؟"

"وہ بھی گیسٹ روم میں ہی تھی...... اس کا بھی کزن آیا ہوا ہے۔"

تزئین نے جل کر جواب دیا۔ مریم خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہی وہ روبینہ کو گیسٹ روم میں ایک لڑکے کے ساتھ بیٹھا دیکھ چکی تھی۔

O......❖......O

"آپ سب انتہائی نکمے، کام چور اور انسانیت سے عاری لوگ ہیں۔"

سرجن مرتضیٰ کی آواز قدرے اونچی تھی۔ مریم چند لمحے پہلے وارڈ میں داخل ہوئی تھی، اس نے حیرانی سے ان کی جانب دیکھا۔ اس نے انہیں پہلی مرتبہ اس قدر غصے میں دیکھا تھا۔ دھیمے لہجے اور پُرشفقت انداز میں بات کرنے والے سرجن مرتضیٰ اس کے پسندیدہ ترین ڈاکٹر تھے۔ مستقل فیکلٹی کا حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ آرتھوپیڈک وارڈ کے ہیڈ بھی تھے۔

مریم کی ڈیوٹی اسی وارڈ میں لگ رہی تھی اس لیے ان سے بھی اکثر سامنا رہتا تھا۔ ان کا اتنا غصیلا روپ وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

"میں نے الطاف سے کہا تھا سر! مگر وہ کہنے لگا کہ......" اختر منمنایا۔

"مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو اختر! تم جانتے ہو کہ غلطی تمہاری ہے۔"

سرجن مرتضیٰ نے اس کی بات کاٹی۔

"میں نے ایکسرے رپورٹ دیکھ کر اس پر سکرپشن لکھا تھا۔ اس بچی کے جوائنٹس ابھی اس قابل بھی نہیں تھے کہ ایک سوئی کا بوجھ اٹھا سکتے اور تم نے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پلستر ہی ہٹا دیا۔ مجھے یہ بتاؤ سرجن میں ہوں یا تم۔ ہفتہ بھر سے پہلے تم نے ایک مریض کی پٹیاں نہیں کھولنی۔" ان کا لہجہ اب کی بار پہلے سے بھی زیادہ اونچا تھا۔ مریم کو اصطلاحات سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ اختر علی آرتھوپیڈک وارڈ کا سینئر موسٹ میل نرس تھا۔ اسے اکثر معاملات میں اپنی من مانی کرنے کی عادت تھی۔ وہ رشوت لے کر بہت سے غلط ملط کام کر دینے کا عادی تھا جس کا خمیازہ اسے بعد میں بھگتنا پڑتا تھا۔

"میں نے خود پٹیاں نہیں کھولی تھیں سر! ان کے گھر والوں کا اصرار تھا کہ اب پٹیاں کھول دی جائیں۔ وہ میری منت ساجت کر رہے تھے بس اس لیے میں نے......"

"پہلے تمہاری منت ساجت کر رہے تھے اور اب میری منت ساجت کر رہے ہیں کیونکہ اب کوئی آرتھوپیڈک ایسا نہیں جو ان کی بیک بون کے اس مہرے کو دوبارہ سے پوزیشن پر لا سکے۔ تمہاری عجلت کے باعث ایک اچھا بھلا صحت مند انسان ساری زندگی کے لیے مفلوج ہو گیا۔" سرجن مرتضیٰ نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"میں آپ سے کہہ تو رہا ہوں سر کہ......"

"اچھا چلو ایک لمحے کے لیے فرض کر لیتا ہوں کہ اس مریض کے گھر والے اصرار کر رہے تھے مگر اس بچی کا کیا قصور تھا جس کا پلستر ہٹا دیا تم نے، اس بچی کے پیرنٹس سے میری بات ہوئی ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ تم نے زبردستی اس کا پلستر ہٹایا تھا کیونکہ وارڈ میں کوئی بیڈ خالی نہیں تھا اور تمہارا کوئی رشتہ دار ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہونے والا تھا اسی لیے تم نے اس بچی کا پلستر کھول دیا۔"

سرجن مرتضیٰ چبا چبا کر کہہ رہے تھے۔ مریم کے علاوہ الطاف، نگہت وغیرہ بھی اردگرد کھڑے تاسف بھری نظروں سے اختر کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ہفتہ بھر پہلے سرجن مرتضیٰ نے اسے تنبیہہ کی تھی مگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔

"سرجن مرتضیٰ اب کی بار اختر کو معاف نہیں کریں گے۔" نگہت نے مریم کے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔ اس کا اندازہ بالکل درست ثابت نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر مرتضیٰ اختر کو گھورتے ہوئے اپنے کیبن کی سمت چل دیئے مگر چند لمحوں بعد آرتھوپیڈک وارڈ کے آن ڈیوٹی پیرامیڈیکل اسٹاف کو طلب کیا گیا تھا۔ ان کے کیبن میں ان کے علاوہ ڈاکٹر عادل، ڈاکٹر تحریم، سرجن ظہور بھی موجود تھے۔ وہیں مریم کو پتا چلا تھا کہ جس بچی کا پلستر وقت سے پہلے کھول دیا گیا تھا وہ سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والے خاندان کی بچی تھی اور اس کے گھر والوں کی شکایت بہت اوپر تک پہنچ گئی تھی جہاں سے ایم ایس تک کو خاص ہدایات آئی تھیں اور ایم ایس نے سرجن مرتضیٰ کو طلب کر کے ٹھیک ٹھاک قسم کی جواب طلبی کی تھی۔

"میں اب کی بار تمہیں پھر معاف کر دیتا ہوں۔ میں نے ایم ایس کے سامنے کہیں تمہارا نام نہیں لیا بلکہ خاموشی سے تمہاری غلطی کو اپنے کھاتے میں ڈال کر ان کی بری بھلی سن آیا ہوں مگر آج کے بعد تم نے اس قسم کی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا تو پھر تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

سرجن مرتضیٰ نے سب کی موجودگی میں اختر کو معاف کر دیا تھا مگر اختر کے ساتھ ساتھ ان سب کو بھی اپنی اپنی ذمہ داری مکمل ایمانداری کے ساتھ نبھانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس سارے وقت میں ڈاکٹر عادل کے انداز نے مریم کو بے حد سلگایا۔ انہوں نے ساری گفتگو کے دوران کچھ بھی کہنے کے بجائے مریم کو گھورنے پر اکتفا کیا۔ نگہت نے ان کا یہ انداز دیکھ کر

مریم سے آنکھوں ہی آنکھوں میں یقین دہانی چاہی تھی کہ یہ وہی ڈاکٹر ہیں جو ملک صاحب والے پرائیویٹ روم میں آئے تھے۔ مریم پہلے ہی ان کے اوورآل پر لگے بیج سے ان کا نام پڑھ چکی تھی۔ اس روز سارے وارڈ میں سرجن مرتضیٰ کے جذبہ ایثار کی تعریف ہوتی رہی جب کہ مریم دل ہی دل میں ڈاکٹر عادل کے رویے سے خوفزدہ رہی۔ اچھا بھلا پڑھا لکھا شخص اس قسم کی جاہلانہ حرکتیں کرتا اسے ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔



''روبینہ کی بات پکی ہوگئی ہے۔'' تزئین نے سینڈل کا اسٹریپ بند کرتے ہوئے پُرمسرت لہجے میں اطلاع دی۔ وہ دونوں مارکیٹ تک جا رہی تھیں۔

''اتنی خوشی کی خبر اتنی دیر سے سنا رہی ہو اور یہ محترمہ روبینہ کہاں ہیں؟'' مریم نے چادر اوڑھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

''محترمہ روبینہ اپنے کزن کم منگیتر کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے گئی ہیں۔ میں نے پوچھا کہاں جا رہی ہو تو پہلے کچھ بولی نہیں پھر شرماتے ہوئے کہنے لگی کہ اجمل کے ساتھ باہر جا رہی ہوں، پھر خود ہی کہنے لگی کہ بات پکی ہونے کی خوشی میں اجمل مجھے ٹریٹ دینا چاہتا ہے۔''

تزئین نے تفصیل کے ساتھ بتایا۔ وہ دونوں ہاسٹل کے کاریڈور سے ہوتی ہوئی گیٹ تک آ گئی تھیں۔

''اجمل اس کا وہی کزن ہے نا جو ہر ویک اینڈ پہ ملنے کے لیے آتا ہے؟''

مریم نے پوچھا تو تزئین نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ دونوں مین روڈ کی طرف...... جا رہی تھیں جہاں سے انہوں نے وین پکڑنا تھی۔

''ہاں یار وہی کزن ہے...... اچھا ہینڈسم لڑکا ہے...... میرا تعارف تو نہیں ہے مگر میں نے بہت مرتبہ گیسٹ روم میں اور ہاسٹل کے لان میں اسے روبینہ کے ساتھ دیکھا ہے۔''

تزئین جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے میں ماہر تھی۔ وہ دونوں وین میں سوار ہوئیں تو کچھ دیر کے لیے خاموش بھی ہو گئیں پھر مارکیٹ میں بھی خریداری کرتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ سب ضروری چیزیں خرید لینے کے بعد مریم کو بھوک ستانے لگی۔ تزئین کو بھی بھوک تو لگ رہی تھی مگر ہاسٹل میں آج اس کی فیورٹ مکسڈ سبزی بن رہی تھی اس لیے وہ ڈنر ہاسٹل میں ہی کرنا چاہتی تھی۔ وہ دونوں متفقہ فیصلہ کر کے جوس پینے کے لیے ایک چھوٹے سے کھوکھے کی جانب آ گئیں جہاں ملک شیک بھی دستیاب تھا۔

ان دونوں نے اسٹابری شیک کا آرڈر دیا پھر آپس میں باتیں کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ موسم میں اوائل نومبر کی مخصوص خنکی شامل تھی۔ لوگوں کا کافی رش لگا تھا۔ لاہور شہر کے باسیوں کی یہ روایت مریم کو بہت عجیب لگتی تھی۔ موسم میں جیسے ہی کوئی خوشگوار تبدیلی آتی سارا لاہور گھروں سے باہر اُمڈ آتا۔ ہوٹلز، ریسٹورنٹس، کھوکھے، چھوٹے چھوٹے فاسٹ فوڈ کارنرز سب جگہ گویا میلہ سا لگ جاتا تھا۔ سب لوگ تقریباً ''ہم کھانے کے لیے زندہ ہیں'' کی عملی تصویر بنے نظر آنے لگتے۔

اب بھی کم و بیش یہی صورتِ حال تھی۔ دہئ چوک کے اردگرد جتنے ٹھیلے یا فوڈ کارنرز نظر آ رہے تھے۔ وہاں بے تحاشا رش تھا۔ وہ دونوں مین جگہ کھڑی تھیں تب ہی ان سے کچھ فاصلے پر ایک بائیک آ کر رکی۔ اس پر ایک لڑکا، لڑکی سوار تھے۔ لڑکے سے تو وہ دونوں انجان تھیں مگر لڑکی روبینہ تھی۔ مریم نے تزئین کو ٹہوکا دے کر متوجہ کیا۔

''ارے...... یہ تو روبینہ ہے۔'' وہ خوشگوار حیرت میں گھر کر بولی۔ روبینہ پہلی نظر میں تو پہچانی ہی نہیں جا رہی تھی۔ دوپٹہ

گلے میں ڈالے سن گلاسز بالوں میں اٹکائے وہ ایک الٹراماڈرن لڑکی کے روپ میں آس پاس کھڑے بہت سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ وہ اونچا لمبا ہینڈسم لڑکا بھی کافی اچھا لگ رہا تھا۔

''آؤ ان سے ملتے ہیں۔'' وہ مریم کا ہاتھ تھام کر فوراً ہی دو قدم آگے ہوئی۔ روبینہ نے اسی لمحے ان کی جانب دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے پر عجیب سی گھبراہٹ نمایاں ہوئی۔

''مجھے تزئین نے بتایا تھا تمہاری انگیج منٹ کا...... مبارک ہو روبینہ......'' مریم نے اتنا ہی کہا تھا کہ روبینہ نے اس کی بات کاٹی۔

''یہ کامران توصیف ہیں۔''

اس شخص کی پوری بتیسی باہر نکل آئی جب کہ تزئین نے حیرت سے روبینہ کی جانب دیکھا۔ وہ اس سے کہہ کر آئی تھی کہ وہ کسی اجمل نامی کزن کم منگیتر کے ساتھ باہر جا رہی ہے۔ جب کہ اس کے ساتھ موجود شخص کا نام کامران توصیف تھا اور پھر اس شخص کا انداز بھی عجیب لوفرانہ تھا۔

''تم نے بتایا ہی نہیں روبی کہ تم انگیجڈ ہو...... بہر حال مبارک ہو یار! اب ان دونوں کا انٹروڈکشن بھی تو کرواؤ۔''

وہ للچائے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔ مریم تو مریم، تزئین بھی کچھ حیرانی کے عالم میں اسے تکنے لگی۔

''یہاں ایک بہت اچھا ریسٹورنٹ ہے آیئے آپ کو کولڈ ڈرنک پلواتا ہوں روبینہ کی انگیج منٹ کی خوشی کو کہیں بیٹھ کر سیلیبریٹ کرتے ہیں۔'' وہ حقیقتاً لسوڑا تھا۔ مریم اور تزئین معذرت کرتے آگے بڑھ گئیں جب کہ روبینہ نے انہیں روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

''مریم! روبینہ جھوٹ بول رہی تھی؟'' تزئین نے ناسمجھی کے انداز میں پوچھا۔ مریم خود سمجھ نہیں پائی کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ اس نے جس لڑکے کو ایک آدھ بار گیسٹ روم میں روبینہ کے ساتھ دیکھا تھا وہ یہ لڑکا نہیں تھا جب کہ روبینہ نے تزئین کو بتایا تھا کہ اس کا صرف ایک ہی کزن اس سے ملنے آتا ہے۔

وہ دونوں عجب شش و پنج میں گھری واپس ہاسٹل آ گئی تھیں۔

''وہ میرا دوست ہے یار! اچھا شخص ہے۔ فرینڈلی اور کیئرنگ......'' رات کو واپس آ کر روبینہ نے تزئین کے ایک بار پوچھنے پر بہت آرام سے تسلیم کر لیا تھا۔ اس کا انداز اتنا دوٹوک تھا کہ مریم اور تزئین کو مزید کچھ پوچھنے کی جرأت ہی نہیں ہوئی۔

''مریم! تم کامران کو بہت پسند آئی ہو۔ وہ تم سے دوستی کرنا چاہتا ہے۔'' تزئین کے کمرے سے نکل جانے کے بعد روبینہ نے اسے اطلاع دی۔

''یار! ہی از ویری رچ...... بہت دیالو بندہ ہے۔ ایسے دوست قسمت والوں کو ملتے ہیں۔''

وہ مریم کے چہرے کی جانب دیکھے بغیر اپنا ہی راگ الاپ رہی تھی جب کہ مریم کا غصہ انتہا کو پہنچنے لگا۔ یہ روبینہ اس روبینہ سے کس قدر مختلف تھی جو اسے پہلے دن کلاس میں ملی تھی اور جسے تزئین پرنسز آف چک جھمرہ کہا کرتی تھی۔

''میں یہاں دوستیاں کرنے نہیں آئی۔ مجھے تو معاف ہی رکھو۔''

وہ ناک چڑھا کر کہتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ روبینہ نے کندھے اچکا کر اپنی مخصوص الماری میں منہ گھسا لیا۔



''میں ماہین ہوں...... میرے فرینڈز مجھے ماہی کہتے ہیں۔'' اس کے ساتھ بیٹھی اس خوبصورت سی لڑکی نے مسکراتے

ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ مریم ایک ہفتے کی چھٹیاں گزارنے کے بعد بھائی پھیرو سے واپس لاہور جا رہی تھی۔ وہ جب کوچ میں سوار ہوئی تو ماہین نامی یہ لڑکی پہلے سے کوچ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی اس لیے مریم سہولت سے اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ حیدر تسلی کر کے ہی کوچ سے اترا تھا کہ اسے کسی خاتون کے ساتھ جگہ ملی ہے ورنہ بعض اوقات کوچ والے اس بات کا دھیان نہیں رکھتے تھے۔ کوچ اسٹارٹ ہوئی تو اس لڑکی نے اپنا تعارف کروایا۔

اعلیٰ تراش خراش کے ڈریس میں ملبوس نفیس سے میک اَپ کے ساتھ وہ کوچ میں بیٹھی ہوئی باقی سب خواتین سے بے حد مختلف لگ رہی تھی۔ اس نے باقی خواتین کی طرح دوپٹہ سر پر اوڑھنے کے بجائے کندھوں پر پھیلا رکھا تھا کوچ میں سفر کرتے ہوئے مریم کو عام طور سے بہت سی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر آج ان کی سیٹ کی طرف کچھ زیادہ ہی نگاہیں اٹھ رہی تھیں۔

''میں مریم ہوں اور میرے فرینڈز مجھے مریم ہی کہتے ہیں۔''

مریم نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''نائس ٹو میٹ یو مریم...... لاہور جا رہی ہو؟'' ماہین نے بے تکلف ہونے میں پہل کی۔

''ہاں۔'' مریم نے اختصار سے جواب دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ خود سے ماہین سے کوئی سوال کرتی وہ خود ہی بولنے لگی۔

''میں بھی لاہور جا رہی ہوں...... اِن فیکٹ میں لاہور ہی کی رہنے والی ہوں۔ یہاں ساہیوال اپنے ننھیال آئی ہوئی تھی۔ مجھے تو کوچ میں سفر کرنے سے وحشت ہوتی ہے۔ پہلے ماموں کا ڈرائیور مجھے چھوڑنے کے لیے آنے والا تھا مگر ماموں کے کسی فرینڈ کی ڈیتھ ہوگئی۔ سب لوگوں کو وہاں جانا پڑا۔ میں نے سوچا اب ڈرائیور کے فارغ ہونے کا انتظار کون کرے اس لیے مجبوراً کوچ سے آنا پڑا۔''

وہ کافی تفصیل سے بات کرنے کی عادی معلوم ہوتی تھی۔

''تم لاہور میں کہاں رہتی ہو؟'' اس نے مریم کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہاسٹل میں پڑھتی ہوں۔''

''ویری گڈ...... تعلیم ضرور مکمل کرنی چاہیے۔ تم کیا پڑھتی ہو۔ میں نے لاہور کالج سے گریجویشن کیا ہے اس کے بعد میں نے این سی اے سے کچھ آرٹ کورسز بھی کیے۔ آج کل اپنے ایک فرینڈ کے ساتھ اس کے فادر کی فرم میں کام کر رہی ہوں۔ میں تو کہتی ہوں سب لڑکیوں کو جاب کرنی چاہیے۔ اس دور میں سب لوگوں کا انڈیپنڈنٹ ہونا بہت ضروری ہے۔''

وہ خود ہی سوال کر رہی تھی اور خود ہی جواب بھی دیتی جا رہی تھی۔

''ان فیکٹ ہماری فرم ابھی بہت وسیع پیمانے پر کام نہیں کر رہی۔ خرم بہت ہارڈ ورکنگ اور ٹیلنٹڈ ہے۔ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہے اسے پورا کر کے ہی چھوڑتا ہے، اس لیے میں بہت ہوپ فُل ہوں کہ ہم جلد بہت آگے آ جائیں گے۔ ویسے بھی میں تو کام کے سلسلے میں آج کل کچھ غیر سنجیدہ ہوتی جا رہی ہوں۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے رکی۔ اپنے پرس میں سے ایک ننھا سا آئینہ اور لپ اسٹک نکال کر میک اَپ درست کرنے لگی۔ مریم کو از حد کوفت ہوئی۔ اس کا پالا ایک عجیب و غریب ''چیز'' سے پڑا تھا۔

''یار سچ بتاؤں...... نیکسٹ ایئر میری شادی ہو جائے گی پھر مجھے لندن چلے جانا ہے۔ ثوبان وہاں ہوتا ہے نا۔ میں تب تک ہی جاب کر پاؤں گی جب تک وہ آ نہیں جاتا۔ اس کے بعد کیا کرنا ہے یہ میں لندن جا کر ڈیسائیڈ کروں گی۔ سنا ہے وہاں

پہ کام کرنا بہت ضروری ہے ورنہ گزارا نہیں ہوتا۔ خیر جو کام کل ہونا ہے اس کے بارے میں فکر مند بھی کل ہی ہونا چاہیے۔ تم بتاؤ تمہاری انگیج منٹ وغیرہ ہوئی ہے ابھی تک یا نہیں۔ ویسے اتنی کیوٹ لگ رہی ہو آئی ایم شیور تم بھی۔ ''بک'' ہو چکی ہو گی۔''

وہ پھر سے شروع ہو چکی تھی۔ مریم بس ''ہوں، ہاں'' کرتے ہوئے اسے سنے چلی جا رہی تھی۔

''تمہارا تعلق بھائی پھیرو سے ہے نا تم وہیں سے کوچ میں بیٹھی تھیں نا، کیسا شہر ہے یہ؟ ساہیوال تو قسم سے بہت ہی بورنگ جگہ ہے۔ اتنی ڈل لائف ہے وہاں کی۔ میں تو اُکتا جاتی ہوں مگر میرے ننھیال والے سمجھتے ہی نہیں اصرار کیے جائیں گے کہ آؤ آؤ اس لیے مجبوراً مجھے جانا پڑتا ہے۔ ویسے سب کزنز مجھے پیار بہت کرتے ہیں خصوصاً اطہر وہ میرا ہم عمر ہے۔ آئی ٹی میں ماسٹرز کر رہا ہے۔ طارق بھی اسی کا کلاس فیلو ہے۔''

وہ پروفیشن سے فیملی ریلیشن شپس تک آ گئی تھی۔ مریم نے اُکتا کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کے بولنے کے چانسز بہت ہی کم ہیں۔ لاہور کے قریب پہنچنے تک وہ اپنے آدھے خاندان کا غائبانہ تعارف کروا چکی تھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس کی ساری گفتگو میں ماں باپ کے علاوہ سب رشتہ داروں کا چیدہ چیدہ ذکر آ چکا تھا۔ اسی دوران اس کے موبائل کی بپ بجنے لگی۔

''اوہ...... ثوبان کی کال ہے۔'' اس نے پرس میں سے موبائل نکال کر CLI پر نمبر چیک کر کے خوشی سے کہا۔ اگلے پندرہ منٹ تک وہ ثوبان سے باتیں کرتی رہی۔

''آئی مس یو ثوبان۔'' خدا حافظ کہنے سے پہلے اس نے موبائل کے ماؤتھ پیس کو ہونٹوں سے لگا کر کہا۔

''لاحول ولاقوۃ۔'' مریم بھری کوچ میں اس حرکت پر شرمندگی سے جز بز ہوتے ہوئے بڑبڑائی۔

''ثوبان کی جان ہے مجھ میں...... بہت محبت کرتا ہے مجھ سے۔''

ماہین نے مریم کی معلومات میں اضافہ کیا۔

مریم کو اس ''ثوبان نامہ'' سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر ماہین نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات سے قطع نظر اسے ثوبان قدوائی کے متعلق بتانا شروع کر دیا تھا۔ بات ابھی ثوبان کے پسندیدہ ٹوتھ پیسٹ تک پہنچی تھی کہ موبائل پر پھر سے بپ بجی۔

''ارے سفیر کا میسج ہے۔ ایک تو میں اس لڑکے سے بھی بہت تنگ ہوں ہر دو گھنٹے بعد مجھے ایس ایم ایس کرنے کا شوق ہے اسے۔''

ماہین نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا۔ وہ میسج چیک کرنے کے بعد خود بھی کچھ دیر تک موبائل کے بٹن پش کرتی رہی۔

''وہ کہتا ہے کہ وہ مجھے مس کر رہا ہے اور اسے یقین ہے کہ آج میں بہت اچھی لگ رہی ہوں۔''

ماہین نے اپنا موبائل دوبارہ سے پرس میں رکھتے ہوئے کہا۔

''سفیر تمہارا بھائی ہے؟'' مریم نے اس کے چہرے پر پھیلی مسرت کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اوہ کم آن مریم! آئی ہیٹ مائی برد (برادر) سفیر از مائی فرینڈ۔'' وہ کوفت سے بولی۔

''بلے بھئی بلے۔ سفیر اِز جسٹ اے فرینڈ۔'' مریم نے حیرت سے گھر کر سوچا۔

''میری اور میرے بھائی کی آپس میں کبھی نہیں بنی۔ اسے میری ہر بات پر اعتراض کرنے کی عادت ہے۔ حالانکہ چار سال چھوٹا ہے مجھ سے مگر باتیں ایسے کرتا ہے جیسے چودہ سال بڑا ہو یہ مت کرو...... وہاں کیوں جاتی ہو...... اس سے کیوں ملتی

ہے...... لیٹ کیوں آئی۔ فلاں کے ساتھ ریسٹورنٹ میں کیوں تھی۔ فلاں کے ساتھ گاڑی میں کیوں تھی۔ بس اس لیے اچھا نہیں لگتا مجھے حالانکہ میں نے کبھی اس کی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا۔ اس کی کتنی گرل فرینڈز ہیں وہ نیٹ پر کون کون سی ویب سائٹس کو وزٹ کرتا ہے۔ پاکٹ منی کے علاوہ اس کے پاس روپے کہاں سے آتے ہیں۔ اسموکنگ بھی کرتا ہے۔ میں یہ سب باتیں جانتی ہوں مگر میں نے کبھی اس کی شکایت نہیں لگائی جب کہ وہ تو ہمہ وقت میری شکایت لگانے کو بے تاب رہتا ہے۔ ممی نے طے کیا تھا اسے آسٹریلیا بھجوادیں مگر ابھی اس کا آئی ڈی کارڈ ہی نہیں بنا ان فیکٹ وہ بنوانا ہی نہیں چاہتا، حالانکہ اس منتھ کی ٹیلتھ کو پورا اٹھارہ سال کا ہو چکا ہے۔ پاپا کی فیور بھی اس کے ساتھ ہے نا۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے رکی۔ اس بار اس کی خاموشی عجیب سی تھی۔ افسردہ سی، تاسف بھری۔ شاید وہ کچھ مزید وقت اسی خاموشی میں گزار دیتی مگر موبائل کی بپ نے پھر اسے الرٹ کر دیا تھا۔

''سفیر نے دوبارہ ایس ایم ایس کیا ہے۔'' وہ ایک بار پھر موبائل چیک کرتے ہوئے اونچی آواز میں مریم کو مطلع کر رہی تھی۔

مریم اب بالکل ہی لاتعلق ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ ویسے بھی تھوڑا سا سفر ہی باقی رہ گیا تھا۔ اس نے ماہین عرف ماہی کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالنا شروع کر دیا۔ کچھ سفر ماہین کے رشتہ داروں کے تعارف میں گزرا تھا کچھ اس کے ''فرینڈز'' کے تعارف میں گزر گیا۔

''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ تم میرے گھر ضرور آنا۔ میرا بھائی تم سے مل کر بہت خوش ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لڑکوں کی ہمت ہے کہ وہ مجھ جیسی دوست برداشت کر لیتے ہیں ورنہ کوئی لڑکی تو کبھی میری دوست بننے پر تیار نہ ہو۔ اب میں اسے جا کر بتاؤں گی میں نے ایک بہت اچھی لڑکی کو دوست بنایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حیران ہو جائے گا۔''

اس کی مطلوبہ جگہ پر پہنچ کر ماہین نے کہا تھا۔ یہ آخری بات تھی۔ جو مریم نے سنی۔ وہ اسے خدا حافظ کہے بنا کوچ سے اتر گئی تھی۔



''السلام علیکم...... کیسی ہیں آپ سسٹر؟'' ڈاکٹر عادل ایک دم اس کے سامنے آئے۔ یہ ان کی بہت اچھی عادت تھی کہ وہ سلام میں ہمیشہ پہل کرتے تھے۔ جب کہ مریم تو انہیں دیکھتے ہی راستہ بدل لینے کی عادی تھی۔ اب بھی ان کے سلام کے جواب میں اس نے چہرے پر رسمی سی مسکراہٹ سجا کر ''وعلیکم السلام'' کہا اور آگے کی سمت بڑھ گئی۔ ڈاکٹر عادل کا آج کل کسی نئی میڈیکل آفیسر کے ساتھ زبردست افیئر چل رہا تھا اور نگہت کے پاس اس افیئر کی لمحہ بہ لمحہ رپورٹ ہوتی تھی۔ جس طرح وہ تفصیل سے مریم کو یہ سب بتاتی تھی اس سے تو ایسا لگتا تھا جیسے ڈاکٹر عادل کا افیئر خود اس کے ساتھ چل رہا ہے۔ مریم، ڈاکٹر عادل کو نظر انداز کرتے ہوئے سرجن مرتضیٰ کے کیبن کی سمت چل دی۔ کیبن کے قریب پہنچ کر اس نے گہری سانس بھری اور پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ خنکی کا ایک لطیف احساس اس کے رگ و پے میں اتر آیا۔ کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا مگر کھڑکیاں کھلی تھیں جن سے ٹھنڈی ہوا سبک سبک قدم اٹھاتی اندر آرہی تھی۔ موسم کچھ ابر آلود ہو چلا تھا۔ اسے وہاں بیٹھے ابھی پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک نسوانی ہنسی کی مترنم آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ اس نے حیرانی سے چہار جانب دیکھا مگر کمرے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ابھی وہ اس ہنسی کو اپنا وہم سمجھ کر ذہن سے جھٹکنے ہی والی تھی کہ ایک بار پھر وہی ہنسی سنائی دی۔ چند لمحوں بعد ریٹائرنگ روم کا دروازہ کھلا اور سرجن مرتضیٰ باہر آئے گرے ڈریس پینٹ کے ساتھ لائٹ میرون

رنگ کی شرٹ پہنے اپنے اونچے لمبے سراپے کے ساتھ وہ بہت جچ رہے تھے۔ بلاشبہ وہ نہایت شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ سرجن تھے مگر کسی بھی ڈاکٹر سے کم عمر دکھائی دیتے تھے۔

''السلام علیکم سر! کیسے ہیں آپ؟'' مریم نے مسکرا کر اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے انہیں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام...... الحمدللہ خیریت سے ہوں اور آپ؟'' وہ اپنے مخصوص شفیق سے انداز میں دریافت کرنے لگے۔ پیرا میڈیکل اسٹاف سے لے کر آرتھوپیڈیک وارڈ کے تمام چھوٹے بڑے ڈاکٹرز ان کے رعب میں تھے مگر یہ رعب و دبدبہ کبھی ان کے لہجے پر حاوی نہیں ہوا تھا۔

''ڈاکٹر نائلہ نے عباس رضوی کی فائل بھجوائی ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ عباس صاحب کی ڈسچارج شیٹ پر سائن کر دیجیے۔''

اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل کو ان کی میز پر رکھتے ہوئے ڈاکٹر نائلہ کا پیغام دیا۔ جب سے اختر کو ڈانٹ پڑی تھی سب ہی لوگ محتاط ہو گئے تھے۔

''اتنی جلدی میں کیوں ہیں مریم! اطمینان سے بیٹھ کر بات کیجیے۔''

سرجن مرتضیٰ نے ریوالونگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ تو گئی مگر ریٹائرنگ روم کے اَدھ کھلے دروازے سے نظریں ہٹا نہیں پائی تھی۔ اس نے واضح طور پر سفید کپڑوں میں ملبوس کسی لڑکی کی جھلک دیکھی تھی۔

سرجن مرتضیٰ نے عباس رضوی کی فائل چیک کرنا شروع کر دی تھی جو بے حد تسلی بخش تھی۔

''مریم!'' سرجن مرتضیٰ نے میز کی سطح کو انگلی سے بجا کر اسے متوجہ کیا۔ اس کا سارا دھیان ریٹائرنگ روم کی جانب تھا۔

''آر یو اوکے......؟'' وہ اپنے مشفق انداز میں پوچھنے لگے۔

''وہ...... وہاں کوئی ہے۔'' اس نے عجب بے یقینی میں گھر کر کہا۔ کیونکہ سرجن مرتضیٰ اس بات کو مائنڈ بھی کر سکتے تھے۔

''وہ نگہت ہے...... میرے ریٹائرنگ روم کا کارپٹ بہت گرد آلود ہو رہا تھا۔ وہ کارپٹ صاف کر رہی ہے۔''

سرجن مرتضیٰ نے مریم کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے وضاحت دی۔

''نگہت...... نگہت...... بس کرو بھئی بہت ہو چکی ڈسٹنگ باہر آؤ۔'' انہوں نے آواز دے کر اسے باہر بلایا۔

نگہت باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں سچ مچ جھاڑو تھی۔ وہ ویکیوم سے صفائی کرنے کے بجائے جھاڑو سے صفائی کر رہی تھی۔

''سرجن مرتضیٰ نے کبھی کسی خاکروب سے اپنے کمرے کی صفائی نہیں کروائی کیونکہ انہیں تو روم میں نماز بھی پڑھنی ہوتی ہے اور ان کے روم میں قرآن کریم بھی رکھا ہے اس لیے یہاں کی صفائی ہمیشہ میں کرتی ہوں۔''

مریم کے استفسار کی نوبت بھی نہیں آئی تھی اور نگہت خود ہی صفائی دینا شروع ہو گئی تھی۔ مریم نے دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا۔

سرجن مرتضیٰ نے فائل پر سائن کیے تو وہ ڈاکٹر نائلہ کے کیبن کی طرف چلی آئی۔ ریسپشن کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر عادل کو تزئین کے پاس کھڑے دیکھا۔ اس نے نگہت کے علاوہ ڈاکٹر عادل کے بارے میں کبھی کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی، بلکہ نگہت سے بھی دو ایک بار ہی بات ہوئی تھی اور ان دو ایک بار کی بات نے ہی مریم کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ روبینہ سے مریم کی ایسی خاصی دوستی نہیں تھی مگر تزئین کو سمجھانا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی۔ اس نے سوچا تھا ہاسٹل

جا کر تزئین سے تفصیلی بات کرلے گی مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ ہاسٹل واپس پہنچی تو تزئین الماری میں منہ گھسائے نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ وہ مریم سے کچھ دیر پہلے ہی ہاسٹل واپس آئی تھی۔

"کیا کر رہی ہو؟" مریم نے بستر پر بیٹھ کر جوتے کے تسمے کھولتے ہوئے سرسری لہجے میں دریافت کیا۔ تزئین کو شاید مریم کی کمرے میں آمد کے بارے میں پتا نہیں چلا تھا اس لیے وہ کچھ چونک سی گئی۔

"یار! میں گھر جا رہی ہوں امی کا فون آیا تھا وہ مجھے بلا رہی ہیں۔" تزئین نے لمحہ بھر کے لیے الماری میں سے منہ نکال کر جواب دیا۔

"خیریت؟" تزئین کے گھر سے ایسے بلاوا آنا کچھ اچنبھے کی بات تھی۔

"میں نے خود فون ریسیو نہیں کیا۔ ریسپشن پہ شبیر بھائی تھے۔ انہوں نے پیغام نوٹ کر لیا تھا۔ مجھے بس یہی پتا چلا کہ وہ مجھے یاد فرما رہی ہیں۔"

وہ خاصے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ جب سے اس کی امی نے اس کی بڑی بہن کی زبردستی شادی کی تھی۔ ان کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں طنز نمایاں ہوتا تھا۔

مریم اس کے ساتھ مل کر پیکنگ میں مدد کرنے لگی۔ اس کے چلے جانے کے بعد مریم نے یونیفارم تبدیل کیا اور کمرے میں بکھرا ہوا پھیلاوا سمیٹنے لگی۔ تزئین جا چکی تھی اور روبینہ سے یہ توقع رکھنا ہی فضول تھا کہ وہ کمرے کی صفائی وغیرہ جیسے کسی کام کو ہاتھ لگائے گی۔ مریم نے پہلے اپنا بستر درست کیا پھر تزئین کے بستر کی طرف آ گئی۔ اس کو ٹھیک کرنے کے بعد روبینہ کا بیڈ کو درست کیا، تکیے کی پوزیشن درست کرتے ہوئے اسے ایک چمکیلی سی چیز نظر آئی۔ روبینہ کو اپنی رسٹ واچ تکیے کے نیچے رکھ کر سونے کی عادت تھی اسی لیے وہ اکثر اوقات اپنی رسٹ واچ نکالنا ہی بھول جاتی تھی۔ مریم نے اس رسٹ واچ کو ہاتھ میں تھام لیا۔ اس قدر قیمتی رسٹ واچ کا روبینہ کے پاس ہونا کوئی حیران کن بات نہیں تھی۔ اس کے پاس اب ایسی بہت سی قیمتی اشیاء کا انبار رہنے لگا تھا اس کا حلقہ احباب بے حد وسیع تھا اور اسے ایسے شاندار گفٹس ملتے ہی رہتے تھے۔

مریم اس رسٹ واچ کو بے حد قیمتی خیال کرتے ہوئے میز پر رکھنے سے ہچکچا رہی تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر روبینہ کی الماری کا دروازہ کھول لیا۔ رسٹ واچ رکھتے ہوئے اس کی نگاہ ایک چھوٹے سے پیکٹ پر پڑی۔ وہ اتنی احتیاط سے چھپا کر کپڑوں کی تہہ کے نیچے رکھا گیا تھا کہ مریم تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود کو اس پیکٹ کو دیکھنے سے روک نہیں پائی۔ اس پیکٹ کے اندر موجود چیز کو دیکھ کر مریم کو بے حد شاک لگا۔

وہ "مخصوص گولیاں" تھیں جو آدھی استعمال کی جا چکی تھیں۔ ایک غیر شادی شدہ لڑکی کی الماری میں ان کی موجودگی نے مریم کے حواس گم کر دیئے تھے۔

"کیا نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے؟" اس نے انتہائی تاسف میں گھر کر خود سے کہا۔ خود تزئین نے روبینہ کی منگنی والے جھوٹ کے بعد اسے بار ہا نصیحت کرنے کی کوشش کی مگر روبینہ اس قدر خود سر ہو چکی تھی کہ اب نصیحتیں اس پر اثر نہیں کرتی تھیں۔ مریم اس سے کچھ بھی کہہ کر اپنے ہاتھوں اپنی ذلت کا سامان نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے وہ گولیاں دوبارہ...... اسی جگہ رکھ دیں اور الماری کو پہلے کی طرح بند کر دیا۔

"روبینہ بری لڑکی نہیں تھی۔ بدقسمتی سے اس کی دوستی بری لڑکیوں سے ہو گئی۔ اس کے گھر کے حالات بھی کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ وہ سہیلیوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر ساری حدیں پار کرتی چلی گئی۔"

تزئین کی واپسی پر جب مریم نے اسے اشاروں کنایوں میں یہ سب بتانے کی کوشش کی تو وہ بولی۔ اس کے انداز میں حیرانی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

"تم یہ سب باتیں پہلے سے جانتی تھیں؟" مریم نے مشکوک لہجے میں پوچھا تو تزئین نظریں چرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"ہم روبینہ کو سمجھا سکتے ہیں تزئین!" مریم نے موہوم سی امید میں گھر کر کہا۔

"کس کس کو سمجھاؤ گی اور پھر تمہاری بات سمجھے گا کون؟" تزئین نے دھیمے لہجے میں کہا۔ مریم ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"کیا تزئین بھی روبینہ کی طرح۔" اس سے زیادہ اس کا ذہن کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا۔ تزئین خاموشی سے اپنے بستر پر منہ لپیٹ کر پڑ گئی۔ تزئین کا انداز بہت حوصلہ شکن تھا۔ وہ جب سے گھر سے واپس آئی تھی عجب کشمکش کا شکار تھی ان کے پہلے سال کے امتحان بھی ہونے والے تھے۔ مریم ہر خیال کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے کتابوں میں خود کو گم کرنے کی سعی کرنے لگی۔

اگلے بہت سے دن امتحانات کی نذر ہو گئے۔ بہترین پرسنٹیج کے ساتھ مریم سیکنڈ ایئر میں پروموٹ کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ تزئین، روبینہ ریٹا، لیزا، ستارہ وغیرہ بھی پروموٹ ہو کر پارٹ ٹو میں آئی تھیں، حالانکہ بہت سی لڑکیاں پڑھائی اور کلاسز کے معاملے میں ریگولر نہیں تھیں اور یہی بات مریم کے لیے اچنبھے کا باعث تھی کہ جن لڑکیوں کے بارے میں قیاس کیا جاتا تھا کہ وہ ڈس کوالیفائی کر دی جائیں گی وہ اتنے اچھے مارجن سے پاس کیسے ہو گئیں۔

سال دوم ابتداء سے ہی مشکل تھا۔ کورس میں جہاں میڈیسن، سرجری اور اخلاقیات کے مضامین کا اضافہ ہوا، وہاں وارڈ شفٹس کا دورانیہ بھی بڑھ گیا تھا، سرخ Sash اور سفید دوپٹے کے ساتھ مریم خود کو پہلے سے زیادہ پُر اعتماد اور ذمہ دار محسوس کرتی تھی۔ سیکنڈ ایئر کی کلاسز شروع ہوتے ہی روبینہ نے اپنا روم تبدیل کر لیا تھا، اس لیے مریم نے بھی سکون کا سانس لیا کیونکہ روبینہ کی موجودگی اسے الجھن میں مبتلا کرنے لگی تھی۔ دوسری طرف تزئین بھی پہلے کی نسبت کافی ذمہ دار ہوتی جا رہی تھی۔ ہر وقت امیر ہونے کے خواب دیکھنے کے بجائے وہ اب زیادہ تر خاموش رہنے لگی تھی۔



اس روز اس کی ڈیوٹی ای این ٹی وارڈ میں تھی۔ شدید سردی کی لہر نے پورے شہر کو ناک کان اور گلے کے امراض میں مبتلا کر دیا تھا۔ جس روز مریم کی شفٹ تھی، اسی روز تھائی لینڈ سے آئے ہوئے جونیئر ڈاکٹرز کی ایک ٹیم نے بھی فری کیمپ لگا رکھا تھا، اس وجہ سے بھی آؤٹ ڈور مریضوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ مریم کی شفٹ دو سے آٹھ بجے والی تھی۔ لنچ آورز کے بعد ایک چھ سال کے بچے کی ناک کی ہڈی کی میجر سرجری تھی۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد سا آپریشن تھا جس میں کل ملا کر چھ جونیئر اور سینئر سرجن اپنی اپنی مہارت کا مظاہرہ کرنے والے تھے۔ مریم اس آپریشن کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی کیونکہ اس کی ڈیوٹی او۔ٹی کی بجائے وارڈ میں تھی، مگر اس آپریشن کی وجہ سے ای این ٹی وارڈ کا سارا عملہ ہی متحرک تھا۔ سب لوگ عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ الرٹ نظر آ رہے تھے اور مریم بھی ان سب میں شامل تھی۔

لنچ آورز کے بعد چائے کا دور چل رہا تھا اور وہ ریسپشن پر شبیر بھائی اور شائستہ کے پاس آ گئی۔ ان دونوں سے اس کی کافی اچھی علیک سلیک تھی۔ آیا اماں نے ابھی ان کے سامنے چائے کے کپ رکھے تھے کہ سرجن داؤد آتے دکھائی دیئے۔

"سسٹر! ڈاکٹر عادل کا نمبر ملایئے۔" انہوں نے ثروت کی طرف دیکھ کر عجلت سے کہا تھا۔ ثروت ٹیلی فون سیٹ سے

چکی بیٹھی تھی۔

''ڈاکٹر عادل از ناٹ آن ڈیوٹی سر!'' ثروت نے نمبر ملانے کے بعد بتایا تھا۔

''ہاں میں جانتا ہوں اس کا آج آف ہے مگر پیشنٹ اس کے کسی دوست کا بیٹا ہے اور میں نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ وارڈ کا وزٹ ضرور کرلے وہاں بلڈ بینک میں او نیگیٹو نہیں ہے اور یہاں بچے کی ماں نے واویلا مچا رکھا ہے عادل ہی سنبھال سکتا ہے ان لوگوں کو، آپ پلیز عادل کے سیل کا نمبر ملائیے۔''

سرجن داؤد نے اُکتا کر کہا۔ وہ اس وارڈ کے جونیئر موسٹ سرجن تھے۔

''مجھے ایک گلاس پانی دیجیے۔'' سرجن داؤد نے مریم سے کہا۔ مریم نے فوراً گلاس میں پانی انڈیل کر انہیں تھمایا۔

''ڈاکٹر عادل از ناٹ ریسپانڈنگ سر۔'' ثروت نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ سرجن داؤد کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔ انہیں ڈاکٹر عادل کی غیر ذمہ داری پہ غصہ آرہا تھا۔ مریم ان کے چہرے کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر ہونٹ بھینچتے ہوئے انہوں نے شہادت کی انگلی سے اپنی کنپٹی کو چھوا، جیسے کسی فیصلے پر پہنچ چکے ہوں۔

''ڈاکٹر شیریں جبار کا نمبر ملائیے۔'' انہوں نے ایک مشہور گائناکولوجسٹ کا نام لیا۔ ثروت کے پاس موجود انڈیکس میں ان کا نمبر نہیں تھا۔ ڈاکٹر داؤد نے اپنی جیب سے اپنا سیل فون نکال کر ثروت کو ڈاکٹر شیریں کا نمبر نوٹ کروایا۔

''ڈاکٹر شیریں از آن لائن سر!'' ثروت نے فون ملتے ہی ریسیور ان کو دیا۔

''یس ڈاکٹر! میں سرجن داؤد، ایک پرابلم ہے۔'' وہ لحہ بھر کے لیے دوسری طرف کی بات سننے کے لیے رکے۔

''میری وائف کا بلڈ او نیگیٹو ہے مگر دو ماہ قبل اس کا مس کیریج ہوا تھا اب وہ بالکل نارمل ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کیا میری وائف بلڈ ڈونیٹ کرسکتی ہے۔ آپ کی پیشنٹ ہے، اس لیے پوچھ رہا ہوں۔'' سرجن داؤد نے ایک بار پھر توقف کیا۔

پھر تھوڑی دیر ڈاکٹر شیریں کی بات سننے کے بعد بولے۔

''او کے ڈاکٹر ظاہر ہے، آپ زیادہ بہتر سمجھتی ہیں۔ تھینکس۔'' انہوں نے الجھن بھرے انداز میں فون بند کیا پھر جھنجلا کر بولے۔

''عورتوں کو کوئی بات سمجھانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔''

''سرجن آپ کو O.T میں بلا رہے ہیں۔ صورتِ حال مزید خراب ہو رہی ہے۔'' وارڈ سسٹر ارم نے آکر کہا۔ وہ چند لمحے قبل آپریشن تھیٹر سے نکلی تھی۔

''ڈاکٹر عادل کا نمبر ابھی بھی رسپانس نہیں کر رہا؟'' انہوں نے ثروت سے استفسار کیا۔ ثروت کا جواب نفی میں تھا۔

''او کے...... اب مجھے اپنا کام کرنا ہے...... آپ میرے گھر کا نمبر ملائیے اور میری وائف سے کہیے آئی وانٹ ٹی سی ہر اِن دی ہاسپٹل رائٹ ناؤ۔''

وہ حکمیہ انداز میں کہتے ہوئے آپریشن تھیٹر کی سمت چل دیئے۔ مریم اور ثروت نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

''یار! سرجن داؤد کیسے خبطی آدمی ہیں۔ میں ان کی وائف سے مل چکی ہوں۔ وہ تو خود اتنی ویک ہیں، وہ کیسے بلڈ ڈونیٹ کریں گی۔'' شائستہ اس دوران پہلی مرتبہ بولی۔ مریم کسی بھی رائے کا اظہار کیے بغیر ای این ٹی لیب کی سمت چل دی۔ وہاں

سخاوت پہلے سے کسی کا بلڈ گروپ چیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران ایک اکیس بائیس سال کا لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا رنگ گندمی تھا اور اس کے سیاہ سلکی بال کندھوں تک آرہے تھے۔ میلی سی ٹائٹ جینز کے ساتھ وہ سفید اور سیاہ لائننگ والی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی دائیں کلائی میں لیدر کی موٹی سی بریسلٹ تھی جب کہ بائیں کلائی میں قیمتی سنہری ڈائل والی رسٹ واچ تھی۔ اس شاندار قد کاٹھ والے لڑکے کی شخصیت کی سب سے مضحکہ خیز چیز اس کے نچلے ہونٹ اور ٹھوڑی کے عین درمیان میں موجود بالوں کا وہ ننھا سا گچھا تھا جسے داڑھی کہنا داڑھی کی توہین تھی۔

''ہائے...... میں سمیع مرتضیٰ ہوں...... مجھے عادل بھائی نے بھیجا ہے۔'' اس نے مریم کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

○......❖......○

''تم میری بات غور سے کیوں نہیں سن رہیں؟'' مریم نے چائے کا خالی مگ گھاس پر رکھتے ہوئے مصنوعی غصے سے سوال کیا۔ تزئین جواب دینے کے بجائے مسلسل گھاس نوچنے میں مصروف رہی۔ فضا میں ٹھیک ٹھاک خنکی تھی مگر تزئین کے اصرار پر وہ چائے پینے کے لیے لان میں آ بیٹھی تھی۔ ساڑھے دس کے قریب کا ٹائم تھا مگر گھاس ابھی سے شبنمی ہو رہی تھی۔ مریم نے اونی شال اوڑھ رکھی تھی مگر تزئین کاٹن کا سوٹ پہنے، دوپٹے کو ایک کندھے پر ڈالے دنیا جہان سے بے خبر گھاس کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

''تم میری بات سن بھی رہی تھیں یا نہیں۔'' مریم اب کی بار منہ پھلا کر بولی۔ کبھی کبھی اسے تزئین کی اس مست ملنگ حالت پر تشویش ہونے لگتی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ دن کے بارہ گھنٹے اسی حالت میں گزارتی تھی مگر کبھی کبھی اچانک اس پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ وہ اردگرد سے بالکل ہی بے نیاز ہو جاتی، ایسے میں مریم کو اسے اس کی اصل حالت میں واپس لانے کے لیے بہت جتن کرنا پڑتے۔ مریم نے دو ایک بار اس سے پوچھا تھا کہ وہ کیوں پریشان ہے، مگر اس نے ہنس کر بات ٹال دی پھر مریم نے بھی مزید کرید نا مناسب نہیں سمجھا۔

''اے بی بی! کہاں گم ہو؟'' وہ اس کے جھکے سر پر چپت رسید کرتے ہوئے بولی۔

''میں یہیں ہوں اور تمہاری ہی بات سن رہی ہوں۔ تم یہ کہہ رہی تھیں کہ......'' تزئین کو مریم کی بتائی ہوئی بات کا اصل متن یاد کرنے میں کچھ توقف کرنا پڑا۔

''ہاں، تم یہ کہہ رہی تھیں کہ سرجن داؤد بہت اچھے ہیں۔ وہ دراصل انسانی روپ میں فرشتہ ہیں اور تم ان کے جذبہ ایثار سے بہت متاثر ہوئی ہو۔''

''جی نہیں...... بات فرشتے کی دریافت سے بہت آگے نکل گئی تھی۔ میں تمہیں یہ بتا رہی تھی کہ......''

''مجھے یاد ہے مریم! تم یہ بتا رہی تھیں کہ تمہارا بھی دل چاہا کہ اگر تمہارا بلڈ گروپ سیم ہوتا تو تم فوراً سے پیشتر بلڈ ڈونیٹ کر دیتیں۔'' تزئین اس کی بات کاٹ کر بولی تو مریم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔

''ہاں بالکل...... قسم سے میرا اتنا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی اس کارِخیر میں حصہ لے سکتی۔ سرجن داؤد کے جذبہ ایثار نے مجھے حقیقتاً بہت متاثر کیا۔'' مریم کے ذہن میں پھر سے ساری کارروائی متحرک ہوئی تھی۔ وہ عام طور سے اتنی تفصیل سے بات کرنے کی عادی نہیں تھی مگر آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ تمام تر جزئیات کے ساتھ تزئین کو ہر بات بتائے۔

''تم سچ مچ پاگل ہو مریم!'' تزئین اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی پھر اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر مزید گویا ہوئی۔

''اس فیلڈ میں جذباتی ہو کر کام کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں ہر روز سینکڑوں ایسے مریض آتے ہیں جنہیں خون کی ضرورت ہوتی ہے تو کیا سب ڈاکٹرز اپنا خون دینا شروع کر دیں یا پھر پیرا میڈیکل اسٹاف اس جہاد میں حصہ لینے لگے۔ میرا ذاتی......''

''تم خاموش رہو تو بہتر ہے اور جس چیز کو تم جذباتیت کہہ رہی ہو نا اس چیز کو میری زبان میں انسانی ہمدردی کہتے ہیں۔''

مریم اس کی بات کاٹ کر بولی۔ تزئین مسکرا دی پھر شرارتی انداز میں اسے دیکھ کر بولی۔

''تم سرجن داؤد سے زیادہ ہی امپریس نہیں ہوتی جا رہیں۔ ان کے خلاف کہی گئی کوئی بھی بات تمہیں اتنی بری لگتی ہے کہ تمہارا چہرا ہی لٹک جاتا ہے۔ خیر تو ہے؟''

''تزئین کی بچی! ڈوب مرو تم...... وہ اتنے بڑے ہیں مجھ سے اور پھر میرڈ بھی ہیں۔ میں ان کی بہت عزت کرتی ہوں۔''

مریم اس کی پشت پر دھپ رسید کرتے ہوئے بولی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی برا آدمی بھی بلڈ ڈونیٹ کرے تو تم اس کی بھی عزت کرنے لگو گی اور عزت کروانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان خون دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔''

تزئین ابھی بھی تنگ کرنے کے موڈ میں تھی مگر اب کی بار مریم مسکرا دی۔

''مجھے ان سب باتوں کا نہیں پتا مگر مجھے ایسے لوگ اچھے لگتے ہیں جو انسانی ہمدردی کے تحت ہی سہی ایثار کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ سمیع مرتضیٰ کی ہی مثال لے لو۔ میں عام حالات میں اس لڑکے کو دیکھتی تو وہ مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا، مگر اس کا یہ عمل مجھے اتنا اچھا لگا کہ وہ لڑکا میری نظر میں خود بخود اچھا ہو گیا۔''

مریم مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ تزئین کو ساری گفتگو میں شاید پہلی بار دلچسپی محسوس ہوئی۔

''اچھا...... انٹرسٹنگ...... بائی داوے سمیع مرتضیٰ میں ایسی کیا برائی تھی کہ وہ تمہیں عام حالات میں اچھا نہ لگتا؟'' تزئین متجسس ہوئی۔

''استغفراللہ...... میں نے یہ نہیں کہا کہ اس لڑکے میں کوئی برائی تھی...... بس مجھے اس طرح کے لڑکے اچھے نہیں لگتے۔ اس لڑکے کا قد کاٹھ تو اچھا تھا۔ رنگ انتہائی گورا۔ کندھوں تک آتے سلکی بال اور سب سے دلچسپ چیز اس کی ٹھوڑی پر موجود داڑھی جیسی کوئی چیز تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے پنسل سے دائرہ بنا دیا ہے۔ پہلے میں سمجھی کہ کسی پرائیویٹ روم کا وزیٹر ہے مگر جب اس نے بتایا کہ وہ بلڈ ڈونیشن کے لیے آیا ہے تو مجھے بہت ہی حیرانی ہوئی۔''

مریم نے لمحہ بھر کا توقف کیا پھر تزئین کی رائے کا انتظار کیے بغیر بولی۔

''ایک مزے کی بات بتاؤں اس کے ہاتھ بالکل لڑکیوں جیسے تھے۔ لمبے اور نازک سے جب میں نے اس کے ہاتھ پر ڈرپ پن وغیرہ سیٹ کی تب ہی دیکھا تھا۔ اس نے انگلیوں میں سنہری اور سیاہ رِنگز پہن رکھے تھے۔ کلائی میں بریسلٹ بھی تھا۔''

مریم بات کرتے کرتے ذرا کی ذرا رکی۔ تحیر سے تزئین کی جانب دیکھا جو ٹکٹکی باندھے مسکراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''تم مجھے گھور کیوں رہی ہو؟'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر سوال کیا۔

تزئین ایک بار پھر مسکرائی۔

''میں تمہیں گھور نہیں رہی، بلکہ بغور تمہاری باتیں سن رہی ہوں۔ تم نے پہلے تو کبھی کسی لڑکے کے بارے میں اتنی تفصیل سے بات نہیں کی۔''

وہ ملائمت سے ہنستے ہوئے بولی۔

''لڑکا؟ وہ بالکل بھی لڑکا نہیں تھا۔ یقین کرو اگر اس کے چہرے پر ٹھوڑی کے اوپر داڑھی کے بقایا جات موجود نہ ہوتے تو میں اسے ''مسٹر سمیع'' کے بجائے ''مس سمیع'' کہہ کر مخاطب کرتی۔''

مریم کے اس طرح کہنے پر تزئین خوب ہنسی۔

''تم نے اس لڑکے کا فون نمبر لیا؟'' وہ ہنستے ہوئے پوچھنے لگے۔

''ارے...... میں کیوں لیتی اس کا فون نمبر۔'' مریم نے اسے گھورا۔

''یار! میرے لیے لے لیتیں۔ میرا کوئی چانس بن جاتا۔'' وہ مصنوعی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولی۔ مریم نے اسے ایک اور دھپ رسید کی۔ تزئین کو اس طرح کی اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کا بہت شوق تھا۔

''اب دوبارہ کہاں ملے گا ایسا اسٹائلش لڑکا! جاؤ مریم تم تو بالکل بھی کام کی لڑکی نہیں ہو۔''

وہ مسلسل بول رہی تھی۔

''ڈاکٹر عادل رحیم کے ریفرنس سے آیا تھا۔ تم ان سے اس لڑکے کا کانٹیکٹ نمبر لے لینا۔''

مریم نے تجویز دی۔

''آہاں...... پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے یار! ان سے تو میں خود ہی لے لوں گی۔''

تزئین مصنوعی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی، مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ مریم ابھی مزید کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اسے پیون اپنی سمت آتا دکھائی دیا۔

''تزئین باجی! تہاڈا فون اے۔'' (تزئین باجی! آپ کا فون ہے) اس نے قریب آ کر اطلاع دی تھی۔

''کس کا ہے؟'' تزئین نے اطمینان سے پوچھا۔

''گوجرانوالہ توں تہاڈی ماں جی دا۔'' (گوجرانوالہ سے آپ کی امی کا)

''انہیں کہہ دو میں ہاسٹل میں نہیں ہوں۔ میری نائٹ شفٹ ہے آج۔'' تزئین نے سابقہ پُرسکون انداز میں کہا۔ پیون کو شاید ایسے احکامات آگے پہنچانے کی بہت پریکٹس تھی، اس لیے وہ خاموشی سے واپس چل دیا جب کہ مریم نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

''ابھی کوئی سوال مت پوچھنا مریم! میں تمہیں اپنے رویے کی وجہ بتا دوں گی۔'' وہ سر جھکائے ہوئے کہہ رہی تھی۔ مریم خاموش کی خاموش رہ گئی۔



''اپنے ہاتھ کو سیدھا کر لیں اور انگلیوں کو پھیلا لیں...... شاباش...... شاباش درد بالکل بھی نہیں ہوتا۔''

کسی نے نرم لہجے میں بہت محبت سے اس کے آس پاس سرگوشی کی تھی۔ اس نے گہری سانس بھر کر اپنا بایاں ہاتھ

نظروں کے سامنے کیا جس کی پشت پر بینڈیج ہوئی تھی۔ وہ عجیب سی نظروں سے اپنے ہاتھ کی پشت کو تک رہا تھا، پھر دھیرے دھیرے وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں اور پشت پر پھیرنے لگا۔ کمرے کے نیم تاریک مگر گرم سے ماحول میں بستر پر چت لیٹا وہ اپنے آپ کو ایک غیر مرئی طاقت کے زیر اثر محسوس ہو رہا تھا، ایک میٹھا سا لمس ابھی بھی اس کے ہاتھ کی پشت پر تھا۔

سفید دوپٹے کے ہالے میں چھپا وہ چاند چہرہ، چھیڑ چھاڑ کرتی براؤن زلفیں پھر اس کا وہ اپنائیت بھرا انداز، نہایت نفاست اور محبت سے ڈرپ پن سیٹ کرنا، اسے ننھا سا بچہ سمجھتے ہوئے محبت بھری تلقین کرنا۔ سمیع تب سے اب تک کچھ بھی بھلا نہیں پا رہا تھا، حالانکہ ہاسپٹل سے واپس آئے ہوئے اسے کئی گھنٹے ہو چلے تھے۔

وہ روٹین کے مطابق پاپا سے ملنے آیا تھا۔ پاپا اپنے کیبن میں موجود نہیں تھے۔ وہ اپنی پرسنل ڈائری پاپا کی میز پر رکھ کر عادل بھائی سے ملنے چلا آیا۔ عادل بھائی اس کے پاپا کے کولیگ تھے اور اس سے بہت محبت سے ملتے تھے، حالانکہ پاپا نے اسے منع کیا تھا کہ وہ ان سے زیادہ نہ ملا کرے۔ پاپا، عادل بھائی کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے، مگر پھر بھی وہ ان کی نصیحت کو نظر انداز کرتے ہوئے اکثر و بیشتر عادل بھائی سے مل لیتا تھا۔ وہ اس کی ممی کے کزن بھی تھے اور سڈنی نہ جانے والے معاملے میں اور پھر بعد میں اپنے پسندیدہ سبجیکٹ کے ساتھ اے لیول کرنے کے سلسلے میں انہوں نے ہی اس کی ممی کو کنونس کیا تھا۔
عادل بھائی اپنے کیبن میں کافی پریشان بیٹھے تھے۔

''او نیگیٹو کی ضرورت ہے...... بلڈ بینک میں بھی نہیں ہے۔ کیا کروں موبائل بھی آف کر کے گھر بھول آیا ہوں۔ پریشانی ہو رہی ہے۔ داؤد سے وعدہ کیا تھا کہ میں ارینج کر دوں گا۔ وہ بندہ آیا ہی نہیں یار...... حد ہے غیر ذمہ داری کی۔''

وہ مسلسل فون ملانے، جھنجلانے اور اس سے بات کرنے میں مصروف تھے۔

''عادل بھائی! میرا گروپ او نیگیٹو ہے۔'' اس نے اپنی طرف سے ان کی الجھن دور کرنے کے لیے خوشخبری دینے والے انداز میں کہا تھا، مگر وہ مزید جھنجلا گئے۔

''ارے یار! کیوں سرجن مرتضٰی سے ڈانٹ پڑوانا چاہتے ہو مجھے۔ میں تو ویسے بھی ان کی گڈ بکس میں نہیں ہوں۔''

''ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا عادل بھائی۔'' وہ ان کے انداز پر مسکرا کر بولا۔ ان کے بتائے ہوئے وارڈ کی سمت آ گیا اور اسی وارڈ میں اسے وہ پری وش نظر آئی جواب مکمل طور پر اس کے حواسوں پر سوار تھی۔

اس کی عمر ابھی بمشکل انیس سال تھی مگر اپنے اونچے قد کے باعث وہ عمر سے کچھ بڑا دکھائی دیتا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ دھان پان سی حسینہ اسے ایسے ٹریٹ کر رہی تھی جیسے وہ کوئی پانچ سالہ بچہ ہو۔

''ان کا نام کیا ہے؟'' اس نے اس لڑکی کے روم سے چلے جانے کے بعد پوچھا۔

''مسز مریم!'' وہ ادھیڑ عمر کمپاؤنڈر ناک چڑھا کر بولا۔

دل ہی دل میں وہ خود بھی لفظ ''مسز'' پر چڑ سا گیا۔

''کسی نرس سے محبت کرنے میں یہ سب سے نقصان والی بات ہے۔''

دوبارہ سے یہی بات یاد آنے پر وہ اونچی آواز میں بڑبڑایا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایکسر سائز کر رہا تھا۔ کیبل کلچر سے بہت بری طرح متاثر سمیع مرتضٰی پہلی نظر کی محبت کا شکار ہو چکا تھا۔



''میں کوئی منفرد اور مختلف سی چیز خریدنا چاہتی ہوں۔''

تزئین نے بلا مبالغہ پانچویں مرتبہ یہی ایک جملہ دہرایا تھا۔ مریم نے اُکتا کر اس کی جانب دیکھا، مگر وہ اثر لیے بغیر ایک جانب ترتیب سے ہینگ کی ہوئی شرٹس دیکھنے لگی۔

''وہ والی شرٹ دکھائیے۔'' اِدھر اُدھر نظر دوڑاتے شاید اسے کوئی شرٹ پسند آ ہی گئی تھی۔ سیلز مین نے پھرتی سے شرٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔

''مریم! یہ کیسی ہے۔ سانولے رنگ پر سوٹ کرے گی یا نہیں؟''

وہ شرٹ کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے مریم سے رائے لے رہی تھی۔ مریم کو شرٹ تو پسند آئی تھی مگر تزئین کے سوال کا جواب نہیں تھا اس کے پاس۔ اس نے کبھی اس طرح خریداری نہیں کی تھی۔ وہ گورے اور سانولے کی تخصیص کیے بغیر خریداری کرنے کی عادی تھی۔ ویسے بھی وہ جانتی تھی کہ اس کے مشورے کا تزئین پر کوئی اثر نہیں ہونے والا۔ گزشتہ ڈیڑھ گھنٹے سے وہ لبرٹی مارکیٹ کے مختلف شاپنگ سینٹرز میں گھوم رہی تھیں مگر تزئین کو کوئی چیز ہی پسند نہیں آ رہی تھی۔ پہلے انہوں نے پرفیومز دیکھے تھے، پھر رسٹ واچ اس کے بعد کتابوں کی باری آئی مگر کوئی ''منفرد'' اور مختلف چیز ابھی بھی نہیں ملی تھی۔

''اس کی پرائس کیا ہے؟'' تزئین نے شرٹ کو فائنل کر لیا تھا۔

''ریزن ایبل پرائس ہے میم! آپ نے ایک زبردست پیس پسند کیا ہے۔ کوالٹی میں شاندار اور قیمت میں بے حد کم۔ میں پیک کروا دیتا ہوں۔'' وہ قیمت بتائے بغیر شرٹ کو پیکنگ سیکشن میں پارسل کرنے لگا۔

''پہلے قیمت تو بتا دیجیے؟'' تزئین نے سیلز مین کے خوشامدانہ رویے کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''اونلی نائن ہنڈرڈ میم۔'' وہ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا جب کہ تزئین کو چند لمحوں کے لیے چپ لگ گئی۔

''ارے یہ بہت سستی ہے۔ کوئی مہنگی چیز دکھائیے جناب۔''

تزئین نے منہ بنا کر کہا، بلاشبہ قیمت سن کر اسے مایوسی ہوئی تھی۔ شرٹ اسے پسند آئی تھی مگر آؤٹ آف بجٹ تھی۔ پہلے اسے پرفیوم پسند آیا تھا اور اس کی قیمت اس شرٹ سے بھی زیادہ تھی۔ وہ پہلے ہی غصے میں بھری ہوئی تھی شرٹ کی قیمت سن کر مزید غصے میں آ گئی۔

''اس شرٹ کی خوبی کیا ہے بائی داوے...... اس کو پہن کر انسان ٹام کروز لگنے لگتا ہے؟''

وہ تنک کر بولی مگر سیلز مین نے اس کے لہجے کی سختی کا برا مانے بغیر ایک اور شرٹ اس کے سامنے رکھی۔

''آپ۔'' یہ دیکھ لیجیے یہ اس سیزن کا موسٹ فیورٹ کلر ہے۔ اونلی ایٹ ہنڈرڈ روپیز۔''

مگر وہ دونوں شرٹس تزئین کی جیب کے لیے ناقابلِ برداشت تھیں۔ وہ مایوسی سے ''تھینک یو'' کہہ کر اپنی ہی دھن میں مڑی اور پیچھے آنے والی لڑکی سے ٹکرا گئی۔

''آئی ایم سوری۔'' اس لڑکی نے کندھا سہلاتے ہوئے معذرت کی...... حالانکہ غلطی اس کی نہیں تھی۔ مریم نے بھی اس صورتِ حال سے اُکتا کر لڑکی کی جانب دیکھا اور چونک سی گئی۔ وہ لڑکی بھی شاید مریم کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تم......تم......ہم پہلے بھی مل چکے ہیں نا۔ آئی تھنک ہم پی سی میں ملے تھے بسنت ایوننگ پر؟''

وہ لڑکی ذہن پر زور دیتے ہوئے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''کیسا عجیب اتفاق ہے۔ میں نے سوچا تھا ہم دوبارہ کبھی نہیں ملیں گے۔'' اس کی بات پر مریم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''تمہارے گروپ کا عاطف لوگوں سے جھگڑا ہو گیا تھا نا۔ ان لوگوں کی تو بعد میں خوب بے عزتی ہوئی تھی اور پھر......''

''ہم پی سی میں نہیں ملے تھے۔ ہم کوچ میں ملے تھے، ایک بار۔'' مریم نے منمنا کر کہا۔ اس کا سارا زور ''ایک بار'' پر تھا۔ ماہین عرف ماہی کا اس قدر بے تکلف انداز اسے پہلی ملاقات میں بھی ہضم نہیں ہوا تھا اور اب بھی نہیں ہو رہا تھا۔

''اولیس......گڈ گاڈ......مائی پور میموری...... یہ میرا بچپن کا پرابلم ہے، شکل اور نام تو یاد رہ جاتے ہیں مگر واقعات بھول جاتی ہوں۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ تزئین بھی حیرت سے اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اتنی طرحدار اور ماڈرن لڑکی اس نے مریم کے حلقہ احباب میں ابھی تک نہیں دیکھی تھی۔

''یہ کون ہے؟ تمہاری فرینڈ؟ تم لوگ شاپنگ کر رہے ہو؟ اس شاپ سے کیا لینا ہے۔ یہاں تو خالصتاً جینٹس کلیکشن ہوتی ہے اچھا اچھا۔ اب سمجھی کسی فرینڈ کے لیے کچھ لینا ہوگا۔''

ماہین کا وہی انداز تھا۔ زیادہ بولنا اور کم سننا۔

''یہ تزئین ہے میری دوست۔ اس کو اپنے بہنوئی کے لیے گفٹ خریدنا تھا اسی لیے۔''

اس کے خاموش ہونے پر مریم جلدی سے بولی۔ مبادا وہ پھر سے بولنا شروع ہو جائے۔ اس کی بات سن کر ماہین نے ساری توجہ تزئین کی طرف کر لی۔

''ارے یار! یہ بھائی اور بہنوئی سب ایک سے ہوتے ہیں، نخریلے اور مغرور ان کو گفٹ مشکل سے ہی پسند آتے ہیں۔ بائی دا وے کیا خریدا تم لوگوں نے کچھ پسند آیا یا نہیں؟''

اس کا انداز بالکل بچپن کی سہیلیوں والا تھا۔ تزئین کی آنکھوں میں بھی تحیر تھا۔

''اے آئی ہیلپ یو اس طرف بہت اچھے کرسٹل پیسز ہوتے ہیں، اس طرف چلتے ہیں۔''

وہ خود ہی سوال کر کے خود ہی جواب دینے کے بعد آگے کی سمت بڑھی۔ مریم اور تزئین نے ایک دوسرے کی آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھا پھر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ شاپنگ سینٹر کے بیسمنٹ میں اتر کر آگے کی جانب چلتے ہوئے ماہین اس سے شکوہ کرنے لگی۔

''تم نے مجھ سے کانٹیکٹ ہی نہیں کیا۔ میں نے تمہیں اپنا سیل نمبر دیا تھا نا۔ اور تزئین تم کیا کرتی ہو مریم کی طرح ابھی پڑھ رہی ہو یا جاب کرتی ہو میری طرح؟''

ایک جگہ پر رکتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

''یہ میری کلاس فیلو ہے۔'' جواب ایک بار پھر مریم نے دیا۔ وہ تینوں اب گلاس شوکیس میں سجے کرسٹل کے ڈیکوریشن پیسز دیکھ رہی تھیں اس سیکشن میں حقیقتاً ایک سے ایک زبردست چیز موجود تھی۔ وہ مختلف چیزوں کو دیکھتی وسراہتی آگے بڑھتی رہیں، مگر کچھ خریدنے کی ہمت تزئین میں نہیں تھی۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کے ساتھ بھی اس کا بڑی سی رقم والا پرائس ٹیگ

چسپاں تھا، جب کہ ماہین ہر چیز خریدنے پر اصرار کر رہی تھی۔

''یہ باربی ڈول دیکھو، کس قدر کیوٹ ہے۔'' اس نے کرسٹل کی ایک نازک سی گڑیا کی طرف اشارہ کیا۔ اس گڑیا کا ہر نقش اور ہر عضو نہایت مہارت کے ساتھ تخلیق کیا گیا تھا، مگر اس گڑیا کے ساتھ لگا پرائس ٹیگ ان دونوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

''میں نے ثوبان کی برتھ ڈے پر یہیں سے گفٹ پسند کر کے دیا۔ آئی ایم شیور تمہارے بہنوئی کو یہ چیز بہت پسند آئے گی۔ ایکسکیوزمی اسے پیک کر دیجئے۔''

اس نے سیلز مین کو اشارہ کرتے ہوئے کہا، جب کہ تزئین نانا کرتی رہ گئی۔

''کیوں پسند نہیں آیا؟ یار......میرا مشورہ مانو تو لے لو بہت کیوٹ چیز ہے۔''

وہ لاپروائی سے بول رہی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ تزئین کی ہچکچاہٹ کا اصل محرک کیا ہے۔

''نہیں یہ بات نہیں ہے پسند تو آیا ہے عادل کو بھی بہت پسند آئے گا مگر دراصل۔''

تزئین کہتے کہتے پھر خاموش ہو گئی، جب کہ مریم حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگی اتنی دیر سے اس کے ساتھ بازار میں گھومتے ہوئے اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا کہ وہ اتنی دلجمعی سے کس کے لیے گفٹ خریدنا چاہ رہی ہے۔ ہاسٹل سے نکلنے سے پہلے اس نے مریم سے صرف یہ کہا تھا وہ اپنے بہنوئی کے لیے کوئی گفٹ خریدنا چاہ رہی ہے۔ مریم کو حیرت تو ہوئی تھی کہ جس بہنوئی کو وہ ہمہ وقت ''گنجا بھالو'' اور ''بدصورت دیو'' کے نام سے پکارتی رہتی ہے آخر وہ اس قدر توجہ کا مرکز کیسے ہو گیا۔ اسے دکھ تو بہت ہوا مگر کچھ کہنے کی بجائے وہ ان دونوں کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ پے منٹ کا مرحلہ کیسے طے ہوا اسے کچھ نہیں پتا تھا بس اس نے تزئین کو بیگ سے اپنی ساری جمع پونجی نکال کر گنتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاپنگ سینٹر سے نکل کر وہ ماہین کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں آ گئیں۔ ماہین یا تو حقیقتاً بہت دوستانہ مزاج کی مالک تھی یا پھر آج وہ گھر سے بور ہو کر نکلی ہوئی تھی اسی لیے ان کے ساتھ اتنی فراغت سے وقت گزار رہی تھی۔ یہ عقدہ بھی بہرحال تھوڑی دیر بعد کھل ہی گیا۔

''میں نے اپنا موبائل آف کیا ہوا ہے۔ یار! محسن نے آج کل میری بہت جان کھائی ہوئی ہے۔ اسے شاید کسی عامل بابا نے کہہ دیا ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں تب ہی جب ملتا ہے، ایک ہی بات کہتا ہے ثوبان سے قطع تعلق کر لو۔ یار! بھلا میں کیوں ایسا کروں؟ ثوبان میری پہلی اور آخری محبت ہے اور پھر اتنا ڈیل آف لڑکا، میں پھٹیچر محسن کی وجہ سے تو نہیں چھوڑ سکتی نا۔ بس میں اسی سے چھپ کر گھر سے نکلی تھی وہ ڈرائنگ روم میں آیا بیٹھا تھا میں پچھلے دروازے سے نکل کر آ گئی۔ موبائل بھی اسی لیے گھر پہ چھوڑ دیا کہ مجھے کانٹیکٹ نہ کر سکے۔''

وہ نہایت اطمینان سے تفصیل بتا رہی تھی۔ تزئین اور مریم خاموش بیٹھی رہیں۔

''میں تم لوگوں کو ڈراپ کر دیتی ہوں۔'' چائے پی کر اس نے ان دونوں کو آفر کی۔ شام نے رات کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ وہ دونوں بھی لوکل وین سے جانا نہیں چاہتی تھیں اور آٹو رکشہ پر کافی پیسے خرچ ہو جاتے اسی لیے ماہین کی آفر قبول کر لی گئی۔ مریم پیچھے بیٹھ گئی جب کہ تزئین نے اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ سنبھال لی۔ سفر کے دوران ہی فون نمبرز کا تبادلہ ہوا۔ ماہین نے اپنے گھر کا فون نمبر اور موبائل نمبر بھی دیا، جب کہ تزئین نے چند دن پہلے ہی موبائل خریدا تھا اس نے بھی اپنا نمبر ماہین کو دیا۔ اسے مریم کی طرح ماہین سے کوئی کوفت نہیں ہوئی تھی، بلکہ اسے وہ لڑکی کافی ملنسار اور خوش اخلاق لگی تھی۔

''تم دونوں یہاں رہتی ہو؟'' ان کی منزل پر پہنچ کر ماہین نے کسی قدر تحیر سے پوچھا حالانکہ وہ تزئین سے پوچھ رہی

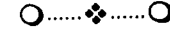
یہاں تک آئی تھی۔ مریم نے اس کے سوال پر ناک چڑھا کر اس کی جانب دیکھا۔ پہلی ملاقات میں اس نے واضح طور پر اسے بتایا تھا کہ وہ ہاسٹل میں رہتی ہے۔

''ہاں...... ہم یہیں رہتے ہیں۔ تمہیں اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے؟'' تزئین نے دروازہ کھولنے سے پہلے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''نہیں حیرت نہیں ہو رہی، ان فیکٹ میرے فادر اسی ہاسپٹل کے ایمپلائی ہیں۔ وہ آرتھوپیڈک سرجن ہیں۔ سرجن مرتضٰی احسن نام تو سنا ہوگا؟''

وہ بہت سنجیدہ اور عجب لاتعلقی والے انداز میں کہہ رہی تھی جب کہ مریم اور تزئین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ بلاشبہ وہ دونوں چونکی تھیں۔

''ڈاکٹر عادل تمہارے ماموں ہیں؟'' تزئین نے پوچھا۔ وہ متجسس نظر آ رہی تھی۔ ماہین نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر انہیں ہاتھ ہلا کر گاڑی آگے بڑھا لے گئی۔ تزئین نے مریم کی جانب دیکھا۔ وہ شاید اس نئی اطلاع پر تبصرہ کرنا چاہ رہی تھی مگر مریم کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔



''سرجن مرتضٰی آپ کو اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔'' وہ آڈیٹوریم سے نکل کر کوریڈور کی سمت جا رہی تھی جب وارڈ بوائے نے اسے پیغام دیا۔ اس کی آج سارے دن میں کوئی شفٹ نہیں تھی اس لیے اسے اس کال پر حیرت کے ساتھ ساتھ تشویش بھی ہوئی۔ وہ گزشتہ ایک ہفتے کی تمام شفٹس کو ذہن میں دہراتی اور قیاس آرائیاں کرتی سرجن مرتضٰی کے کمرے کی سمت چل دی۔ اس نے کس مریض کو کس طرح ڈیل کیا تھا اور اس نے کیا غلطیاں کی تھیں۔ یاد کرنے پر بھی اسے کوئی قابلِ گرفت بات یاد نہیں آئی۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرتی سرجن مرتضٰی کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''یس سرجن! آپ نے مجھے بلایا تھا۔'' اس کے انداز میں عجلت اور تشویش نے سرجن مرتضٰی کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

''آؤ بیٹھو مریم! جلدی میں ہو کیا؟ مجھے تم سے تفصیلی بات کرنی ہے۔'' وہ اپنا سنہری چشمہ آنکھوں سے اتارتے ہوئے بولے۔ مریم ابھی شش و پنج میں تھی کہ سرجن مرتضٰی پھر بولے۔

''تم اگر جلدی میں ہو تو میں پھر بات کر لوں گا۔ آج میں سارا دن وارڈ میں ہوں۔ ٹیکساس سے جو ڈاکٹرز کی ٹیم آئی ہے جس نے فری ڈائبٹیک کیمپ لگایا ہوا ہے۔ میں ان کی میزبانی کر رہا ہوں۔ اگر تم ابھی مصروف ہو تو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد آ جانا۔''

''نہیں سرجن...... اٹس او کے...... آپ ابھی بات کر لیجیے۔'' ان کے لہجے نے اسے کسی قدر مطمئن کر دیا۔

''اچھا...... تم بیٹھو تو سہی۔'' انہوں نے کرسی کی سمت اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ کر ان کی جانب دیکھنے لگی۔ لائٹ گرین شرٹ ان کے سراپے کو بے حد وقار بخش رہی تھی۔ انہوں نے اپنے سامنے پڑے کاغذات کو ترتیب سے رکھ کر چشمہ دوبارہ سے آنکھوں پر ٹکا لیا۔ ان کی کنپٹیوں پر چند ایک سفید بال نمودار ہو رہے تھے اور ان کے وقار میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔

''دراصل بات یہ ہے کہ میرے ایک دوست کا بیٹا ایک ایکسیڈنٹ میں کافی زخمی ہو گیا تھا۔ کافی فریکچر تھے۔ یہیں کسی ایک روم میں کچھ دن ایڈمٹ رہا تھا۔ میرا خیال ہے تمہاری بھی ایک دن ڈیوٹی رہی تھی اس روم میں، آج کل وہ بیڈ ریسٹ

لے رہا ہے۔ اسے ایک میڈیکل کیئر ٹیکر کی ضرورت ہے۔''

وہ رک رک کر بات کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ مریم کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ بھی لے رہے تھے۔ مریم یقیناً ان کی نامکمل بات کا کوئی رخ سمجھ نہیں پائی تھی۔

''دراصل میرا وہ دوست ایک معروف اور مصروف سیاسی کارکن ہے۔ اس کی بیوی بھی ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ دونوں میاں بیوی زیادہ وقت گھر سے باہر ہوتے ہیں اور بچے کی مناسب دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ان لوگوں نے مجھ سے ریکویسٹ کی ہے کہ میں ایک نرس کا بندوبست کر دوں۔''

انہوں نے پھر توقف کیا اور اب کی بار مریم نے اس توقف کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

''آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں سرجن؟''

''اِن فیکٹ میں تمہیں جاب آفر کر رہا ہوں۔ رات نو سے صبح نو تک کی ڈیوٹی ہوگی۔ تمہیں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ میرے بھروسے کے لوگ ہیں تمہیں کافی ہینڈسم سیلری پیکیج ملے گا اور اجازت تمہیں میں دلوا دوں گا۔'' انہوں نے اب کی بار کافی وضاحت سے بات کی تھی مگر مریم کو ان کی بات پسند نہیں آئی۔

''میں پیسے کی خاطر اس فیلڈ میں نہیں آئی سرجن۔'' وہ لہجے کو بمشکل نارمل رکھتے ہوئے بولی۔

''نہیں، نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں تم ایک اچھی روشن خیال فیملی سے تعلق رکھتی ہو۔ پیسے تمہارا مسئلہ نہیں...... اسی لیے میں تمہیں یہ ذمہ داری سونپنا چاہ رہا تھا۔ تم بہت ڈیوٹی فل ہو اور تم یہ ذمہ داری بخوبی نبھا سکتی ہو۔''

مریم کو نہ جانے کیوں ان کے لہجے میں عجیب سا اسرار محسوس ہوا۔

''سر! آپ نگہت سے کیوں نہیں کہتے، وہ مجھ سے زیادہ ذمہ دار اور زیادہ ڈیوٹی فل ہے اور سب سے بڑھ کر وہ مجھ سے بہت سینئر ہے اور اس کا تجربہ مجھ سے زیادہ ہے۔ اسے اس قسم کی ڈیوٹیز ویسے بھی پسند ہیں۔'' مریم نے نرمی سے کہا۔ واضح انکار کر کے وہ سرجن مرتضٰی کو بھی ناراض نہیں کر سکتی تھی۔

''نگہت کو تو بہت کچھ پسند ہے مگر میرے دوست کو تم پسند آئی ہو۔'' سرجن مرتضٰی اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے نہ جانے کس خیال کے تحت بولتے چلے گئے۔ مریم نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''کیا مطلب؟'' اب کی بار وہ اپنے لہجے کو سخت ہونے سے بچا نہ سکی۔

''دراصل بچہ بہت ضدی ہے۔ وہ اپنی ماں کے علاوہ کم ہی کسی کے ہاتھ سے کچھ لے کر کھانے پینے پہ تیار ہوتا ہے اس لیے ان لوگوں کی ڈیمانڈ تھی کہ کسی کیوٹ نرس کا بندوبست کیا جائے تاکہ اس سے بچے کی دوستی بھی ہو جائے اور تیمارداری بھی ہوتی رہے۔ آج کل کے بچوں کو تم جانتی ہی ہو کم صورت ٹیچر سے پڑھنے پر راضی نہیں ہوتے کجا کہ کچھ کھانے پینے پر تیار ہونا۔ اسی لیے میں نے تمہیں اپروچ کیا ہے تاکہ یہ پریشانی ختم ہو سکے۔''

سرجن مرتضٰی اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے مگر مریم دیر تک نہ بول سکی۔

''دیکھو، میری بات کا غلط مطلب مت لو۔ میں تمہیں گزشتہ ایک ڈیڑھ سال سے اس ہاسپٹل میں دیکھ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم میں کام کرنے کی، آگے بڑھنے کی لگن ہے بس اسی لیے۔''

انہوں نے بہت رسانیت سے کہا۔ ان کی بات میں اور ان کے انداز میں کچھ تو ایسا تھا کہ مریم غصہ کرنے کے بجائے ان کی بات پر غور کرنے لگی۔ وہ کوئی متبادل نام سوچ رہی تھی، جو اپنے بجائے سرجن مرتضٰی کے سامنے پیش کر سکے۔ اسے ایک

دم لیزا کا خیال آیا جو چند دن پہلے اسے بتا رہی تھی کہ وہ کسی پارٹ ٹائم جاب کی تلاش میں ہے۔ لیزا کے علاوہ سلویا اور ساجدہ اور پھر سب سے بڑھ کر تزئین بھی ضرورت مند لڑکیوں کی فہرست میں آتی تھی اور اکثر اس کے پاس بیٹھ کر اپنی اپنی ضرورتوں کا رونا روتی رہتی تھیں۔

"آپ لیزا سے بات کیجئے سر یا پھر ساجدہ یا تزئین وغیرہ سے۔ وہ بھی میری طرح بہت ڈیوٹی فل ہیں، خاص کر تزئین وہ ہم سب میں سب سے زیادہ اچھی ہے، بلکہ وارڈ میں اک وہی واحد لڑکی ہوتی ہے جو بچوں کو بہترین طریقے سے ہینڈل کرتی ہے۔" اس نے اپنی دو تین کلاس فیلوز کا نام لیا۔

"تم اپنی بات کرنے کے بجائے دوسروں کی بات کیوں کر رہی ہو؟"

سرجن مرتضیٰ گویا زچ ہو کر بولے۔

"آپ دوسروں کی بات کرنے کے بجائے میری ہی بات کیوں کر رہے ہیں؟"

اس نے بھی دو بدو جواب دیا۔ سرجن مرتضیٰ کے انداز نے اسے جرأت سے بات کرنے کا حوصلہ دیا تھا۔ سرجن مرتضیٰ ایک دم ہنس دیئے۔ مریم کو اس سنجیدہ صورت حال میں اس قسم کے قہقہے کی امید نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔" وہ اس کے چہرے پر مکمل ارتکاز کرتے ہوئے بولے۔ انہوں نے چشمہ ایک بار پھر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"تم اچھی لڑکی ہو، اس لیے میں نے تم سے بات کی ورنہ یہاں لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ بہت سی ایسی لڑکیاں ہیں جو میرے ایک بار کہنے پر فوراً تیار ہو جائیں گی۔"

مریم خاموشی سے بیٹھی رہی۔ ان کی اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، جب کہ سرجن مرتضیٰ مسلسل اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

"اب میں جاؤں۔" اس نے ان کے اس طرح سے دیکھنے پر مدھم سی آواز میں اجازت طلب کی۔ سرجن نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"تم واقعی معصوم ہو یا صرف پوز کرتی ہو۔" وہ میز پر قدرے جھک کر بولے۔ مریم نے حیرانی سے ان کی شکل دیکھی۔ وہ نہ جانے اس کے ساتھ پہلیاں بوجھنے والا یہ کھیل کیوں کھیل رہے تھے۔

"ارے بابا...... میں تم سے مذاق کر رہا تھا۔ صرف تمہیں جانچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم اتنی ہی اچھی لڑکی ہو جتنا کہ میں نے سوچا تھا۔ دراصل مجھے تمہیں یہ پیپرز دینے تھے۔" انہوں نے کچھ پیپرز اس کے سامنے رکھے۔

"سری لنکا میں پیرا میڈیکل اسٹاف کے بنیادی انفراسٹرکچر کے لیے ایک پندرہ روزہ کورس ہو رہا ہے۔ سارے جنوبی ایشیا سے لوگ آ رہے ہیں ہمارے یہاں سے بھی چند منتخب لوگوں کو بھیجا جا رہا ہے۔ مبارک ہو، تمہارا نام بھی ان لوگوں میں شامل ہے۔"

انہوں نے وہ بات بتا دی جس کے لیے انہوں نے مریم کو بلایا تھا۔ مریم نے اپنی سینئرز سے ایسے کورسز کے بارے میں سن رکھا تھا اور وہ ان کورسز کی اہمیت و افادیت سے بخوبی واقف تھی۔

"میں...... مجھے...... میرا مطلب میں تو ابھی اسٹوڈنٹ نرس ہوں۔ میرا سلیکشن کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ بے پناہ خوشی پر قابو پا کر بولی۔

"تمہارا گزشتہ ریکارڈ بہت شاندار ہے مریم......! اس کے علاوہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے تم بہت ریگولر ہو، بہت ذمہ دار اور فرض شناس ہو، اسی لیے تمہیں چنا گیا ہے۔"

وہ ریوالونگ چیئر کی پشت سے کمر ٹکائے اس کے خوشی سے سرخ پڑتے چہرے کو مسکراتے ہوئے بغور دیکھ رہے تھے۔ مریم کچھ کہنے ہی والی تھی کہ کمرے کا دروازہ بنا دستک کے کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔

"آؤ...... نگہت! آ جاؤ۔" سرجن مرتضیٰ ایک دم سے اپنی سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ مریم نے بھی مڑ کر دیکھا۔

"تم بہت خوش لگ رہی ہو...... خیریت؟" وہ مریم کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں تحیر، پیشانی پر تیوریاں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"اور کیا میں پوچھ سکتی ہوں، تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو...... آج تو تمہاری شفٹ بھی نہیں ہے؟"

اس کے لہجے میں عجیب سا طنز گھلا ہوا تھا۔

"مجھے ایک کام تھا اسی لیے میں نے بلوایا تھا۔ سری لنکا والے کورس کے لیے مریم کو سلیکٹ کیا گیا ہے۔"

سرجن مرتضیٰ نے نگہت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مریم کو؟ مگر مریم تو...... میرا مطلب ابھی تو یہ سیکنڈ ایئر میں ہے اس کورس کے لیے تو وارڈ سسٹرز کو سلیکٹ کیا جا رہا تھا اور مریم تو ابھی اسٹوڈنٹ نرس ہے۔"

اس کی ساری توجہ مریم کے بجائے سرجن مرتضیٰ کی طرف مبذول تھی۔

"ہاں...... تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر کبھی کبھی وارڈ سسٹرز سے کوتاہی ہو جاتی ہے تو پھر اس کا ازالہ کرنے کے لیے اسٹوڈنٹ نرس کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔" سرجن مرتضیٰ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا مگر ان کی مسکراہٹ اور الفاظ میں عجیب سی کاٹ تھی جسے مریم جوشِ جذبات میں محسوس بھی نہیں کر پائی تھی۔

"آپ جا سکتی ہیں مریم!"

سرجن مرتضیٰ نے اسے جانے کا عندیہ دیا۔ وہ ان پیپرز کو اٹھا کر دروازے کی سمت چل دی۔

"یہ سب آخر ہو کیا رہا ہے؟" عقب میں اس نے نگہت کی غراتی ہوئی آواز سنی تھی۔



"کیا کر رہی ہو؟" نگہت دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی پوچھ رہی تھی۔ مریم نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا پھر بشاشت سے مسکرائی۔

"شکر ہے یار! تمہاری شکل تو نظر آئی۔" وہ نگہت کے چہرے پر پھیلی بیزاری و خفگی کو محسوس کیے بغیر کہنے لگی۔ اس کی بات سن کر نگہت کے چہرے پر استہزائیہ ہنسی نے ذرا کی ذرا جھلک دکھائی۔

"کیوں، خیریت؟ اتنا مس کر رہی تھیں مجھے؟" وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے قریب آ گئی۔ مریم نے بستر پر پڑے سفری بیگ کا رخ بالکل اس کی جانب کر دیا۔

"ہاں نا...... یہ دیکھو، میں نے یہ سب سامان رکھا ہے۔ مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے کون سی چیزیں ساتھ لے جانا چاہئیں۔ میں تو کنفیوز ہو گئی ہوں۔"

وہ بے چارگی سے کہہ رہی تھی۔

''اوہ......اس کا مطلب، تم نے فیصلہ کرلیا ہے۔'' نگہت نظریں گھماتے ہوئے بولی۔ اس کا انداز مریم کے لیے کسی قدر اجنبی تھا۔ مریم نے ناسمجھی کے انداز میں اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔

''آئی مین تم سری لنکا کے ٹور پر جا رہی ہو؟'' نگہت نے ایک اور سوال کیا۔

''ہاں یار......تب ہی تو یہ پھیلاوا پھیلا کر بیٹھی ہوں۔'' مریم نے نفاست سے تہہ کر کے رکھا ہوا ایک اور سوٹ بیگ میں ٹھونسا۔ وہ بہت خوش اور بہت مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

''بائی داوے تمہارے گھر والوں نے اجازت دے دی؟'' اس کا انداز خاصا طنزیہ تھا۔

''ہاں، دے دی۔ ابو جی تو بخوشی رضامند ہو گئے تھے، بس حیدر واویلا کر رہا تھا مگر میں نے کوئی پروا نہیں کی۔ ایسا چانس روز روز تو نہیں ملتا۔'' وہ بات کرتے کرتے الماری کی جانب چل دی اور ضرورت کی دوسری چیزیں نکال کر ایک شاپر بیگ میں رکھنے لگی۔

''چانس؟'' نگہت نے استفہامیہ انداز میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ساری گفتگو میں پہلی مرتبہ مریم نے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا پھر سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''نگہت! مجھے لگتا ہے، تم نے آج چائے نہیں پی اسی لیے سُست ہو رہی ہو۔ میں ذرا اس پیکنگ سے فارغ ہو لوں پھر مل کر چائے پیتے ہیں، میں نے بھی ابھی تک چائے نہیں پی۔ تزئین بھی تب تک آ جائے گی۔'' وہ اسی شاپر کو گرہ لگا کر بیگ میں رکھنے لگی۔ میز کے ایک کارنر پہ اس کا ٹوتھ برش اور پیسٹ وغیرہ پڑے تھے۔ وہ انہیں اٹھانے کے لیے نگہت کی دائیں جانب سے گزرنے لگی تھی کہ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ نگہت کی گرفت میں عجیب سی سختی تھی۔ مریم نے حیرانی سے اس کی شکل دیکھی۔

''کافی ہو چکا مریم! اب بس کرو...... بتا دو مجھے کہ یہ چکر کتنے دن سے چل رہا ہے اور مرتضیٰ نے اس ٹور کے بدلے تم سے تمہارے علاوہ مزید کیا ڈیمانڈز کی ہیں۔'' اس کے لہجے میں عجیب سی تھکن اور الفاظ میں کاٹ تھی۔ نگہت کے منہ سے سرجن مرتضیٰ کے لیے صرف ''مرتضیٰ'' سننا بھی مریم کے لیے کافی اچنبھے کا باعث تھا۔

''تم......تم کیسی باتیں کر رہی ہو نگہت...... مجھے......''

''بس بہت ہو چکا مریم۔'' وہ مریم کی بات کاٹ کر غرائی۔

''اب یہ مت کہنا کہ تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تمہارا یہ ڈائیلاگ بہت پرانا ہو چکا ہے۔ بہتر ہو گا کہ اب اس معصومیت کے چوغے کو اتار پھینکو...... بہت برداشت کر لیا میں نے......تم کیا سمجھتی ہو نگہت کوئی دودھ پیتی بچی ہے جسے تم بے وقوف بنا لو گی۔ مجھے چلانا اتنا آسان نہیں ہے مریم! اب مجھے بتا ہی دو کہ تم نے مرتضیٰ کو کس حد تک اپنی مٹھی میں کیا ہوا ہے۔ وہ شخص جو صرف میرے نام کی تسبیح پڑھتا تھا وہ اب تمہارے نام کی مالا کیوں جپنے لگا ہے۔'' اس کے انداز میں اس قدر تضحیک تھی کہ مریم اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی۔

''یہ بات میں ابتدا سے جانتی تھی کہ مرتضیٰ تمہیں پسند کرتا ہے۔ میں نے سوچا کوئی بات نہیں لڑکی اچھی ہے اور اچھی چیز ہر کسی کو اچھی لگتی ہے مگر میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ اچھی چیز ایک دن مجھے ہی ری پلیس کر دے گی۔''

وہ چبا چبا کر بول رہی تھی۔ مریم نے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''خدا کے واسطے نگہت چپ ہو جاؤ، تمہاری یہ بکواس مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تمہیں میری عزت کا پاس نہیں نا سہی مگر سرجن مرتضیٰ تو تمہارے لیے قابلِ عزت ہیں نا۔ ان کا ہی احساس کر لو۔''

''میں کیوں کسی کا احساس کروں۔'' نگہت نے اس کی بات کاٹی۔

''میں کسی کا احساس نہیں کروں گی اور یہاں کون ایسا ہے جس کی میں عزت کروں۔''

''تم اپنی مثال لے لو۔ اتنی بڑی کانفرنس کے لیے کسی عام سی اسٹوڈنٹ نرس کا سلیکشن کسی کرم نوازی کے بغیر تو نہیں ہوا ہو گا اور پھر مرتضیٰ کو میں تم سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ شخص تو مطلب کے بغیر کسی کے سر پر ہاتھ نہ رکھے۔'' نگہت کی سانس بے تحاشا پھول رہی تھی مگر اس کے غیض میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ مریم کی آنکھ سے جھر جھر آنسو بہنے لگے۔ اس کے خیال میں نگہت کا دماغی توازن خراب ہو گیا تھا۔

''اس کورس میں شرکت کے لیے مجھے سلیکٹ کیا جانا تھا۔ مجھے اس کے بعد آرتھو پیڈک میں ہی اسپشلائزیشن کرنی تھی۔ مرتضیٰ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ میرا ہی نام دے گا اور چیئرمین تک پہنچائے گا مگر پھر بیچ میں تم آ گئیں اور میرا نام واپس لے لیا گیا۔ مرتضیٰ......''

اس کی بات ابھی نامکمل تھی کہ تزئین کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں کچھ شاپر بیگز پکڑے ہوئے تھے۔ وہ اندر کی صورتِ حال سے بالکل بے خبر تھی اس لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے وہ ان دونوں کی سمت بڑھی تو مریم کے بہتے آنسوؤں نے اسے حیران کر دیا۔ نگہت کے چہرے کے تاثرات بھی کچھ نارمل نہیں لگ رہے تھے۔

''تم دونوں کو کیا ہوا ہے؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔ مریم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئی اور اس کے بازو تھام لیا۔

''تزئین! نگہت کو کوئی غلط فہمی......''

''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی اور اس تزئین سے کیا پوچھتی ہو یہ تو خود اس غلاظت میں لتھڑی ہوئی ہے۔''

نگہت نے پھر مریم کو بولنے کا موقع نہیں دیا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو نگہت! تم اپنے ہوش میں تو ہو؟'' تزئین اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اوہو، تو اب آپ مجھے سمجھائیں گی کہ میں اپنے ہوش میں رہوں...... کیا میں آپ سے پوچھ سکتی ہوں کہ میٹرن کے کہنے پر جب آپ پہلی مرتبہ ڈین کے گھر گئی تھیں تو آپ ہوش میں تھیں اور پھر اب جب......'' تزئین نے بات کاٹی۔

''مزید ایک لفظ نہیں نگہت...... میں تمہارا منہ توڑ دوں گی......تم......''

''میرا منہ توڑو گی کیونکہ میں سچ بول رہی ہوں۔ بہت خوب۔'' مریم نے حیرانی سے ان دونوں کی جانب دیکھا۔ وہ دونوں اب آپس میں لڑنے لگی تھیں۔

''تمہیں جو بات کرنی ہے مجھ سے کر لو مگر مریم کے سامنے نہیں۔'' تزئین اس کے قریب آ کر بہت دھیمی آواز اور مصالحانہ انداز میں بولی، مگر نگہت نے اس کی بات کاٹ دی۔

''مریم کے سامنے کیوں نہیں، یہ بھی ہم میں سے ایک ہے، اسے بھی تو سب کچھ پتا ہے۔ اس سے یہ پردہ داری کیوں۔ دراصل تم سب لوگ بھی میری طرح دھوکے میں ہو۔ مریم وہ نہیں ہے جو یہ نظر آتی ہے۔ اس کا صرف چہرہ معصوم ہے، ورنہ اندر سے یہ بھی پوری ہے۔'' تزئین نے اس کے چہرے پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا پھر اسے بستر پر دھکا دے کر بٹھانے

والے انداز میں پٹختے ہوئے چلا کر بولی۔

"اب اگر ایک لفظ بھی تمہارے منہ سے نکلا تو میں تمہارا حشر بگاڑ دوں گی۔" نگہت نے اس کی بات سن کر عجیب سے انداز میں قہقہہ لگایا۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے سے رال ٹپکنے لگی تھی۔ تزئین اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی دیوانگی نے تزئین کو مزید چونکا دیا۔

"تم نگہت کی باتوں کو اگنور کر دو مریم! یہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے یہ نشے میں ہے۔" وہ مریم کی طرف رخ کر کے جھکی آنکھوں کے ساتھ بے حد دھیمی آواز میں بولی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں مریم! میں نے ہر بات مکمل ہوش وحواس میں کہی ہے۔ میں نشے میں نہیں ہوں۔ ایک دو پیگ چڑھانے سے مجھے اب نشہ نہیں ہوتا۔ تم میرے بجائے تزئین کی باتوں کو اگنور کرو، یہ تمہیں کبھی حقیقت نہیں بتائے گی۔ دراصل یہ بے چاری بھی میری طرح تمہیں بہت معصوم سمجھتی ہے۔"

الفاظ اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ مریم ہکا بکا ان دونوں کی شکل دیکھ رہی تھی۔ ان کی باتیں اس کے لیے پریشان کن بھی تھیں اور حیران کن بھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نگہت اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے قدموں میں آ بیٹھی۔ مریم بدک کر پیچھے ہٹی۔

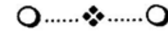
"تمہیں خدا کا واسطہ مریم! میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں نے بہت غلط کام کیے ہیں، بہت لڑکیوں کو غلط راہ پر لگایا، بہت گناہ کمائے ہیں مگر میں اللہ سے معافی مانگ لوں گی۔ تم میری راہ سے ہٹ جاؤ۔ مرتضیٰ کو مجھے واپس کر دو۔ مجھے اس سے بہت محبت ہے، سچی محبت۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں مریم!"

"تم یہ کیا کر رہی ہو نگہت! ہوش میں آؤ۔ چلو، میں تمہیں تمہارے کمرے میں چھوڑ آؤں، اٹھو یہاں سے۔ پاگل مت بنو، مریم وہی کرے گی جو تم چاہو گی۔"

تزئین ہمت کر کے آگے بڑھی اور اس کے شانوں پہ ہاتھ رکھ کر اسے کھڑا کرنا چاہا۔

"وعدہ کرو کہ مریم وہی کرے گی جو میں چاہوں گی، پہلے وعدہ کرو۔ میں جانتی ہوں مریم تمہاری ہر بات مانتی ہے۔ وہ تمہاری بہت اچھی سہیلی ہے نا۔ تم مجھ سے وعدہ کرو۔" وہ تزئین کا ہاتھ پکڑ کر نہایت التجائیہ انداز میں بولی۔ آنسو ابھی بھی اس کی آنکھوں سے بہت روانی سے بہہ رہے تھے۔

"ہاں میں وعدہ کرتی ہوں۔" تزئین نے بالآخر اسے کھڑا کیا۔ مریم نے اس کی جانب حیرانی سے دیکھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو نہایت جارحانہ موڈ میں تھی، مگر جب کمرے سے جا رہی تھی تو اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ وہ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ وہ تزئین کے ہاتھ کا سہارا لے کر کمرے سے باہر نکل گئی، جب کہ مریم تھکے ماندے انداز میں بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے ہی بیگ کھلا پڑا تھا جس میں اس نے اپنے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں رکھی تھیں۔ وہ خود کو پاتال کی گہرائیوں میں اترتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اس کے قدموں کے نیچے سے کسی نے زمین کھینچ لی تھی۔



"پاپا! آپ نے کبھی محبت کی ہے؟" اس نے ان کے کلین شیوڈ ترو تازہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ جواب میں انہوں نے بلند و بانگ قہقہہ لگایا۔ وہ کچھ خجل سا ہو گیا۔ وہ ان کے گھر ویک اینڈ گزارنے کے لیے آیا تھا اور پہلی مرتبہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان سے ان کی اور اپنی باتیں کرنے کے بجائے کسی "اور" کی باتیں کرے۔ وہ ان سے اس

پری چہرہ لڑکی کے متعلق کرید کرید کر بہت سے سوالات کرنا چاہتا تھا، مگر پھر ہمت نہیں ہو پاتی تھی۔ تھک ہار کر اس نے گھما پھرا کر یہ سوال پوچھ ہی ڈالا تھا مگر ان کے اس قہقہے نے اسے بدمزہ کر دیا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" اس نے ناک چڑھا کر سوال کیا۔ اس کے پاپا ٹانگ پہ ٹانگ چڑھاتے ہوئے مسکرائے اور ٹی وی کا چینل چینج کرنے لگے۔

"یار سنی! کبھی کبھی تم عجیب الجھا دینے والی باتیں کرنے لگتے ہو۔" مسکراہٹ ابھی بھی ان کے ہونٹوں کے کناروں پر کہیں ٹکی تھی اور یہی مسکراہٹ سمیع مرتضیٰ عرف سنی کو حوصلہ دے رہی تھی۔

"میں نے ایک سادہ سا سوال پوچھا ہے، اس میں الجھا دینے والی کیا بات ہے۔ محبت میں کچھ عجیب نہیں ہوتا پاپا! جو سمجھ نہ آ سکے۔" اس نے آرام دہ صوفہ کی بیک سے ٹیک لگائی اور دونوں ٹانگوں کو سینٹر ٹیبل پر رکھ لیا۔ اس کے پاپا اب کی بار مسکرائے۔

"ینگ مین...... آر یو اوکے...... سب خیریت ہے نا میرے بچے؟" وہ اس کے سلکی بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے لہجے میں استفسار کر رہے تھے۔ سمیع کچھ جھینپ سا گیا۔

"یس پاپا! آئی ایم فائن۔ وہ میرا دوست ہے نا زوہیب...... ہی از ان لو...... آج کل اس کی چھب ہی نرالی ہے۔ آئی سوئیر پاپا! وہ بالکل تبدیل ہو چکا ہے۔ ایسی عجیب وغریب باتیں کرتا ہے۔ آئی مین بہت پوئیٹکل لینگویج استعمال کرنے لگا ہے۔ کبھی کبھی تو بالکل پاگل لگنے لگتا ہے۔ مجھے اس کو دیکھ کر بہت حیرت ہوتی ہے۔ ایسا ممکن ہے پاپا کہ کوئی ہر وقت کسی کے تصور میں کھویا رہے۔ ہر وقت کسی اور کی باتیں کرتا رہے۔ ہر وقت کسی اور کے بارے میں سوچتا رہے؟" وہ دونوں ہاتھ سر کی پشت پر باندھے خلا میں دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ مرتضیٰ احسن نے حیرت سے اپنے بیٹے کی جانب دیکھا۔

"پاپا! آپ پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھتے ہیں۔" اس نے سابقہ انداز میں سوال کیا۔

"تم کرتے ہو؟" انہوں نے اسی کا سوال دہرایا۔

"ہاں۔" اس نے یک دم کہا پھر فوراً سنبھل کر بولا۔

"میرا مطلب ہے، میں یقین نہیں کرتا مگر زوہیب کرتا ہے۔ اس نے اس لڑکی کو ایک بار دیکھا ہے اور بس۔ وہ مسحور ہو کر رہ گیا ہے۔ جب بھی ملتا ہے، اسی لڑکی کے بارے میں بات کرتا ہے۔ ایک دم ڈفر لگنے لگا ہے۔ جس لڑکی کا نام تک نہیں جانتا، اس سے محبت کیسے ہو سکتی ہے؟" مرتضیٰ احسن نے ٹی وی کا والیوم بالکل کم کر دیا اور اس کی طرف رخ پھیر کر بولے۔

"یہ تو محبت نہیں ہوتی، کسی کو ایک بار دیکھو اور پھر اس کے سحر کا شکار ہو جاؤ۔ ارے بھئی! لڑکی سے محبت کر رہے ہو یا جادوگرنی سے۔ تم کو سمجھانا تھا اسے کہ ابھی اس کی عمر عشق ومحبت والی نہیں ہے۔ ابھی وہ صرف گرل فرینڈز سے کام چلائے۔" ان کا انداز بہت کھوجتا ہوا تھا۔ سمیع کچھ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"یس پاپا! میں اسے سمجھاؤں گا اور میں اسے سمجھاتا بھی ہوں مگر......" وہ تذبذب کا شکار ہوا۔

"مگر کیا؟" انہوں نے استفسار کیا۔

"مگر وہ نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے یقین ہے، وہ اب کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ وہ بہت آگے جا چکا ہے۔" سمیع کی آواز میں تسلسل نہیں تھا۔

"وہ لڑکی کون ہے؟" انہوں نے انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا۔

"میں نے آپ کو بتایا تو ہے وہ اس لڑکی کے متعلق بہت زیادہ نہیں جانتا۔ اس نے اسے صرف دو بار دیکھا ہے۔ ایک بار کے ایف سی میں بہت سرسری سا پھر ایک بار......" وہ بات کرتے کرتے رکا پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا "دوسری ملاقات بھی شاید کے ایف سی میں ہی ہوئی تھی۔"

وہ اب بات ختم کر کے وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے پاپا کو بھنک بھی پڑے کہ زوہیب کے پردے میں وہ ان سے اپنی یک طرفہ محبت ڈسکس کرتے ہوئے ان کے خیالات سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ اس کے پاپا اس سے بھی زیادہ چالاک تھے۔

"وہ لڑکی اس کی کلاس فیلو تو نہیں ہوگی؟" انہوں نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں، نہیں کلاس فیلو تو نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کلاس فیلوز کو میں گھاس نہیں۔ او مائی گڈنیس...... میرا مطلب......" وہ اپنا راز اپنے منہ سے اُگل چکا تھا۔ اس کے پاپا نے اس کی بات اچکی۔

"تمہارا مطلب ہے، تم نہیں، زوہیب ...... ہے نا؟" وہ اس کی حالت کا مزہ لیتے ہوئے بولے۔ سمیع بے طرح جھینپ گیا۔

"مجھ سے تم کچھ نہیں چھپا سکتے برخوردار! اب سیدھی طرح اُگل دو کہ وہ کون ہے جس نے ہمارے صاحبزادے کا یہ حال کر دیا ہے؟" ان کے انداز میں شرارت تھی۔ وہ خوامخواہ شرما سا گیا۔ شاید یہ اس کی عمر کا تقاضا تھا مگر وہ اپنے پاپا سے اتنے واضح انداز میں بات نہیں کر سکتا تھا جب کہ زوہیب کا حوالہ دے کر وہ اپنی ہر الجھن بھی دور کرنا چاہتا تھا مگر اس کی بے وقوفی نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔

"میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا پاپا! مگر آپ اپنے سری لنکا والے ٹور سے فارغ ہو لیں پھر ماہین کا نکاح ہے، اس کے بعد ہم اس بارے میں تفصیل سے بات کریں گے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ وہ جانتا تھا اس کے پاپا اپنے ہاسپٹل میں کام کرنے والی کسی معمولی نرس کو اتنی جلدی قبول نہیں کریں گے پھر ممی تو شاید اس کی شکل ہی بگاڑ دیتیں۔ اگر انہیں اس کی اس خواہش کا پتا چل جاتا۔ ابھی وہ اس کی بات کا جواب بھی نہیں دے پائے تھے کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے فون اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"ہاں...... میں ہی بات کر رہا ہوں...... ہاں ٹھیک...... تم کیسی ہو؟" انہوں نے سمیع کی جانب دیکھتے ہوئے محتاط سے انداز میں جواب دیا۔

"واٹ...... محبت؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ واٹ ربش...... نگہت! تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔ واٹ...... او کے گو ٹو ہیل۔" وہ بہت دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے، مگر پھر بھی سمیع تک آواز بخوبی پہنچ رہی تھی مگر اسے ان کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا ذہن کسی اور ہی سمت میں پرواز کر رہا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنے لیے مخصوص بیڈروم کی سمت آ گیا۔ اس کے پاپا لاؤنج میں ابھی بھی فون کان سے لگائے بیٹھے تھے۔



"میں نے نرسنگ اس لیے جوائن کی کہ میں دکھی انسانیت کی خدمت کر کے یسوع مسیح کے نیک اور پیارے بندوں میں اپنا نام لکھوانا چاہتی ہوں۔" کمرے میں گہری تاریکی تھی اور اس گہری تاریکی میں ستارہ یوسف کی آواز نے گویا روشنی سی کر دی تھی۔ مریم نے ٹھنڈی سانس بھر کر پلکیں جھپکیں تو یہ روشنی گل ہو گئی۔ اسی تاریکی میں ستارہ یوسف کا ہیولا نمایاں ہونے

لگا۔ ستارہ یوسف جب نرسنگ سکول میں آئی تھی تو اس کا حلیہ اب والی ستارہ یوسف سے بہت مختلف ہوا کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نہ جانے کون سی "دکھی انسانیت" کی خدمت کی تھی کہ دھن اس پر بارش کی طرح برسنے لگا۔

"یہ صرف اور صرف میری ضرورت ہے مریم!" اب کی بار تزئین کی آواز گونجی تھی۔ وہ برملا اس بات کا اعتراف کیا کرتی تھی کہ وہ نرسنگ کی طرف اس لیے آئی کہ اپنی امی اور بہن کے برعکس ایک پرتعیش طرز زندگی اپنا سکے۔ وہی تزئین اس کے ساتھ اس کے کمرے میں رہتی تھی۔ اس کے ساتھ والے بستر پر سوتی تھی، اس کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی تھی اور اسے کچھ پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ گندگی میں اس قدر لتھڑ چکی تھی۔

"کیا گناہ اتنا شفاف بھی ہو سکتا ہے کہ نظر ہی نہ آئے۔" مریم نے نہ جانے کس سے سوال کیا تھا۔ جب پردہ ہٹتا ہے تو ایک بھید نہیں کھلتا بلکہ کئی بھید کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ مریم کے سامنے سے پردہ تو ہٹ گیا تھا مگر کوئی بھید نہیں کھل سکا تھا۔ ہر بھید ایک نئے بھید کو جنم دیتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے بستر پر اس طرح سے لیٹی تھی جیسے صدیوں کی بیمار ہو۔ اس کو لگنے والا دھچکا اتنا شدید تھا کہ اپنی ذات ہی زلزلوں کی زد میں محسوس ہو رہی تھی۔ نگہت اور تزئین کو کمرے سے گئے کافی دیر ہو چکی تھی اور وہ ابھی تک اپنے بستر پر ساکت بیٹھی تھی۔

ڈاکٹر عادل اور تزئین، سرجن مرتضیٰ اور نگہت، روبینہ اور کامران توصیف، سرجن بخاری اور میڈیم زینت...... کیا سب ہی لوگ ایک جیسے تھے، کیا کوئی اس جیسا نہیں تھا اور اگر تھا تو نظر کیوں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اچانک ہی اپنے بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ کمرہ جو آج تک اسے اپنے گھر جیسا لگا کرتا تھا، آج اچانک جیل کے بیرک کی طرح کیوں لگنے لگا تھا۔

"کیا میں اس قدر بے وقوف ہوں کہ مجھے آج تک کچھ سمجھ میں نہ آ سکا؟" وہ ایک بار پھر خود سے سوال کر رہی تھی۔ وہ کسی اور کے پاس جا کر استفسار کر بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے نگہت اور تزئین کو اپنا دوست سمجھا تھا اور دونوں نے ہی اسے دھوکا دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، فی الفور ہر چیز کو جوں کا توں چھوڑ کر کہیں بھاگ جائے لیکن کیا اس چیز سے فرار ممکن تھا جو اس کا شوق تھا، اس کا نصب العین تھا۔

"کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟" کسی نے دروازہ کھول کر دستک دیئے بنا اجازت طلب کی تھی۔ دروازہ کھلنے سے چاندنی دبے پاؤں اندر چلی آئی تھی، مگر اس چاندنی نے دروازے میں کھڑے وجود کو مزید ناقابل شناخت بنا دیا تھا۔

"مریم! تم جاگ رہی ہو نا؟" آنے والی شخصیت نے کمرے کے عین وسط میں آ کر پوچھا اور پھر مزید چند قدم چل کر ٹیوب لائٹ آن کر دی۔ مریم کی آنکھیں لمحہ بھر کو چندھیائی تھیں، مگر پھر سب کچھ واضح ہو گیا۔ اندر داخل ہونے والی شخصیت تزئین بخاری تھی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا مریم؟" اس نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔

وہ مریم کی طرف دیکھنے سے احتراز برت رہی تھی۔ مریم نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کیا جواب دیتی، طبیعت تو اتنی اچھی صاف ہوئی تھی کہ شاید اب زندگی بھر "ٹھیک" رہتی۔

"یہ پانی پی لو۔" اسے نہ جانے کیسے خبر ہوئی کہ اس کی طلب پانی ہے۔ مریم نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے پانی کا گلاس تھام لیا۔ تزئین اس کے بستر پر ہی بیٹھ گئی۔ اس کے انداز میں شرمندگی کے ساتھ ساتھ تذبذب بھی تھا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر مریم نے پانی پی لینے کے بعد اس کی جانب ایک بار بھی نہیں دیکھا۔

"کیا تم مجھ سے کچھ بھی پوچھنا نہیں چاہتیں مریم! مجھ سے ناراض ہی ہو لو، غصہ کرو مگر اس طرح خاموش مت رہو۔"

تزئین نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر جھجکتے ہوئے کہا۔ مریم اب بھی خاموش رہی۔ اس کے وجود میں ذرا سی بھی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے تزئین کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ بھی نہیں نکالا تھا۔

''تزئین! نگہت نے جو کہا، تمہارے بارے میں اور ڈاکٹر عادل......'' ٹوٹے لہجے میں بولتی مریم اپنی بات مکمل نہیں کر پائی۔

''نگہت جھوٹ بول رہی تھی نا تزئین؟'' اس نے رک کر گہری سانس بھری اور پھر پوچھا، تزئین خاموش رہی۔ وہ مریم کی بات کی تائید کیسے کرسکتی تھی، جب کہ وہ جانتی تھی نگہت نے چند گھنٹے قبل جو کچھ کہا تھا، وہ حرف بہ حرف سچ تھا۔ نگہت نشے میں نہ ہوتی تو شاید اتنی بے باکی سے سچ بھی نہ بولتی۔

''تزئین! مجھے بتادو پلیز...... میرا دل پھٹ جائے گا۔'' مریم اس کے شانے کو ہلاتے ہوئے بولی۔

''میں نے ڈاکٹر عادل سے کورٹ میرج کرلی ہے مریم!'' تزئین نے بہت دھیمی آواز میں انکشاف کیا۔ مریم کو جھٹکا لگا۔ شاید وہ تزئین کے منہ سے یہ سب نہیں سننا چاہتی تھی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تزئین کو دیکھا۔

''میرے پاس...... اس کے علاوہ......'' تزئین نے بات ادھوری چھوڑ کر مریم کی جانب دیکھا، جو اس سے یک دم ہی دور ہٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی بڑھ رہی تھی۔

''مریم! تم میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ میں نے گناہ نہیں کیا۔ میں نے ڈاکٹر عادل سے شادی کی ہے۔ میں تمہیں بتانا چاہتی تھی مگر مجھے موقع ہی نہ مل سکا۔ دراصل تم عادل کو ناپسند کرتی ہو، یہ بات میں بہت شروع سے جانتی تھی۔ میں نے بارہا کوشش کی تمہیں سمجھانے کی، تمہیں حقیقت بتانے کی کہ عادل برے انسان نہیں ہیں مگر تم میری کوئی بات سننے پر تیار نہ ہوئیں، بس اسی لیے۔ تم خود بتاؤ مریم! میں تمہیں کس طرح یہ سب بتاتی۔ تم تو میڈم زینت کو بھی بری عورت سمجھتی تھیں۔ تم تو ان کی کسی اچھائی کو بھی ماننے کو تیار نہیں تھیں۔ حالانکہ وہ کتنی اچھی ہیں۔''

''مجھے کچھ مت بتاؤ تزئین! مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔ تم جن لوگوں کو اچھا کہہ رہی ہو، وہ سب برے لوگ ہیں۔ مجھے خود نگہت نے بتایا تھا۔'' مریم اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی اور پھر تزئین کی شکل دیکھنے لگی۔ نگہت کی آج والی حالت دیکھ کر کیا وہ اس کی کسی بات پر اعتبار کرسکتی تھی۔ نگہت آج سے پہلے اسے جو کچھ سمجھاتی رہی تھی۔ وہ سچ تھا تو آج جو کچھ وہ نشے کی حالت میں کہہ گئی تھی، وہ سب کیا تھا۔ مریم کے سامنے انہیں انتہائی شریف بنا کر کیوں پیش کرتی تھی؟ وہ کس کی بات کو سچ مانتی نگہت کی یا تزئین کی۔ یہ کیسی بھول بھلیاں تھی، جس میں وہ پھنس کر رہ گئی تھی۔

''تمہارا مسئلہ یہ ہے مریم! کہ تم ہر چیز کو اپنی آنکھ سے دیکھنے اور سمجھنے کے بجائے دوسروں کی آنکھ سے دیکھنا پسند کرتی ہو۔ نگہت کی دوستی نے تمہیں بہت سے اچھے لوگوں کی دوستی سے محروم کردیا۔ مجھے خود بھی یہ بات بہت دیر سے سمجھ میں آئی تھی اور میں تمہیں بتانا بھی چاہتی تھی مگر......'' وہ لمحہ بھر کو رکی۔

''تمہیں یاد ہے مریم! جب وقتاً فوقتاً میں کوئی ایسی بات شروع بھی کرتی تو تم مجھے خاموش کروا دیا کرتی تھیں۔ ایسی صورتِ حال میں کیا کیا جاسکتا تھا؟'' وہ جتاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تمہیں یاد ہے ایک بار تم نے نگہت کی جگہ نائٹ شفٹ میں ڈیوٹی کی تھی۔ تب تم نے خود کو کتنی بڑی مشکل میں پھنسا لیا تھا؟ تم خود بھی نہیں جانتی تھیں۔ اس دن اگر عادل اس روم میں نہ آتے تو اس حریص شخص سے کوئی تمہیں نہیں بچا سکتا تھا تم شکر کرو مریم! کہ تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اللہ نے تمہاری بہت بہت مدد کی ہے اور جن بندوں کے ذریعے اس نے یہ مدد کی

ہے تمہیں ان بندوں کا شکر گزار ضرور ہونا چاہیے۔ میڈم زینت اور عادل نے کبھی تمہارا برا نہیں چاہا مگر یہ دونوں کبھی تمہیں اچھے نہیں لگے۔ جب کہ نگہت اور سرجن مرتضٰی نے کبھی تمہارا اچھا نہیں چاہا اور وہ دونوں کبھی تمہیں برے نہیں لگے۔ غلطی تو سراسر تمہاری ہے مریم! بہت ساری گتھیاں تو خود بخود سلجھ جاتی ہیں لیکن اگر انہیں طریقے سے سلجھایا جائے تو۔ اگر تم غور کرتیں تو جان لیتیں کہ تمہیں پھانسنے کے لیے پلان بنایا گیا ہے۔ سب سینئر رینک کی نرسز کے ساتھ ایک جونیئر رینک کی اسٹوڈنٹ نرس کا کیا کام؟ مگر تم شاید......'' دروازے پر ہونے والی دستک سن کر تزئین خاموش ہوگئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا پھر تزئین نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

''تم دونوں یہاں اطمینان سے بیٹھی ہو، وہاں غضب ہوگیا ہے۔ نگہت نے خودکشی کرلی ہے۔'' دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے وارڈ بوائے نے گویا دھماکہ کیا تھا۔



''تم ٹھیک کہتے تھے حیدر! میں سچ مچ بہت بے وقوف ہوں۔'' اس نے بمشکل آنکھوں میں امڈتی نمی کو پیتے ہوئے کہا۔ دوسری جانب سے حیدر نے شگفتہ لہجے میں کچھ کہا۔ مریم لمحہ بھر کو خاموش ہوگئی پھر ریسیور کو تقریباً کان میں گھسا کر دھیمی آواز میں بولی۔

''یہ بات نہیں ہے، بس تم لوگوں کی یاد آرہی ہے۔ میں جلدی گھر واپس آجاؤں گی، بہت جلدی۔'' پی سی او کے مالک نے ساری توجہ مریم کی جانب ہی لگائی ہوئی تھی۔ آواز دھیمی کرنے والی اس حرکت کو اس نے بہت دلچسپی سے دیکھا اور پھر سیٹی بجانے لگا۔ مریم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فون پر ہی حیدر کو الف سے یے تک ہر بات بتادے اور ٹیلی فون ریسیور کو اس کا کندھا سمجھ کر زار زار رونا شروع کردے مگر وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی، اس نے عجلت میں حیدر کو خدا حافظ کہا اور پھر پیسے ادا کرکے پی سی او سے باہر نکلی اور تیز تیز قدم اٹھاتی مین گیٹ کی جانب چل دی۔ ہاسپٹل کے بالمقابل بنے اس پی سی او پر زیادہ تر نرسز یا مریضوں کے رشتہ دار ہی آیا کرتے تھے۔ مریم بھی یہیں سے گھر فون کیا کرتی تھی۔ وہ ہاسپٹل کا لان کراس کرکے اب کوریڈور کی طرف جارہی تھی۔ صبح کے نو بجے تھے۔ گیٹ نمبر 6 پر آئی وارڈ کے آؤٹ ڈور پیشنٹس کا تانتا بندھا تھا۔ پہلے جب کبھی وہ کوریڈور میں پیشنٹس کے قریب سے گزرتی تو ان کو دیکھ کر دل ہمدردی کے جذبات سے لبالب بھر جاتا، مگر آج نہ جانے کیوں دل اتنا بوجھل تھا کہ کسی ننھے مریض کو دیکھ کر دل محبت سے تڑپا نہ ہمدردی سے۔ وہ جھکے ہوئے سر اور لرزیدہ قدموں سے میٹرن کے روم کی جانب بڑھ رہی تھی۔

مریم کی آنکھوں پر کم فہمی کی عینک لگی ہوئی تھی تو ہر شخص کی آنکھوں میں صرف اور صرف عزت دکھائی دیتی تھی مگر اب جب یہ عینک اتری تھی اور ایک انوکھی مگر شرمناک حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوئی تھی تو ہر شخص کی آنکھیں ننگی تلوار کی مانند دکھائی دے رہی تھیں۔

نگہت کے انتقال نے تو اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی خودکشی سب ہی کے لیے معمہ بن کر رہ گئی تھی۔ ہر دم خوش رہنے والی۔ سینئر ڈاکٹرز اور میٹرن کی پسندیدہ نگہت کو آخر کیا غم لاحق تھا کہ اس نے اپنے آپ کو مار ڈالا اور مریم کو یہی دکھ مارے ڈال رہا تھا کہ نگہت نے اس کی وجہ سے اپنے آپ کو مار ڈالا۔ وہ شخص جسے وہ باپ کے برابر عزت دیتی تھی، وہ ایک دم سے شیطان بن گیا تھا۔

وہ نگہت کے انتقال کے فوراً بعد ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر واپس چلی جانا چاہتی تھی، مگر میڈم زینت کا خیال تھا کہ اگر

وہ اس طرح سے واپس گئی تو خوامخواہ یہ فرض کیا جانے لگے گا کہ وہ شاید نگہت کی موت کی ذمہ دار ہے کیونکہ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ نگہت کی وفاداریاں سرجن مرتضیٰ کے ساتھ تھیں اور سرجن مرتضیٰ کی نظر التفات نگہت کے بجائے اب مریم پر ہو چکی تھی۔ پہلے تو شاید مریم نے ایسی باتیں سنی بھی نہیں تھیں مگر دھیمی آواز میں ہونے والی چہ مگوئیاں بھی اب اسے بخوبی سنائی دینے لگی تھیں۔

''آیئے مریم! بیٹھئے۔'' میٹرن نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ نے مجھے بلوایا تھا؟'' مریم نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے نگہت کی موت کا بہت دکھ ہے، اچھی لڑکی تھی۔'' وہ دھیرے سے بولیں۔ مریم خاموش رہی۔

''تمہارا نگہت سے کیا جھگڑا تھا؟'' ان کا اگلا سوال مزید خطرناک تھا۔ مریم ہکا بکا ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔

''میں نے سنا ہے کہ تم دونوں کے درمیان کوئی تنازع تھا۔ نگہت اتنے کمزور اعصاب کی مالک نہیں تھی کہ کسی عام سی بات پر اپنے آپ کو مار ڈالتی جب کہ...... جب کہ وہ پریگنیٹ بھی تھی۔'' مریم ششدر بیٹھی ہوئی تھی۔

''تمہارے مرتضیٰ سے کس قسم کے تعلقات تھے۔ دیکھو مجھ سے کچھ مت چھپانا، مجھے صاف صاف بتاؤ، تب ہی میں تمہیں اس سے بچا پاؤں گی لیکن اگر تم نے غلط بیانی سے کام لیا تو تمہارے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔'' ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی مریم کی آنکھیں برسنے لگیں۔ وہ آج کل اتنی زود رنج ہو چکی تھی کہ ذرا ذرا سی بات پر رونے لگتی۔ تزئین کا ساتھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ دو روز قبل اپنے شوہر ڈاکٹر عادل کے ساتھ دمام روانہ ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر عادل نے بہت عرصہ سے وہاں اپلائی کر رکھا تھا اور اب ان کو وہاں اچھی جاب مل گئی تھی۔ میٹرن نے اس کے آنسوؤں کو خاطر میں لائے بغیر اگلا سوال کیا۔

''کیا میں سمجھ لوں کہ تمہارے اور مرتضیٰ کے......''

''نہیں میڈم! ایسا مت کہیے، ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں ایسی نہیں ہوں۔ میں تو......'' وہ ان کی بات کاٹ کر تڑپ کر بولی۔

''ہاں ہاں، میں جانتی ہوں تم بہت شریف لڑکی ہو۔ مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ اگر تمہارا اور مرتضیٰ کا کوئی سلسلہ نہیں ہے تو وہ کس برتے پر اکڑ رہا ہے۔ وہ یہ کیوں کہہ رہا ہے کہ اس کا تم پر حق ہے۔ مجھے آج کل ایک اچھی لڑکی کی بہت ضرورت ہے۔ میرے ذہن میں شروع سے تمہارا نام تھا مگر اب یہ مرتضیٰ نے نیا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ اچھا تم اب جاؤ، میں خود سنبھال لوں گی۔'' انہوں نے بے رحم لہجے میں گویا خود ہی مقدمہ شروع کیا اور خود ہی ختم کر کے فیصلہ سنا دیا۔ وہ اٹھ کر ایک بار پھر وہی مردنی چال چلتی ان کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ ابھی چند قدم چل کر مڑنے لگی تھی کہ سامنے سے اختر آتا دکھائی دیا۔

''سسٹر مریم! آپ کو سرجن مرتضیٰ یاد فرما رہے ہیں۔'' اس نے آنکھیں گھما کر شوخی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ اس کے انداز میں یہ شوخی پہلے کبھی مریم کو محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اختر کو ٹال کر آگے بڑھنا چاہا مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ اس کے اصرار پر وہ مجبوراً سرجن مرتضیٰ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کہ جب تک وہ یہاں تھی، کسی قسم کے نئے مسئلے میں الجھنا نہیں چاہتی تھی۔

''اب گھما پھرا کر بات کرنے کا وقت ہے نہ موقع۔ میں تم سے دوٹوک اور واضح بات کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک دوست

ہے جس کا بیٹا چند روز پہلے یہاں ایڈمٹ رہا ہے۔ میرے دوست کو تم پہلی نظر میں بہت پسند آئی ہو۔ میرے اس دوست کی رسائی ہیلتھ منسٹری تک ہے۔ میں اس کی اسی اپروچ کا فائدہ اٹھا کر اس ہاسپٹل کا اگلا چیئرمین بننا چاہتا ہوں۔ اس کو خوش کرنے میں ہی میری خوشی ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا۔ تمہیں اب میرا کام کرنا ہی ہوگا مریم۔'' سرجن مرتضیٰ اس کی شکل دیکھتے ہی شروع ہو گئے۔ ان کا انداز حکمیہ تھا نہ التجائیہ۔ بس ایسے جیسے کوئی بہت ہی عام سی بات کر رہے ہوں۔

''آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے سر! میں آپ کی کوئی بات......''

''ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی سسٹر مریم!'' انہوں نے اس کی بات کاٹ کر ''سسٹر مریم'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے تم سے تمہاری رضامندی نہیں پوچھی۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ تمہیں یہ سب کرنا ہوگا۔ تمہارے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہے۔ میں نے نگہت سے کہا تھا کہ تم سے طریقے سے بات کرے مگر وہ آخری دنوں میں کچھ زیادہ ہی اونچا اڑنے لگی تھی مگر تم تو سچ مچ اڑیل ٹٹو ہو مگر خیر......'' انہوں نے لمحہ بھر رک کر سانس لیا۔

''نگہت کی موت نے سارا کھیل ہی بگاڑ دیا لیکن ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ یوں سمجھو کچھ ہوا ہی نہیں۔ کل ویک اینڈ ہے۔ میرے دوست کا ڈرائیور تمہیں آ کر لے جائے گا اور ہاں......'' ایک بار پھر توقف کیا گیا۔

''تمہیں ایک اور بہت ضروری بات بتانی ہے۔ دراصل نگہت نے مرنے سے پہلے میرے نام ایک میسج چھوڑا تھا، جس میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ اس کا اور تمہارا کوئی جھگڑا چل رہا ہے اور اس کی جان کو تم سے بہت خطرہ ہے۔ یہ پیغام میرے ٹیلی فون سیٹ کے ریکارڈر میں ابھی بھی محفوظ ہے۔ اگر تم میرا یہ چھوٹا سا کام نہیں کرو گی تو میں یہ پیغام پولیس کو دے دوں گا۔ باقی تم خود سمجھ دار ہو۔''

مریم کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ اس ایک ہفتے میں مریم کو پے در پے جتنے جھٹکے لگے تھے، اس نے اس کے حواس مختل کر دیئے تھے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔



''میں...... بری لڑکی...... نہیں ہوں۔'' لفظ بہت ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکلے۔

''ہم میں سے کوئی بھی برا نہیں ہوتا۔ بس کبھی کبھی ہماری قسمت بری ہو جاتی ہے۔'' زینت آرا نے بہت محبت سے کہتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگایا۔ اس کی حالت نہایت خراب ہو رہی تھی۔ آنکھیں بے تحاشا رونے کے باعث سوج چکی تھیں۔ وہ ایسے بچے کی مانند لگ رہی تھی جس کا پسندیدہ کھلونا اس کی اپنی غلطی سے ٹوٹ گیا تھا۔ زینت مسلسل اس کے کندھے کو سہلا رہی تھیں۔ آج سے پہلے وہ جب تک اس سسٹم کو سمجھ نہیں پائی تھی تو یہی زینت آرا اسے اس سسٹم کا سب سے ناکارہ حصہ لگتی تھیں اور اب جب وہ اس سسٹم کو سمجھ گئی تھی تو زینت آرا ہی سب سے کارآمد حصہ لگ رہی تھی۔

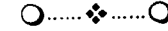
''میں نے جب تمہیں پہلی بار دیکھا، تب ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم اس جگہ کے لیے ''مس فٹ'' ہو، تم بہت معصوم ہو اور کسی قدر احمق بھی۔ بہت سی باتیں جو خود بخود سمجھ میں آنے لگتی ہیں، وہی باتیں تمہاری سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔ تم اچھے گھر کی لڑکی ہو، کوئی معاشی مجبوری بھی لاحق نہیں، اس لیے جب تم جاب چھوڑ کر نہیں گئیں تو مجھے تم پر غصہ آنے لگا اور ساتھ ساتھ تجسس بھی۔ میرا خیال تھا کہ تم لڑکیوں کی اس قسم میں سے ہو جو ایڈونچر اور تھرل میں اس فیلڈ کو جوائن کرتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے میں نے تمہاری ایک بے ضرر سی غلطی پر تمہیں وارڈ میں سب کے سامنے ڈانٹا تھا۔ میرا مقصد تمہیں دل برداشتہ کرنا تھا تاکہ تم خائف ہو کر واپس چلی جاؤ مگر تم نہیں گئیں۔'' وہ اسے ہر بات سے آگاہ کر دینا چاہتی تھیں۔

’’اس کے بعد تمہاری آنکھوں میں روز بروز میرے لیے نفرت بڑھنے لگی۔ اس کی وجہ بھی مجھے بہت جلد سمجھ میں آ گئی۔ تمہاری نگہت سے دوستی ہو چکی تھی۔ وہ سرجن مرتضیٰ کی منظورِ نظر تھی اور وارڈ میٹرن کی چہیتی۔ اس نے دونوں طرف اچھی خاصی پی آر بنا رکھی تھی۔ وہ بہت ابتدا سے نئی نرسز کو میرے اور ان بہت سے دوسرے لوگوں کے خلاف بہکا دیا کرتی جو انہیں غلط راستوں پر نہ چلنے کی تاکید کرتے تھے، پھر میں خود ہی تمہارے سامنے سے ہٹ گئی کیونکہ اگر میٹرن کو پتا چل جاتا کہ میں ’’شر‘‘ پھیلا رہی ہوں تو وہ میری نوکری کی دشمن ہو جاتی۔ میں اس نوکری کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں مریم! میری بچی کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہے۔ ایسی صورتِ حال میں، میں لڑکیوں کو نصیحت ضرور کر سکتی ہوں مگر اس کے علاوہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔‘‘

ان کی آخری بات پر مریم نے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔ اس کا ’’آخری تنکا‘‘ بھی ڈوبتا دکھائی دے رہا تھا۔

’’یہاں اور بھی بہت سے اچھے لوگ ہیں۔ سسٹم مکمل طور پر ناکارہ نہیں ہوا ابھی، مگر تمہارا کیس کچھ مختلف ہے۔ تم بہت بری طرح پھنس چکی ہو۔ لڑائی دراصل اب میٹرن اور سرجن مرتضیٰ کے درمیان ہے۔ وہ دونوں اپنے اپنے مقصد کے لیے تمہیں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ سرجن مرتضیٰ ترقی چاہتا ہے جب کہ میٹرن کو ٹرمینیشن کا ڈر ہے۔ اس سے کچھ غلطیاں ہوئی ہیں جن کی پاداش میں اسے کبھی بھی نکالا جا سکتا ہے۔ وہ دونوں اب اسی لیے ان ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں تم کسی سے جا کر شکایت کرو گی تو تمہاری بدنامی کا زیادہ ڈر ہے۔ میٹرن کو تو میں بھی سنبھال سکتی ہوں مگر سرجن مرتضیٰ تو بہت آفت شے ہے۔ اس کے تو بیوی بچے بھی اس کے ساتھ نہیں رہتے کہ ان سے جا کر بات کر لی جائے۔‘‘

زینت آرا خود بھی اس الجھن کی سلجھن ڈھونڈنے میں ناکام ہو گئی تھیں مگر مریم ان کی آخری بات پر قدرے چونکی۔ اس کے ذہن میں اس مسئلے کا ہلکا سا حل نظر تو آیا تھا۔ ماہین مرتضیٰ لڑکی تھی اور اس کے مسئلے کو بخوبی سمجھ سکتی تھی۔



کال بیل بجانے کے بعد وہ بے صبری سے دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ علامہ اقبال ٹاؤن میں واقع یہ چھوٹا مگر نہایت خوبصورت گھر سرجن مرتضیٰ کی بیوی کا تھا۔ مریم کو یہ گھر ڈھونڈنے میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔ اس نے پہلے فون کر کے گھر کی ملازمہ سے ایڈریس سمجھا تھا اور پھر وہ زینت آرا کے ساتھ یہاں تک چلی آئی تھی، مگر زینت آرا گھر کے اندر جانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ وہ ڈاکٹر عادل کی وجہ سے سرجن مرتضیٰ کی اہلیہ سے ایک آدھ بار مل چکی تھیں کیونکہ ڈاکٹر عادل ان کی اہلیہ کے فرسٹ کزن تھے۔

’’ان دونوں میاں بیوی کے درمیان علیحدگی بھی دراصل ڈاکٹر عادل کی وجہ سے ہوئی تھی۔ جن دنوں ڈاکٹر عادل نے اس ہاسپٹل میں اپنا ہاؤس جاب شروع کیا، ان ہی دنوں سرجن مرتضیٰ فارن سے اسپیشلائزیشن کر کے لوٹے تھے۔ سرجن مرتضیٰ کا ذہن شروع سے ہی کچھ مغربی اپروچ رکھتا تھا۔ ان کا چال چلن ابتدا سے ہی مشکوک تھا جسے وہ اپنی شاندار پرسنیلٹی سے کیموفلاج کر کے رکھتے تھے۔ ڈاکٹر عادل نے ان کی وائف سے بس دو ایک افیئرز کی داستانیں کہہ ڈالیں، جن کی بنا پر ذرا سا تنازع طلاق تک جا پہنچا۔ ان حضرت نے طلاق دینے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ بے چاری شریف عورت بچے لے کر الگ ہو گئیں۔ اب تو خیر اپنا کوئی بھلا سا بزنس چلا رہی ہیں۔‘‘ زینت آرا نے اسے بہت تفصیل سے سرجن مرتضیٰ اور ان کے گھریلو حالات کا قصہ سناتے ہوئے بتایا تھا۔

’’جی...... آپ کو کس سے ملنا ہے؟‘‘ دروازہ کھلنے کے بعد آواز پہلے سنائی دی تھی اور شکل بعد میں نظر آئی۔ وہ جو کوئی بھی تھیں، کافی پُرنور چہرے والی خاتون تھیں۔ ہلکے فیروزی شلوار قمیص میں سفید کڑھائی والا دوپٹہ اوڑھے شاید جائے نماز سے ہی

اٹھ کر آ رہی تھیں۔

’’مجھے...... وہ...... مسز مرتضیٰ...... ماہین سے...... میرا مطلب ماہین مرتضیٰ سے؟‘‘ ان کی کھوجتی آنکھوں نے مریم کو گڑبڑا دیا۔

’’ماہین بیٹا سے؟ تم کون ہو بیٹی! ماہین کی کوئی نئی دوست ہو؟‘‘ انہوں نے دروازہ پورا وا کر کے استفسار کیا۔ گویا اندر آنے کی اجازت بھی دی تھی اور ساتھ ہی ساتھ انکوائری بھی کر رہی تھیں۔

’’جی...... جی میری ان کی زیادہ پرانی دوستی نہیں ہے۔‘‘ وہ ان کے پیچھے چلتے ہوئے بول رہی تھی۔ انہوں نے اسے جس کمرے میں لا کر بٹھایا وہ دیکھنے میں ٹی وی لاؤنج لگ رہا تھا۔ دو ایک دروازے دکھائی دے رہے تھے اور عین درمیان سے سیڑھیاں بھی اوپر جاتی نظر آ رہی تھیں۔ مریم ان کے اشارے پر صوفے پر بیٹھ گئی۔ دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ جو بات وہ ماہین سے کرنے آئی تھی، اگر ماہین اس پر یقین نہ کرتی تو پھر مریم کے پاس کوئی جائے پناہ نہیں بچتی۔

’’تمہاری اور اس کی پرانی دوستی ہوتی تو یقیناً وہ تمہیں اپنی شادی پر ضرور بلاتی اور تمہیں پتا ہوتا کہ دو روز قبل اس کی شادی ہو چکی ہے۔‘‘ انہوں نے بہت اطمینان سے اس کا اطمینان غارت کیا۔

’’شادی......؟ مم...... مگر...... کچھ روز قبل...... وہ ملی تھی، تب تو اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔‘‘ مریم نے بے حد پریشانی کے عالم میں کہا۔ چاہنے کے باوجود بھی وہ گھبراہٹ پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ ان خاتون نے اس کے انداز کو بغور دیکھا پھر گہری سانس بھر کر بولیں۔

’’ارے بس، یہی تو ملال ہے۔ ہر کام جلدی میں کر دیا بڑی بیگم نے۔ بچی کے دل میں کتنے ہی ارمان تھے مگر بڑی بیگم کو نہ جانے کیا خدشات لاحق تھے۔ فون پر بس ثوبان بیٹے کی آواز سنائی دی۔ یہاں ہمیں بیٹھے بیٹھے بتا دیا کہ مبارک ہو، نکاح ہو گیا ہے۔ اگلے دن بچی کو جہاز پر چڑھا آئیں کہ جاؤ اپنے میاں کے پاس رہو، وہی تمہیں سنبھال سکتا ہے۔ بڑی بیگم کسی بات کی ٹھان لیں تو پھر کوئی طاقت انہیں نہیں روک سکتی۔ بچی کو لال جوڑا پہننے دیا نہ سنگھار کرنے دیا۔ خیر تم بتاؤ، خیریت سے آئی تھیں۔ آج کل روز ہی فون کر رہی ہے۔ کہتی ہے، اماں بی! میرا دل نہیں لگ رہا۔ بے چاری وہاں اتنی اداس ہے اور یہاں اماں جان اور بھیا کو پروا ہی نہیں۔ تم بتاؤ، کوئی پیغام ہے تو میں پہنچا دوں گی۔ خوش ہو جائے گی۔‘‘ وہ ماہین کو یاد کر کے سچ مچ آبدیدہ ہو رہی تھیں۔ مریم کے جسم سے جان نکلتی جا رہی تھی۔ ماہین کے نام پیغام تو بہت اہم تھا مگر وہ یہ پیغام دے نہیں سکتی تھی۔

’’پانی، وانی لاؤں تمہارے لیے۔ ٹھہرو، میں تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں۔‘‘

انہیں شاید بہت دن بعد کوئی جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے دستیاب ہوا تھا۔ وہ بات مکمل کر کے کچن کی سمت چل دیں۔ مریم نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی، کیونکہ اسے حقیقتاً بہت پیاس لگ رہی تھی۔ ان کے جانے کے بعد بھی وہ اپنے ہاتھوں کو تکتی رہی۔ قسمت اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی خوفناک مذاق کر رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا سب چھوڑ چھاڑ کر گھر بھاگ جائے پھر اس کے سارے ڈاکیومنٹس جو ایڈمیشن کے وقت رکھ لیے گئے تھے، الاؤنس میں ملنے والی رقم جو مریم کے لیے تو صرف پاکٹ منی تھی، مگر بہت سی لڑکیوں کے لیے وہ ان کے گھر میں آنے والی واحد کمائی تھی۔ ابتدا میں لیا جانے والا وہ حلف، سرجن مرتضیٰ کی دھمکی، پولیس کا خوف اسے نہ جانے کیا کیا چیز ڈرا رہی تھی۔ اسے بیٹھے بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ دھیرے سے گنگنانے کی آواز آئی جو لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہی تھی۔ یقیناً کوئی گنگناتا ہوا سیڑھیاں اتر کر آ رہا تھا۔

مریم مزید چوکنا ہوکر بیٹھ گئی۔ اپنی سیاہ چادر کو اس نے کانوں کے قریب سے مزید آگے کی طرف سرکا لیا۔ حالانکہ جو کوئی بھی تھا، اس کی پشت کی طرف تھا۔ چند لمحے بعد مریم نے ایک لمبے مگر دبلے پتلے لڑکے کو اپنے عقب سے ہوکر اسی سمت میں جاتے دیکھا جہاں وہ عمر رسیدہ خاتون تشریف لے گئی تھیں۔ اسے ان دونوں کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔

''تمہیں وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھے گھر کی بچی لگتی ہے، کیسے اپنے آپ کو ڈھک کر بیٹھی ہے کیا پتا تمہاری موجودگی پسند نہ کرے۔'' انہی خاتون کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ ماہین کی نانی تھیں مگر وہ ماہین کی والدہ کے لیے بڑی بیگم کا لفظ استعمال کر رہی تھیں۔ مریم ان کے اور ماہین کے رشتے کے متعلق زیادہ نہیں جان پائی تھی۔

''یہ بھی خوب کہی آپ نے۔ میں آپ کو ایسا لڑکا لگتا ہوں اور مجھے دیکھتے ہی ان کی ٹینٹ نما چادر میں شگاف پڑ جائیں گے۔ حد کرتی ہیں آپ بھی اماں بی! محترمہ کے بارے میں اچھی طرح سے چھان بین بھی کی ہے کہ نہیں۔ کون ہیں، کہاں سے تشریف لائی ہیں، کس مقصد سے تشریف لائی ہیں؟'' وہ شاید جان بوجھ کر اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ ''اماں بی'' کے نام سے پکاری جانے والی خاتون نے کیا جواب دیا، مریم سن نہیں پائی۔

''واٹ، ماہین کی سہیلی......؟ اماں بی! محترمہ بنا رہی ہیں آپ کو۔ اللہ معافی، میں نے تو ساری زندگی ماہین کی ایسی کوئی سہیلی نہیں دیکھی۔ اتنی دقیانوسی تو اس کی سہیلی کی دادی بھی نہیں ہوں گی۔ دیکھو ذرا لاؤنج میں بھی اس طرح ٹینٹ اوڑھ کر بیٹھی ہیں، جیسے کسی کے چہلم میں دعا مانگ رہی ہوں۔ ارے اماں بی! مجھے تو یہ فراڈ لگ رہی ہیں۔ ماہین کی سہیلیاں ایسی نہیں ہیں۔'' وہ تیز تیز بول رہا تھا۔ مریم کا دل چاہا وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے۔

''اچھا اب یہ اپنی بک بک بند کرو۔ سنی بیٹے! ہر ایک کو شکی نگاہ سے مت دیکھا کرو۔ میں دیکھ رہی ہوں چند دن سے بہت بدلے بدلے دکھائی دیتے ہو۔ ارے میرے بچے ہنستے کھیلتے اچھے لگتے ہو۔ شکر کرتی ہوں کہ اب بڑی بیگم سے بھی زبان درازی نہیں کرتے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بے وجہ بولتے چلے جاؤ۔''

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد وہی خاتون اس کے سامنے ایک ٹرے میں جگ اور گلاس لیے کھڑی تھیں۔ مریم نے بس ایک نظر ان کی جانب دیکھا اور پھر دوبارہ سے اپنے ہاتھوں کو تکنے لگی، کیونکہ وہ لڑکا بھی لاؤنج میں آکر اس کے بالکل سامنے بیٹھ گیا تھا۔ مریم نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا مگر شارٹس میں ملبوس ہونے کی وجہ سے اس کی گھٹنوں تک برہنہ ٹانگوں پہ ایک نظر ضرور پڑی تھی۔ اس کے بعد اس نے دوسری نظر نہیں ڈالی، مگر خود اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس لڑکے کی گھورتی ہوئی نگاہوں کا مرکز ہے۔

''پانی پی لو بیٹی!'' شربت سے بھرا ایک گلاس اسے انہی شفیق لہجے والی خاتون نے پکڑایا۔

''نہیں، اب میں چلتی ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے بیٹھا وہ لڑکا بھی ہڑبڑا کر اٹھا۔

''آ...... آپ...... بیٹھیے تو...... سہی...... پلیز......'' اس نے عاجزی سے کہا۔ اس کا لہجہ یک دم ہی بدلا تھا۔ مریم نے بہت دقت سے اس کی جانب دیکھا۔ نہ جانے کیوں اس لڑکے کے انداز نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس کے گورے رنگ پر بڑھی ہوئی شیو، ننھی ننھی چیونٹیوں کی مانند لگ رہی تھی۔ اس کے بال بے حد چکنے ہو رہے تھے اور اس نے انہیں پیچھے باندھ رکھا تھا۔ مریم کو یاد آیا کہ یہ لڑکا اس نے شاید پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔

''آپ ماہین کی فرینڈ ہیں؟ آپ کو پہلے تو کبھی ماہین کے ساتھ نہیں دیکھا۔ آپ...... آپ تو شاید نرس ہیں نا۔ میرا

مطلب آپ جاب کرتی ہیں نا؟''

وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ مریم نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی خوشی اور اشتیاق پھیلا ہوا تھا۔ اماں بی نے بھی کسی قدر حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ لفظ ''نرس'' پر وہ بے طرح چونکی تھی۔

''ہیں بیٹا! تم نرس ورس ہو کیا؟ ماہین سے کہاں ملاقات ہو گئی تھی تمہاری؟'' جن شکوک کا اظہار وہ لڑکا کچن میں کر رہا تھا، اماں بی ان شکوک کا شکار اب ہونے لگی تھیں۔

''اماں بی! آپ پہلے انہیں پانی تو دیجیے۔'' اس نے اماں بی سے کہا اور پھر ان کا انتظار کیے بغیر خود اٹھ کر گلاس اسے پکڑا دیا۔

''آپ پلیز کولڈ ڈرنک پیجیے۔ بائی دا وے، آپ نے مجھے پہچانا۔ آئی ایم سمیع...... آپ میرے پاپا کے ہاسپٹل میں ہی ہوتی ہیں نا...... میں بلڈ ڈونیشن کے لیے آیا تھا۔ آپ کا نام مریم ہے نا؟'' وہ لہجے میں بے پناہ چاہت سموئے کہہ رہا تھا۔ اس کے انداز لمحہ لمحہ مریم کو مزید محتاط کر رہے تھے۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ لڑکا جانا پہچانا کیوں لگ رہا ہے۔ یہ وہی لڑکا تھا، جسے ''لطیفہ'' سمجھ کر اس نے تزئین کو بہت شوق سے سنایا تھا۔

''آپ کو یاد آیا...... ہم پہلے مل چکے ہیں نا؟'' وہ امید کا ایک جہان آنکھوں میں بسائے پوچھ رہا تھا۔ مریم نے بمشکل مسکرانے کی کوشش کی۔

''مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ آپ ماہین کی دوست ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ سرجن مرتضیٰ کا بیٹا تھا مگر ان کی نسبت وہ کسی قدر معصوم دکھائی دیتا تھا۔ اس کے انداز میں بچپنا بہت زیادہ تھا۔ مریم نے آدھا گلاس اسکواش پینے کے بعد اسے میز پر رکھ دیا۔

''مجھے جانا ہے۔'' اس نے بس یہی کہا تھا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ پلیز ابھی مت جائیے۔'' وہ لڑکا اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''نہیں، مجھے بہت کام ہے۔''

اس نے عجلت میں کہا اور پھر خود ہی باہر کی سمت چل دی۔ سمیع عرف سنی اس کے پیچھے پیچھے تھا جب کہ اماں بی وہیں صوفے پر بیٹھی حیران پریشان ان دونوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ مریم کا انداز تو حیران کن تھا ہی، سنی کا انداز حیران کن ''ترین'' تھا۔



''اماں بی! میں کیسا لگ رہا ہوں۔'' اس نے قدِ آدم آئینے میں اپنے سراپے کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے ان سے دریافت کیا۔ وہ چند منٹ قبل اس کے بیڈ روم میں اسے کھانے کے لیے بلانے آئی تھیں مگر اب اس کی سج دھج دیکھ کر حیران کھڑی تھیں۔ سیاہ ڈنر ٹو پیس میں اپنی لہراتی زلفوں کو اس نے بلو ڈرائی کر کے کندھوں پہ پھیلا رکھا تھا۔ اپنے پارلر سے وہ خاص طور سے آج فرنچ کٹ بنوا کر آیا تھا۔ اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ وہ فرنچ کٹ میں بہت ڈیسنٹ اور مرد لگتا ہے۔ وہ ویسے بھی اپنی ''لڑکوں'' والی لک سے تنگ تھا۔ اس کا ذاتی خیال تھا، لڑکیاں لڑکوں کے بجائے مردوں کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔

''میں ڈیشنگ لگ رہا ہوں نا اماں بی!'' اس نے Eternity کی بوتل اٹھا کر اپنے اوپر خوب اسپرے کرتے ہوئے پھر پوچھا۔

''ارے بیٹا!!اس وقت اتنی خوشبو لگائے کدھر جا رہے ہو۔تمہارے بالوں سے تو میں بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ کسی جن بھوت نے پشت سے دیکھ لیا تو عاشق ہونے میں لحہ بھر ہی لگے گا بیٹا!'' اماں بی کو کافی سے زیادہ حیرت ہو رہی تھی۔

اماں بی کی بات پر اس نے زبردست قہقہہ لگایا جو کہ اس کے اچھے موڈ کی غمازی کر رہا تھا۔

''میں ایک پری کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہا ہوں، جن بھوت کا چانس ہی نہیں بنتا۔آپ فکر مت کیجئے۔'' وہ پلٹ کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوا پھر اپنا سیل فون اٹھایا، گاڑی کی چابی اٹھائی۔آئینے میں خود کو ایک بار پھر دیکھا اور دروازے کی سمت بڑھا مگر ایک دم سے دوبارہ پلٹ کر آیا اور اماں بی کے قریب آکر ان کی گردن میں بانہیں حمائل کرتے ہوئے پیشانی کو چوما۔

''اماں بی! پلیز پلیز ممی کو نہیں بتائیے گا۔'' وہ سفارشی انداز میں کہہ رہا تھا پھر ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا۔''یہ حادثاتی ڈیٹ'' تو اس کی زندگی میں بغیر کسی منصوبہ بندی کے آئی تھی۔آج دوپہر کو ماہین کی کسی دیرینہ سہیلی کی صورت میں اس مہربان پری کو دیکھ کر وہ حیران و پریشان ہو گیا تھا۔ایسا تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ لڑکی جس کے عشق میں وہ گوڈے گوڈے ڈوب چلا ہے، خود چل کر اس کے گھر آسکتی ہے۔اس کی تو گویا لاٹری نکل آئی تھی مگر مریم نے شاید اس کے اور اماں بی کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو سن لی تھی، تب ہی وہ کافی کنفیوز دکھائی دے رہی تھی۔سمیع کو پہلی مرتبہ اپنی بڑبولی طبیعت پر غصہ آیا۔وہ اپنے رویے کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔سمیع اسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔

''آپ...... ماہین کے بھائی ہیں؟'' اس نے اچانک پوچھ لیا تھا اور سمیع نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''سگے بھائی؟'' مریم نے ایک اور سوال پوچھا۔

''جی......ایک دم سگا بھائی۔'' سمیع نے لہجے میں شرارت سموئی تھی۔

''مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے مگر یہاں پر نہیں۔'' اس نے گردن جھکا کر بہت دھیمی آواز میں کہا۔سمیع کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔بات تو اسے بھی کرنا تھی۔

''پھر کہاں پر......کسی ریسٹورنٹ میں......میں آپ کو پک کر لوں گا۔'' اس نے فٹافٹ پروگرام ترتیب دیا۔بات ڈنر پر منتج ہوئی۔سمیع نے مریم کا ایڈریس وغیرہ سب پہلے ہی حاصل کر لیا تھا بلکہ وہ تو دو تین مرتبہ ہاسپٹل جا کر اسے دیکھ بھی چکا تھا۔عشق کا بھوت اس کے سر پر سوار تھا، ہی لیے اب وہ سج دھج کر نئی آن بان سے گھر سے نکلا۔اس کی ذاتی گاڑی نہیں تھی مگر وہ اپنے پاپا کی گاڑی مانگ کر لایا تھا۔ہوٹل کا بل ادا کرنے کے لیے کچھ اپنی پاکٹ منی تھی اور کچھ ممی سے منت سماجت کر کے حاصل کی تھی۔اس کی جیب میں ٹھیک ٹھاک رقم سے بھرا والٹ، موبائل فون اور بہترین برانڈ کی سگریٹ کی ڈبیا بھی تھی۔ایک دوست نے کسی اچھے وقت میں یہ گر کی بات بتائی تھی کہ لڑکیاں سگریٹ پینے والے لڑکوں کو بہت پسند کرتی ہیں۔وہ بہت دھیمی رفتار سے ڈرائیو کر رہا تھا کیونکہ جو ٹائمنگ سیٹ ہوئی تھیں، اس کے مطابق ابھی کچھ وقت باقی تھا اور پھر ابھی اسے مریم کے لیے کیک بھی لینا تھا۔



''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے زینت آپا! میں کیا کروں۔مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' اس نے تقریباً روتے ہوئے زینت آپا سے فریاد کی۔وہ جب سے سرجن مرتضیٰ کی اہلیہ کے گھر سے آئی تھی اسی ایک فقرے کی گردان کر رہی تھی۔زینت آرا خود سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ اس کی مدد کریں تو کیسے کریں۔میٹرن کو تو انہوں نے مریم کی جھوٹی سچی رشتہ داروں کے متعلق بنا کر کسی

قدر محتاط کر دیا مگر سرجن مرتضیٰ کا وہ کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔تھک ہار کر یہی حل نظر آرہا تھا کہ ان کے نوعمر بیٹے کو ساری صورت حال سے آگاہ کر کے مدد مانگی جائے۔مریم اس سے ملاقات کا وقت تو طے کر آئی تھی مگر اب الجھن میں پڑی تھی کہ اس لاابالی لڑکے کو بتائے تو کیا بتائے۔

''اسے میری بات سمجھ میں ہی نہیں آئے گی اور سمجھ میں آ بھی گئی تو وہ میری بات کا یقین نہیں کرے گا۔وہ بدھو سا لڑکا ہے، میں اسے کیسے یہ سب بتاؤں گی۔'' اس نے پھر کہا۔اس کی آنکھیں روتے رہنے کے باعث بہت سرخ ہو رہی تھیں اور گوری رنگت پر یہ سرخ آنکھیں اس کے حسن کو مزید دو آتشہ کر رہی تھیں۔

''تمہارے پاس یہ ایک آخری موقع ہے۔اس کو بھی گنوا دو گی تو پھر کیا کرو گی۔اچھا چلو میرے کہنے پر ایک بار اس سے بات کر کے تو دیکھو۔'' انہوں نے سرجن مرتضیٰ کے بیٹے کے بارے میں ڈاکٹر عادل سے کافی کچھ سن رکھا تھا۔انیس سالہ سمیع مرتضیٰ اپنے باپ سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتا تھا۔مریم ان کے کہنے پر بمشکل اٹھی۔منہ ہاتھ دھونے اور بال باندھنے میں اسے بمشکل دس منٹ لگے تھے۔وہ اپنی سیاہ چادر اوڑھ کر تیار ہو گئی تھی۔سوا سات کے قریب اسے بلاوا مل گیا تھا۔

''آپ کے مہمان آئے ہیں۔'' وہ زینت آرا کی طرف یاس بھری نگاہ ڈالتی باہر کی سمت چل دی۔

''سمیع مرتضیٰ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولے باہر ہی کھڑا تھا۔اس کی ''تیاری'' دیکھ کر مریم کو عجیب سی الجھن ہوئی۔وہ ''ولیمے کا دولہا'' لگ رہا تھا۔اس کی طرف دیکھ کر وہ بشاشت سے مسکرایا مگر پھر آنکھوں میں الجھن آمیز مایوسی نے ذرا کی ذرا جھلک دکھائی۔اس نے مریم کو سر سے پیر تک بغور دیکھا تھا۔اس کے ہاتھوں میں وائٹ للی کا بوکے تھا۔

''میں لیٹ تو نہیں ہوا نا؟'' گاڑی کے بالکل قریب پہنچنے پر اس نے پوچھا۔مریم نے صرف نفی میں گردن ہلائی اور پھر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں سے وہ بوکے تھام لیا۔

اس نے خود مریم کے لیے گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھایا۔اپنی نشست سنبھالنے کے بعد اس نے سب سے پہلے کیسٹ پلیئر آن کیا۔ایک انگلش نمبر دھیمی سی آواز میں بجنے لگا۔اس نے بہت تیز پرفیوم لگا رکھا تھا۔

''ایک بات پوچھوں؟'' سمیع نے سگنل پر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔مریم کو اس کے انداز پہلے ہی کچھ چونکا رہے تھے۔اس سوال نے اسے مزید چونکایا۔

''آپ ہمیشہ اتنی بڑی بیڈ شیٹ......میرا مطلب اتنی بڑی چادر لے کر باہر نکلتی ہیں؟'' مریم نے اس کی جانب دیکھا، جہاں کسی قدر خفت کی سرخی نمایاں تھی۔وہ اس پر طنز نہیں کر رہا تھا، مگر اس کے حلیے سے عجب سی تذبذب میں گھرا ہوا ضرور نظر آرہا تھا۔

''آئی ایم سوری......پلیز آپ میری بات کا غلط مطلب مت لیجئے گا۔آپ اس طرح بھی بہت اچھی لگ رہی ہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔مریم خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی۔باقی کا راستہ خاموشی سے کٹا۔وہ دل ہی دل میں الفاظ ترتیب دیتی رہی۔

گاڑی ایک وسیع و عریض ہوٹل کے سامنے جا رکی تھی۔مریم نہیں جانتی تھی، وہ کون سا ہوٹل ہے مگر اس کے باہر ایک بڑا سا پارکنگ لاٹ اور وہاں گاڑیوں کی لمبی قطار ثابت کر رہی تھی کہ کوئی شاندار جگہ ہے۔سمیع نے پارکنگ لاٹ میں بڑی مشکل سے جگہ حاصل کی تھی، لیکن جب دروازہ کھول کر باہر اترنے کی باری آئی تو مریم نے گھبرا کر کہا۔

''مم......میں اندر نہیں جاؤں گی۔ہم یہیں بات کر لیتے ہیں۔''

''آپ اتنا گھبرا کیوں رہی ہیں مریم! اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ اطمینان سے بات کریں گے۔ فکر مت کیجئے، میں آپ کو کھا نہیں جاؤں گا۔'' اس کے لہجے میں شوخی در آئی۔ اس شوخی کا مفہوم مریم کے لیے قطعاً ناقابلِ فہم تھا۔ وہی خوف جو اس کے دل میں سرجن مرتضیٰ کے حوالے سے تھا، ایک دم ہی سمیع مرتضیٰ سے ویسا ہی خوف محسوس ہوا۔

''نہیں، آپ واپس چلیے۔ پلیز آپ واپس چلیے۔'' مریم نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ سمیع نے الجھ کر اس کی جانب دیکھا۔

یہ کیسی ڈیٹ تھی جس میں لڑکی نے ایک بار بھی مسکرا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا، اس کی تیاری کی تعریف کی تھی نہ ہی اس کے لائے ہوئے پھولوں کو سراہا تھا۔ وہ تو گھر سے نہ جانے کتنے پلان بنا کر آیا تھا مگر یہاں تو سب کچھ الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔

''لڑکیاں نخرے بہت کرتی ہیں۔ آرام سے کبھی اپنے دل کی بات نہیں کہتیں۔ ایک لڑکی آئی لو یو کہنے میں جتنا وقت لیتی ہے، ایک لڑکا اتنی دیر میں کسی دوسری لڑکی سے شادی کر کے ابا جان بھی بن چکا ہوتا ہے۔'' اسے کاشف نے یہ بات خاص طور سے بتائی تھی۔ سمیع نے گہری سانس بھر کر مزید کوئی استفسار کیے بغیر گاڑی واپس موڑ لی۔ اسے کاشف کی بات کا یقین آتا جا رہا تھا۔ وہ چاہ رہا تھا مریم کچھ تو بولے کہ بہرحال یہ ''ڈیٹ'' اس کے کہنے پر ارینج کی گئی تھی، مگر وہ خاموش تھی بادل نخواستہ وہ بھی خاموش تھا۔ گاڑی اس نے دوبارہ وہیں جا کر روکی، جہاں سے مریم کو پک کیا تھا۔ مریم اب بھی گاڑی میں ہی بیٹھی رہی۔ اپنی انگلیوں کو مروڑتی وہ عجب کشمکش میں گھری تھی۔

''مجھے...... آئی ایم سوری...... میں نے آپ کا قیمتی وقت...... ضائع کیا۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بات کر رہی تھی۔

''اوہ کم آن مریم! میں پریذیڈنٹ نہیں ہوں کسی ملک کا، اور میرا وقت بھی بالکل قیمتی نہیں ہے۔'' اس نے سر جھٹک کر کہا۔ مریم نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے نقوش میں سرجن مرتضیٰ کی شباہت تھی۔ وہ ماہین مرتضیٰ کی طرح باتونی نہیں تھا بلکہ وہ کسی قدر معصوم اور کھلنڈرا سا لڑکا لگتا تھا۔ مریم اس سے اس کے والد محترم کے بارے میں کیسے بات کرتی۔

''میں جانتا ہوں آپ کو مجھ سے کوئی بات کرنی ہے۔ ان فیکٹ بات تو مجھے بھی کرنی ہے۔ اینڈ آئی ایم شیور، ہمیں ایک دوسرے سے ایک ہی بات کرنی ہے۔ مجھے بھی آپ ہی کی طرح...... یو نو...... میں بھی تھوڑا...... کانشس ہو رہا ہوں۔'' وہ کندھے اچکا کر مسکراتے ہوئے بولا۔ مریم نے پوری آنکھیں وا کر کے اس کی جانب دیکھا، وہ کیا کہنے والا تھا۔

''آپ کچھ مت کہیے، میں بھی کچھ نہیں کہتا۔ بس مجھے اتنا بتا دیجئے کہ آپ میرے اسٹیبلش ہونے کا انتظار کر لیں گی؟'' اس نے آخری بات بہت تیزی سے کہی۔ مریم اس نئی افتاد پہ حیران پریشان ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''ویسے تو ممی کی سب دولت میری ہے، پاپا کا بھی سب کچھ میرا ہے لیکن پھر بھی میں ابھی شادی نہیں کر سکتا۔'' وہ مزید کہہ رہا تھا۔ اس سے زیادہ سننے کی مریم میں ہمت نہیں تھی۔ وہ بے وقوف سا لڑکا بات کو کہاں سے کہاں لے گیا تھا۔

''آپ...... آپ میری بات سمجھے نہیں۔'' اس نے وضاحتی انداز میں لب کھولے، مگر پھر بھی کچھ کہہ نہ پائی۔ لاتعداد آنسو پلکوں کی باڑ توڑنے کو بے تاب تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونا شروع کر دیا اور لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے نکلنے لگے۔ اب بھی وہ خاموش رہتی تو نہ جانے مزید کیا نقصانات ہوتے۔

سسکیوں کے درمیان اٹک اٹک کر وہ اسے سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

''آپ جھوٹ بول رہی ہیں، بکواس کر رہی ہیں آپ!'' سمیع مرتضیٰ نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چلا کر کہا۔ اس کا چہرہ بے انتہا سرخ ہو رہا تھا۔ یقیناً وہ ضبط کی آخری منزل پہ تھا۔



''مے آئی کم ان پاپا!'' اس نے ذرا سی گردن دروازے سے اندر کرتے ہوئے اجازت طلب کی۔ مرتضیٰ احسن کسی ایکسرے رپورٹ کو دیکھ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر بے طرح چونکے فوراً گھڑی کی جانب نظر کی۔

اس وقت تو وہ کبھی بھی ان سے ملنے ہاسپٹل نہیں آتا تھا۔

''آؤ ینگ مین، اندر آ جاؤ۔ تمہیں کب سے اجازت کی ضرورت پڑنے لگی۔'' انہوں نے بشاش لہجے میں کہا۔ سمیع کمرے میں داخل ہو گیا۔ انہوں نے حیرانی سے اس کے حلیے کا جائزہ لیا۔ اس نے خود کو اس حلیے میں ڈھالنے کے لیے یقیناً ٹھیک ٹھاک محنت کی تھی۔

''بہت ہینڈسم لگ رہے ہو۔'' انہوں نے مسکرا کر اس کی تعریف کی مگر وہ مسکرایا تک نہیں۔ اس کی آنکھوں میں ناقابلِ فہم قسم کے تاثرات تھے۔ وہ خاموشی سے ان کے مقابل بیٹھ گیا۔

''ماہین کے نکاح کا فنکشن کیسا رہا۔ سنا ہے تمہاری ممی نے بہت رقم خرچ کی ہے۔ جھوٹے منہ ہمیں بھی انوائٹ کر لیتیں۔ ان کے خزانے میں کوئی کمی تو واقع نہ ہوتی اور پھر ماہین کو دیکھو، جاتے ہوئے ایک بار مجھ سے مل ہی لیتی مگر وہ بھی اپنی ممی کی طرح مجھے کچھ خاص پسند نہیں کرتی۔'' وہ شکوہ کناں انداز میں کہہ رہے تھے۔ سمیع نے ان کی بات کی تائید کرنے کے بجائے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اس کے اندر اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ مریم چوہدری نے اسے جو کچھ بتایا تھا، وہ بہت شرمناک تھا۔ اس کے پاپا کے بارے میں اس کی ممی کی رائے ہمیشہ ہی کچھ مشکوک رہی تھی۔ عادل بھائی سے اس نے کئی مرتبہ اپنی ممی اور پاپا کے بیچ موجود اصل تنازعے کی بابت پوچھا مگر انہوں نے بھی اسے ہمیشہ ٹال دیا تھا۔

''تمہاری ماں میں بہت برداشت ہے بیٹا! مگر کچھ باتیں عورت کبھی برداشت نہیں کرتی۔''

اماں بی نے ایک بار اس سے کہا تھا اور تب وہ ان کی بات بالکل بھی نہیں سمجھا تھا۔ اس کے پاپا اتنے قابل، اتنے ڈیشنگ، انتہائی شاندار انسان تھے۔ ان میں کوئی ایسی خامی نہیں تھی جسے ناقابلِ برداشت کہا جاتا۔ وہ آج تک اپنی ممی کو ہی ناقابلِ برداشت سمجھتا تھا جو انتہائی جذباتی عورت تھیں۔ انہیں ہمیشہ یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ ان کا بیٹا انہیں چھوڑ کر ان کے سابقہ خاوند کے ساتھ رہنے لگے گا۔ سمیع ہمیشہ سوچتا تھا کہ اس کی ممی صرف اس لیے خائف ہیں کہ وہ غلطی پر ہیں۔ اگر وہ غلط نہ ہوتیں تو اس قسم کے خدشات کا شکار کیوں ہوتیں۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اس طرح سے میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔'' انہوں نے سمیع کی آنکھوں میں پھیلی سرد مہری کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یس...... آئی ایم فائن...... آپ کیسے ہیں؟'' اس نے شہادت کی انگلی سے میز کی ہموار سطح کو کھرچتے ہوئے کہا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں۔ یہ کیس ہسٹری اسٹڈی کر رہا تھا۔ یہ بہت ہی کمپلیکیٹڈ کیس ہے۔ میری زندگی میں تو بس یہی کچھ رہ گیا ہے۔ آج کی رات اسی کیس کو اسٹڈی کرتے گزر جائے گی۔ کبھی کبھی تو شکر کرتا ہوں کہ لوگ ہڈیوں کے عارضے میں بکثرت مبتلا ہوتے ہیں، ورنہ زندگی میں میرے پاس تو کرنے کے لیے کچھ نہ ہوتا۔ میرا تو وقت ہی نہ گزرتا۔'' انہوں نے ہمیشہ کی طرح لہجے میں تمام تر محرومی کو سموتے ہوئے دکھڑا رو دیا۔

''میں خود بھی اکثر یہی سوچتا ہوں کہ آپ کا وقت گزرتا کیسے ہو گا۔'' اس نے سابقہ انداز میں کہا۔ اب کی بار مرتضیٰ احسن دل ہی دل میں کچھ جز بز ہوئے۔ سمیع بات بہت سادہ کر رہا تھا مگر اس کا انداز قطعاً سادہ نہیں تھا۔

''اچھا اب میرے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بس دس منٹ میں یہاں سے آف ہو رہا ہوں پھر کسی اچھی جگہ ڈنر کے لیے چلتے ہیں۔'' انہوں نے اسے تسلی دی۔ سمیع نے گہری سانس بھری۔ اس کا باپ اس کے سامنے تھا۔ اسے ان کے چہرے پہ ہمیشہ ایک تازگی، ایک نور بکھرا نظر آتا تھا جو بہت خوش قسمت لوگوں کے چہرے پر ہوتا ہے۔ وہ اس چہرے سے بہت محبت کرتا تھا۔ یہ وہ چہرہ تھا جو اسے زندگی میں کسی مقام پر مایوس نہیں ہونے دیتا تھا اور اب یہی چہرہ اسے یک دم سیاہ کیوں لگنے لگا تھا۔ تمام تر وجاہت و وقار کے باوجود ان کا سراپا یک دم دھندلا کیوں ہو رہا تھا۔ اس کی ممی تمام زندگی اشاروں میں اسے بہت کچھ بتانے کی کوشش کرتی رہیں، مگر اسے کبھی یقین نہ آیا اور گھنٹہ بھر پہلے ایک لڑکی نے آنسوؤں کی روانی میں اسے جو کچھ بتایا تھا، وہ نظرانداز کیے جانے کے قابل نہیں تھا۔

''پاپا مجھے...... آپ کے ساتھ ڈنر نہیں کرنا۔'' اس نے قطعیت سے کہا۔ مرتضیٰ احسن نے استفہامیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

''مجھے آپ کے ساتھ...... ایک بات کرنی ہے...... بہت ضروری۔'' وہ اب کی بار ان کی جانب دیکھ کر بات نہیں کر پایا تھا۔ وہ گناہ گار نہیں تھا مگر شرمساری اسے اس طرح گھیرے ہوئے تھی جیسے وہی گناہ گار ہے۔

''مجھے آپ کو کسی سے ملوانا ہے۔'' اس کی بات پر مرتضیٰ احسن نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اس کا کوئی افیئر چل رہا تھا، یہ بات تو وہ جانتے ہی تھے۔

''شیور...... وائی ناٹ ڈیئر! تمہاری خاطر میں کسی سے بھی مل سکتا ہوں۔'' انہوں نے بہت محبت سے کہا۔

''پاپا! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے لڑکی بھی پسند کر لی ہے۔ اندر آ جائیے مریم!'' اس کی آواز مزید دھیمی ہوئی تھی۔ لہجے میں نمی کی آمیزش تھی۔ مرتضیٰ احسن نے اسے چونک کر دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کی سمت چل دیا۔ دروازہ کھول کر اس نے کسی کو اندر آنے کے لیے کہا۔

''پلیز مریم! اندر آ جائیے، کوئی آپ کو کچھ نہیں کہے گا اور اگر کوئی آپ کو کچھ کہے گا تو میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گا۔'' آخری بات اس نے ان کی جانب دیکھ کر کہی تھی۔ کمرے کے اندر آنے والی شخصیت کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ ان کو لگنے والا حیرت کا جھٹکا بہت شدید تھا۔

''پاپا! میں مریم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، آپ ان کو بخوبی جانتے ہیں۔ مجھے امید ہے آپ کوئی اعتراض نہیں کریں گے، لیکن مریم کو ذرا سا اعتراض ہے۔ آپ کے کسی دوست کو کچھ دن...... کے لیے مریم کی ضرورت......'' وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پایا تھا جب کہ مرتضیٰ احسن ہکا بکا ہو کر اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

''مریم کی ضرورت ہے نا آپ کے دوست کو...... آپ ہی کی عمر کا ہو گا نا وہ...... میں نے مریم سے کہہ دیا ہے، وہ آپ کے دوست کے پاس جا سکتی ہے۔ جا سکتی ہے نا پاپا! بولیے نا پاپا؟'' اب کی بار شاید اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکے تھے۔

''کیا بکواس ہے یہ سب۔ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کون ہے یہ لڑکی، دو ٹکے کی نرس۔ یہ مجھ پر تہمت لگا رہی ہے۔'' چلا کر بولے۔

''پاپا! میں...... آپ کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ آپ ایسے تو نہیں تھے پاپا! یہ تو آپ کی بیٹی کے جیسی ہے۔ یہ تو آپ کے۔

ماہین کے جیسی ہے۔ ماہین کہتی تھی، آپ اسے اچھے نہیں لگتے۔ آپ کی موجودگی میں اسے الجھن ہوتی تھی۔ کیا اسے بھی ایسی ہی الجھن ہوتی ہو گی جیسی مریم کو آپ کی موجودگی میں ہوتی ہے۔ کہیے نا پاپا!'' وہ رونے لگا تھا۔ اچھا خاصا لمبا چوڑا لڑکا روتا ہوا کس قدر عجیب لگ رہا تھا۔

''یہ بکواس کر رہی ہے سنی! میرے بیٹے...... یہ چالاک عورتیں تم ان کی چالاکی کو نہیں سمجھ سکتے یہ......'' مرتضیٰ احسن کی خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو کس طرح وضاحت دیں۔ وہ صفائی سے مکر گئے تھے۔ انہوں نے مریم کی کہانی کو گھڑا ہوا افسانہ قرار دیا تھا مگر کب تک...... وہ بہت دیر تک سمیع کے سامنے ڈٹے نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ ان کے سامنے بیٹھا بلک بلک کر رو رہا تھا۔ نفس کے مارے ہوئے، برائی کی ذلت سے مالا مال شخص کو بیٹے سے محبت تھی، اسی لیے اس نے اب تک خود کو بیٹے کے سامنے دیوتا بنا کر پیش کیا ہوا تھا اور اب سیاہ چادر میں لپٹی سفید لباس میں ملبوس مسیحائی کی علامت ایک نرس ان کے سارے جھوٹے وقار کو لمحہ بھر میں مٹی میں ملا گئی تھی۔ انہیں بازی کے اس طرح پلٹ جانے کی امید نہیں تھی۔ ان کا بیٹا ان کے حریف کے روپ میں ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ مریم چوہدری نے ان دونوں کی جانب دیکھا۔

''شیطان کے یہاں ہمیشہ ہی شیطان جنم نہیں لیتا۔'' اس نے اپنی نم آنکھوں کو صاف کیا۔ اس کا مسئلہ کسی اور کا مسئلہ بن چکا تھا۔ وہ ان دونوں کو چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔



اس بات کو تقریباً ساڑھے تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ان ساڑھے تین سالوں میں اس کہانی سے جڑے تمام افراد کی زندگی میں کسی قدر سکون آ چکا ہے۔ مریم چوہدری جو اسی روز واپس اپنے گھر بھائی پھیرو چلی گئی تھی، اس کے لیے وہ خوفناک چھوٹا سا حادثہ ہی کافی تھا۔ اس کے سارے عزائم، سارے خواب پل بھر میں خاک ہو گئے تھے۔ اس نے اگرچہ بھائی پھیرو جانے سے قبل تمام باتوں کو اپنے اندر دفن کر دیا تھا مگر پھر بھی اس کی ذہنی حالت کافی مخدوش تھی۔ اس نے حیدر کو سب واقعات مکمل تفصیل کے ساتھ بتا دیئے تھے۔ اس کی اور حیدر کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔

تزئین بخاری اپنے شوہر کے ساتھ دمام میں مستقل سیٹل ہو چکی ہے۔ اس کے دل میں اگرچہ اپنی ماں سے چھپ کر کورٹ میرج کرنے کا ملال باقی ہے، مگر پھر بھی وہ مطمئن ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو اس کی شادی بھی اس کی بہن کی طرح ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ کر دی جاتی۔

روبینہ یاسمین کو نرسنگ کا چار سالہ کورس مکمل کیے ایک سال ہو چکا ہے۔ وہ اب بھی وہیں ہے۔

سمیع مرتضیٰ آج کل سڈنی میں ہے۔ اس کی زندگی میں بہت ٹھہراؤ آ چکا ہے۔ وہ پہلے کی طرح غیر ذمہ دار اور کھلنڈرا نہیں رہا۔ اس کی ممی بھی اس کے ساتھ سڈنی میں ہوتی ہیں۔ انہیں اپنے بیٹے پر فخر ہے۔ گزشتہ ساڑھے تین سالوں نے اسے ایک فرمانبردار بیٹے کے روپ میں ڈھال دیا ہے۔ اس کی ممی کو اپنے ان بے جا خدشات پر ہنسی آتی ہے جو انہوں نے خوامخواہ سمیع کے حوالے سے پال رکھے تھے۔ وہ بھی اپنے پاپا سے اتنی ہی نفرت کرتا ہے جتنا کہ اس کی ممی۔

سلطانہ (میٹرن) کا چند دن پہلے بائی پاس ہوا ہے۔ ڈاکٹرز بہت زیادہ پُر امید نہیں ہیں۔ تمام تر کوشش کے باوجود ان کی صحت میں کوئی بہتری نہیں آ پا رہی۔ ان کے گھر میں ان کے لیے بہت ''پڑھائی'' ہو رہی ہے مگر پڑھائی بھی ادویات کی طرح بے اثر ہے۔

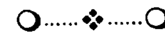
سرجن مرتضٰی اب بھی اس ہاسپٹل کے ایک اہم ستون گردانے جاتے ہیں۔ وہ اب بھی اتنے ہی شاندار ہیں جتنے کہ ساڑھے تین برس پہلے تھے۔ ان کو دیکھ کر یقین آجاتا ہے کہ کچھ لوگوں کا وقت بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ اب بھی اسی طرح پارٹیز میں شرکت کرتے ہیں اور سوشل سرکل میں موو کرتے ہیں جیسے پہلے کرتے تھے۔ ان سے کسی کو شکایت نہیں ہے، سوائے ان سائیکوتھراپسٹ کے جن کی ہدایات پر سرجن مرتضٰی بالکل عمل نہیں کرتے۔ سرجن مرتضٰی کو رات بھر نیند نہ آنے کی بے ضرر سی بیماری ہے، جس کا اثر ان کی آئی سائٹ پر پڑا ہے اور اب انہیں زیادہ موٹے عدسے والا چشمہ استعمال کرنا پڑتا ہے، مگر ایسی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کی رسی اللہ نے ابھی تک ڈھیلی رکھی ہوئی ہے۔

زینت آرا ابھی تک اسی ہاسپٹل میں ہیں۔ ان کے عزم اور حوصلے میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔ وہ آج بھی نئی آنے والی اسٹوڈنٹ نرسز کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ وہ آج بھی چھوٹے چھوٹے دیہاتوں سے آنے والی لڑکیوں کو بڑے بڑے مصائب سے بچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کے پاس بہت سے روپے نہیں ہیں مگر وہ رات کو بہت پُرسکون نیند سوتی ہیں۔ ایسی نیند جو بہت نصیب والوں کو نصیب ہوتی ہے۔

ان سب چیزوں کے علاوہ جو چیز ابھی تک ویسی کی ویسی ہے وہ ہے نرسنگ کے پروفیشن اور نرسز کی طرف ہمارا عمومی رویہ۔ جی ہاں، ہم سب کا رویہ۔ ہم آج بھی نرس کو سسٹر کہتے ضرور ہیں، مگر اسے سسٹر والی عزت نہیں دیتے۔ حالانکہ ایک نرس اتنی ہی قابلِ عزت ہے جتنا کہ ایک ڈاکٹر۔

ہم ایک ڈاکٹر کی تو عزت کرتے ہیں مگر ایک نرس کی عزت ہم سے نہیں ہوتی۔ حالانکہ یہ ایک عام فہم سی بات ہے کہ جیسے سب ڈاکٹرز اچھے نہیں ہو سکتے، اسی طرح سب نرسز بھی بری نہیں ہوتیں۔ کم عمری میں اس فیلڈ کو جوائن کرنے والی معصوم کلیوں کی مانند نازک لڑکیاں جب اپنی اپنی مجبوریوں کی گٹھڑیاں سمیٹے یہاں آتی ہیں تو ان کو بہکانے کے لیے آسمان سے فرشتے نہیں آتے بلکہ ان کے اردگرد موجود لوگ ہی یہ فریضہ سرانجام دیتے ہیں مگر ایک بات ہم سب دھڑلے سے کہتے ہیں کہ ''نرسیں اچھی نہیں ہوتیں۔'' ہم ایک بار بھی نہیں سوچتے کہ نرس نہ ہو تو مریض کی دیکھ بھال کون کرے۔ ایم بی بی ایس کر کے پانچ پانچ سال کتابوں کی دنیا میں غرق رہنے والے میڈیکل آفیسرز جب ہاؤس جابز کے لیے ہاسپٹلز میں قدم رکھتے ہیں تو انہیں آپریشن تھیٹر کی سمت بھی معلوم نہیں ہوتی۔ آپریشن تھیٹرز کے اندر وہ ایک عام سی قینچی پکڑنے کے لیے بھی نرس کے محتاج ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ایک نرس کبھی بھی ایک ڈاکٹر کے جتنی قابلِ عزت نہیں ہوتی۔ دراصل قصور ہم سب کا ہے۔ ہم ڈاکٹر کو باوقار سمجھ کر عزت دیتے ہیں تو ہمیں اس کی مددگار کو بھی اتنی ہی عزت دینی چاہیے تاکہ ایک باوقار پروفیشن کو تمام تر غلاظت سے پاک کیا جا سکے کیونکہ اچھے لوگ ہر جگہ ہو سکتے ہیں، جوہڑ کے کنول کی طرح۔

یہ کہانی اپنے ادھورے اختتام کے ساتھ یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ شاید کچھ کہانیاں بہت جلد اختتام تک نہیں پہنچ پاتیں، ان کو ختم کرنے کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ آیئے ہم سب مل کر انتظار کرتے ہیں۔



محبت رنگ بدلتی ہے

''صوفی دادا! آپ کا دماغ چل گیا ہے۔'' وہ صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ چہرے کے تاثرات ایسے ہو گئے تھے جیسے کوئی بے حد انہونی قسم کی بات سن لی ہو جب کہ دادا نے اس کے بگڑتے زاویوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ جی جان سے ٹی وی کی طرف متوجہ تھے جہاں ان کی پسندیدہ گلوکارہ ریشماں کے گانے کی ریکارڈنگ چل رہی تھی۔

''دِس اِز ٹو مچ صوفی دادا آپ چاہتے ہیں میں ایک ایسی لڑکی سے شادی کر لوں جسے میں نے کبھی دیکھا تک نہیں، آواز بھی نہیں سنی، حتیٰ کہ نام سے بھی واقف نہیں ہوں۔'' وہ بات کرتے کرتے یک دم اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور کمرے میں چکر لگانے شروع کر دیئے تھے۔

''اگر مجھے ایک فیصد بھی امید ہوتی کہ جن لڑکیوں کو تم نے دیکھا ہوا ہے، جن کی آوازیں سن رکھی ہیں اور جن کے ناموں سے واقفیت ہے، ان میں سے کسی ایک بھی لڑکی سے تم شادی کر لو گے تو میں کبھی بھی تمہارے رشتے کی بات ثوبیہ سے نہ چلاتا۔ سن لیا ثوبیہ نام ہے اس کا۔'' صوفی دادا نے کچھ دیر کے لیے ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر اسے جواب دیا پھر دوبارہ سے ان تینوں کاموں میں مصروف ہو گئے جو خاصی دیر سے کر رہے تھے یعنی ریشماں کو دیکھنا، ریشماں کو سننا اور ریشماں کو سراہنا۔

''سو واٹ؟ ثوبیہ ہو یا لوبیہ آپ چاہتے کیا ہیں آخر؟ میں صرف نام سے واقفیت کی بناء پر ایک انجانی لڑکی سے نکاح کر لوں؟'' وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ جھنجلاہٹ اس کے ایک ایک انداز سے عیاں تھی۔

''ایکسکیوز می مسٹر! میں نے صرف منگنی کی بات کی ہے اور ہاں کسی خوش فہمی میں مت رہنا تمہارا نکاح اتنی جلدی ممکن نہیں ہے۔ مولوی نکاح پڑھاتے وقت پورے چھ کلمے سنتا ہے اور تم تو پہلا کلمہ ہی اٹک اٹک کر سناتے ہو۔ چھ کلمے یاد کرنے میں ٹھیک ٹھاک عرصہ لگے گا۔'' وہ طنزیہ انداز میں کہہ رہے تھے۔ تیمور ان کی بات پر خاصی دیر تک انہیں گھورتا رہا مگر جب انہوں نے لفٹ نہیں کروائی تو تنگ آ کر بولا۔

''آپ کچھ بھی کہیں صوفی دادا! میں منگنی بھی تب تک نہیں کرواؤں گا جب تک آپ مجھے لڑکی کے متعلق تمام تر معلومات فراہم نہیں کر دیتے۔''

''تمہیں آخر کس قسم کی معلومات درکار ہیں؟'' ٹی وی پر ریشماں کی بجائے اب بہبودِ آبادی کے ایڈز آنا شروع ہو گئے تھے سو دادا نے ٹی وی بند کر کے ساری توجہ پوتے کو دینے کا فیصلہ کیا۔

''کچھ خاص نہیں مگر کم از کم یہ تو پتا ہو کہ اس کا آئی کیو لیول کتنا ہے؟ ہابیز کیا ہیں؟ مائیکل جیکسن پسند ہے یا عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی؟ اور پھر کرکٹ...... کرکٹ کے متعلق اس کی معلومات کا ذخیرہ کس قدر وسیع ہے؟ اسے یہ ضرور پتا ہونا چاہیے کہ ظہیر

عباس نے انٹرنیشنل کرکٹ میں کتنی سنچریز بنائی ہیں؟ عمران خان نے کل کتنی وکٹیں حاصل کی ہیں؟ پاکستان نے کب کب انگلینڈ کا دورہ کیا؟ اور یہ بھی کہ......''

''مدثر نذر کس رنگ کے بنیان پہنتا تھا؟ جاوید میانداد کون سا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتا ہے؟ سرفراز نواز کی صحیح عمر کیا ہے؟ رمیز راجہ کتنے دنوں بعد بال ڈائی کرتا ہے؟'' دادا اس کی بات کاٹ کر کہہ رہے تھے۔

''اگر تمہیں اس قسم کی معلومات کی حامل زوجہ محترمہ چاہئیں تو سنیل گواسکر یا پھر ٹونی گریگ بہترین چوائس ثابت ہوں گے۔''

''صوفی دادا! میں کسی ثوبیہ، لوبیہ سے شادی نہیں کروں گا۔'' وہ ان کی بات پر زچ ہو کر بولا۔

''شادی تو تمہارا باپ بھی کرے گا برخوردار۔'' مسکراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا گیا۔ اپنے پوتے کی حالت انہیں لطف دے رہی تھی۔

''اسی لیے میرا باپ جلدی مر گیا ورنہ آپ ان کی بھی چار شادیاں کروا کر دم لیتے۔''

''شرم کرو باپ کے متعلق ایسا کہہ رہے ہو؟''

''شرم کیوں کروں؟ شکر کیوں نہ کروں بے چارے میرے ماں باپ دادی سمیت جلدی وفات پا گئے۔ اگر کہیں زندہ ہوتے تو آپ کے توافیئرز کی زبان زد عام داستانیں سن کر اب شرمندگی سے مر جاتے۔''

''دیکھو، دیکھو پوتے تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ فوراً اپنے الفاظ واپس لو اگر تم نے اپنے الفاظ واپس نہ لیے تو......'' وہ اسے وارن کر رہے تھے۔

''تو کیا کریں گے آپ؟ اس ثوبیہ لوبیہ سے خود شادی کر لیں گے؟ میری بلا سے بے شک کر لیں۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے جمپ لگا کر صوفے کے پیچھے ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ اب کی بار دادا کوئی تخریبی کارروائی کریں گے اور اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ انہوں نے سامنے پڑا ریموٹ کنٹرول اسے کھینچ مارا تھا جو اس کے بازو پر لگا۔ وہ بلبلا کر رہ گیا۔

''آپ صوفی دادا!...... آپ نہایت ظالم صوفی دادا ہیں۔'' وہ بازو سہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''اور تم تیموری پوتے......! تم نہایت بدتمیز تیموری پوتے ہو۔'' انہوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''پھر کوئی نیا تیموری پوتا لے آئیں۔''

''تم بھی کوئی نیا صوفی دادا لے آؤ۔''

''مشکل ہے آپ جیسا نظر باز کہیں نہیں ملے گا۔'' وہ افسوس سے کہہ رہا تھا۔ دادا کے تلوؤں سے لگی سر پر پھوٹی۔

''کمینے تم نے مجھے نظر باز کہا تو میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔'' ان کے چہرے کے تاثرات سچ مچ خونخوار ہو گئے تھے۔

''پھر تو میں ضرور کہوں گا۔ آپ ہیں ہی نظر باز، بے چاری مسز نیازی نے آپ کی وجہ سے محلہ چھوڑ دیا۔ آنٹی کرن نے ہمارے یہاں آنا جانا کم کر دیا اور......''

''اور یہ......'' صوفی دادا نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کشن کھینچ کر مارا تھا، جواب میں اس نے دو کشنز مارے۔ اس کے بعد عام دنگل شروع ہوا۔ کشن ایک دوسرے پر یکے بعد دیگرے برسانے، اور بچاؤ کے مختلف طریقے اختیار کرنے میں کمرے کی حالت بگڑنا شروع ہو گئی تھی۔



''عائشہ! اٹھ جاؤ نو بجنے میں صرف بیس منٹ رہ گئے ہیں۔'' بھابی نے تیسری مرتبہ پھر اسے بیدار کرنے کی سعی لاحاصل کی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی حالانکہ آج اسے ایک جگہ انٹرویو کی غرض سے جانا تھا اور وہ رات کو تمام تیاری کر کے سوئی تھی لیکن اب اس کی نیند دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے اصطبل کے آخری گھوڑے پر بار گیننگ ہو رہی ہو۔ بھابی کی چوتھی آواز پر وہ ذرا سا کسمسائی اور دوبارہ سو گئی، پانچویں آواز پر پوری آنکھیں کھول کر دیکھا، جماہی لی، اٹھنے کا عندیہ دیا اور پھر کروٹ بدل کر دوبارہ سو گئی۔ چھٹی آواز کی نوبت نہیں آئی بھابی غصے سے دھاڑ سے دروازہ بند کر کے باہر نکل گئیں۔ ان کا چھ ماہ کا عثمان، جو ساتھ والے کمرے میں محو استراحت تھا بیدار ہو کر رونے لگا تھا۔ جو کام بھابی کی آواز نہ کر سکی وہ عثمان کی آواز نے کیا تھا۔ عائشہ ایک دم اٹھ بیٹھی اور پھر جب گھڑی پر نظر پڑی تو باتھ روم کی طرف دوڑ لگا دی۔ ٹھیک نو بج کر دس منٹ پر وہ وین کے انتظار میں اسٹاپ پر کھڑی تھی۔



''پلیز اسفر! مان جاؤ ناں، یقین کرو یار کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا۔'' تیمور نے ایک دفعہ پھر اپنے جگری یار کی طرف منت بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیسے مان جاؤں؟ تُو جانتا ہے میں مارکیٹنگ کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ رو دھو کر پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا تھا میں نے، مجھے کیا پتا انٹرویو میں کیسے سوال کرنے ہیں؟ امیدواروں کو کیسے ڈیل کرنا ہے اور اگر کسی نے انگریزی بولنی شروع کر دی تو میں کیا کروں گا؟'' وہ بے بسی سے کہہ رہا تھا۔

''اتنی مبالغہ آرائی سے بھی کام مت لے یار! انگلش تو تُو بول ہی لیتا ہے اور پھر انٹرویو کون سا مارکیٹنگ منیجر کے لیے ہو رہا ہے۔ ایک سیدھی سادی پرسنل سیکرٹری چننی ہے۔ اگر فائنل میچ نہ ہوتا تو یقین کرو میں کبھی بھی تمہاری منت نہ کرتا۔'' تیمور کو اسفر کے نخروں سے چڑ ہونے لگی تھی۔ پاکستان اور آسٹریلیا کے مابین کرکٹ کا فائنل کھیلا جا رہا تھا۔ پاکستان اپنی اننگ کھیل چکا تھا اور اب آسٹریلیا کی باری تھی۔ چونکہ تیمور کو کرکٹ سے بے حد شغف تھا سو وہ یہ میچ دیکھنا چاہتا تھا جب کہ رزاقی صاحب نے اسے یہ ذمہ داری سونپ دی تھی کہ وہ اپنی پرسنل سیکرٹری کم اسسٹنٹ کا انٹرویو خود کرے۔ اسی لیے تیمور نے فون کر کے اسفر کو آفس بلا لیا تھا وہ اپنے والد کے ساتھ مل کر سپر اسٹور چلاتا تھا اسی لیے تیمور کی فون کال پر فوراً آ گیا تھا مگر جب کام کی نوعیت پتا چلی تو فوراً انکاری ہو گیا۔ اسے لگ رہا تھا ایک ساتھ اتنے سارے لوگوں کا انٹرویو کرنا نہایت غیر دلچسپ کام ہو گا دراصل اسے اندازہ نہیں تھا کہ لڑکیوں کا انٹرویو کرنا کس قدر دلچسپ ہو سکتا ہے۔ دراصل وہ تیمور کو تنگ کر رہا تھا۔

''لیکن مجھے پتا کس طرح چلے گا کہ بھئی فلاں لڑکی اس جاب کے لیے مناسب ہے۔'' وہ عجب شش و پنج کی کیفیت میں کہہ رہا تھا۔

''یہ تمہاری مرضی ہے۔ یوں کرنا جو سب سے خوب صورت لگے اسے ہی سلیکٹ کر لینا۔'' تیمور کی جان میچ میں اٹکی ہوئی تھی۔

''مجھے تو ساری لڑکیاں ہی اچھی لگتی ہیں۔'' ایک اور مشکل بیان کی گئی۔

''ابے گھامڑ! جو سب سے زیادہ اچھی لگے اسے سلیکٹ کر لینا۔''

''چلو یہ ٹھیک ہے۔'' وہ مطمئن ہو گیا مگر پھر ایک دم کچھ یاد آیا۔

''یار تیمور! ایک اور بات ہے۔''

''اب کیا ہے؟'' وہ زچ ہو کر بولا۔

''ابا ماریں گے یار!''

''وہ کیوں؟ اور پھر ان کو کون بتائے گا؟''

''میرے ابا ہیں وہ، ذرا میری چال میں ترنگ محسوس کر لیں تو گھڑی گھڑی پوچھتے ہیں کیوں برخوردار کتنی لڑکیوں کرآر ہے ہو؟'' وہ خاصی مبالغہ آرائی سے کام لے رہا تھا۔ اب جا کر تیمور کو سمجھ میں آئی کہ وہ دراصل اسے چڑانا چاہ ر ورنہ لڑکیوں سے اتنی عدم دلچسپی تو اسے کبھی بھی نہیں رہی تھی۔

''ہاں یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا پھر تم چلے جاؤ میں خود ہی کر لوں گا انٹرویو۔''

''لیکن وہ میچ۔'' اسفر کو یک دم اچھا بھلا انجوائے کرنے کا موقع ہاتھ سے پھسلتا محسوس ہوا۔

''گولی مارو میچ کو یار! انٹرویو بھی تو ضروری ہے۔'' تیمور اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ تو ٹرمپ کارڈ لگا تھا۔

''نہیں یار! تم دیکھ لو میچ، اتنا بے مروت تو نہیں ہوں میں کہ میرا دوست ذرا سا کام کہے اور میں وہ بھی نہ کر سکوں۔'' منت کی باری اسفر کی تھی۔

تیمور بحث کو لمبی کر سکتا تھا مگر گھڑی کی طرف دیکھ کر ارادہ ترک کر دیا۔ پاکستان کی ٹیم آسٹریلیا کے دورے پر تھی اور ی صبح کے وقت وہاں سے براہِ راست نشر کیے جا رہے تھے۔ اس لیے بھی ٹائمنگز کا کچھ پرابلم ہوا تھا چونکہ اسفر کو کرکٹ سے د نہیں تھی۔ اس لیے وہ تیمور کی مدد کر سکتا تھا۔ چیدہ چیدہ باتیں اس کے گوش گزار کرنے کے بعد تیمور چپ چاپ آفس سے گیا تھا۔

○......❖......○

''آپ کا نام؟'' بہت کروفر سے پوچھا گیا۔ سچ مچ اس نے آج بہت انجوائے کیا تھا۔ ایک سے ایک چالاک لڑکی اسے اپنا باس سمجھتے ہوئے بھیگی بلی بنی بیٹھی تھی۔ لاتعداد الٹے سیدھے سوالات کر کے اس نے لڑکیوں کو زچ کرنے کی ہر مم کوشش کی تھی۔

''میں نے آپ کا نام پوچھا ہے مس؟'' اپنے سامنے بیٹھی قدرے بونگی سی لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے ایک مر پھر سوال دہرایا۔

''عائشہ سر۔'' اس نے اپنی ناک پہ پھسلتی عینک کو دوبارہ ناک پر جما کر کہا۔

''ہوں عائشہ سر؟ کچھ عجیب سا نہیں ہے؟''

''عائشہ سر نہیں سر! عائشہ نیازی۔'' وہ بے چاری گڑبڑا سی گئی۔

''اچھا یہ بتائیں آپ نے بی اے تین سالوں میں کیوں کیا؟'' وہ مزے سے اس کو گھورتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ اس ک گھوری نے بے چاری عائشہ کو مزید کنفیوژ کر دیا۔

''میں فیل ہو گئی تھی سر۔''

''سچ؟ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے میں بھی بی اے میں فیل ہو گیا تھا۔'' وہ بے طرح خوش ہوا۔ وہ شرمندہ شرمندہ سی چپک بیٹھی رہی۔

''فلمیں دیکھتی ہیں؟''

''جی سر! کبھی کبھی دیکھ لیتی ہوں۔'' یہ عائشہ کا پسندیدہ موضوع تھا۔

''ویری نائس...... ویری نائس کس قسم کی فلمیں دیکھتی ہیں؟''

''تفریحی قسم کی یا پھر کامیڈی، ٹریجک موویز مجھے اچھی نہیں لگتیں۔'' وہ پُرجوش ہو کر بولی۔

''جیرا بلیڈ...... دیکھی ہے آپ نے؟''

''جی سر؟ نہیں سر......'' عائشہ کو فلم کا نام سن کر حیرت ہوئی۔

''مولا جٹ دیکھی؟''

''نو سر......''

''سلطانہ ڈاکو؟''

''نو سر......'' عائشہ کو افسوس ہو رہا تھا کہ باس کی بتائی گئی فلمیں اس نے نہیں دیکھ رکھیں۔

''ہنٹر والی تو ضرور دیکھی ہو گی آپ نے؟'' اسفر نے چیئر کی پشت سے کمر ٹکا کر کہا۔

''آئی ایم سوری سر! میں نے ان میں سے کوئی فلم بھی نہیں دیکھ رکھی لیکن...... اگر...... اگر آپ مجھے یہ جاب دے دیں گے تو میں یہ فلمیں ضرور دیکھ لوں گی۔'' وہ روتی صورت بنا کر کہہ رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ جاب اس کے مقدر میں نہیں۔

''جاب کی تو آپ فکر نہ کریں عائشہ! وہ تو آپ کو ہی ملے گی لیکن وعدہ کریں ایک ہفتہ کے اندر اندر یہ تمام فلمیں دیکھ لیں گی۔'' وہ اسے تسلی دے رہا تھا اور اندر ہی اندر ہنسی کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ان شاء اللہ سر! آپ فکر مند نہ ہوں۔'' اب کی بار اسفر اپنی ہنسی کو روک نہیں پایا تھا۔ عائشہ ناسمجھی کے عالم میں اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

''آپ ہنس کیوں رہے ہیں سر؟'' آخر پوچھ ہی لیا۔

''یونہی، بے وجہ، آپ یہ بتائیں آج کل میک اَپ کا کیا ٹرینڈ چل رہا ہے؟''

''میں میک اَپ نہیں کرتی سر۔'' وہ سر جھکا کر کہہ رہی تھی۔ اسے بھابی پر بے حد غصہ آیا تھا۔ جنہوں نے اسے میک اَپ کے نام پر لپ اسٹک بھی نہیں لگانے دی تھی۔

''کیوں؟'' وہ اس کے دھلے دھلائے چہرے کی طرف غور سے دیکھتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

''بھابی نہیں کرنے دیتیں۔'' دو چیزیں سچ بولنے پر مجبور کر سکتی ہیں ایک معصومیت دوسرا خوف، وہ دونوں چیزوں کے زیر اثر تھی سوچ بول گئی۔

''کیوں؟''

''وہ کہتی ہیں اَن میرڈ لڑکیاں میک اَپ نہیں کرتیں۔'' جھکی نظروں کے ساتھ جواب دیتی وہ اس وقت اسفر کو بے حد معصوم لگی۔ مگر دل شرارت سے باز نہیں آیا تھا۔

''ہائیں، یعنی کہ آپ اَن میرڈ ہیں؟'' پوری کی پوری آنکھیں پھیلا کر حیرانگی سے دریافت کیا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ڈرامہ کر رہا ہے مگر عائشہ اتنی بدھو تھی کہ سمجھ ہی نہیں پائی اور پریشان ہو کر بولی۔

''جج...... جی سر۔''

''مائی گاڈ، شکر ہے آپ نے بتا دیا۔ اگر میں آپ کو جاب دے دیتا تو یقیناً مجھ پر بھی دھوکہ دہی کا الزام لگ جاتا۔ آپ

جانتی ہیں اس جاب کے لیے میرڈ ہونا لازمی شرط ہے۔'' وہ جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا۔

''اب کیا ہوگا سر؟'' وہ روہانسی ہوگئی۔ بھابی کے طعنہ دینے پر کہہ تو آئی تھی کہ اپائنٹ منٹ لیٹر لے کر ہی گھر میں گھسے گی مگر اب یہ دنیا کا مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔ ان کے گھر میں روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اس کا بھائی ایک اچھی پوسٹ پر کام کر رہا تھا دراصل بھابی کو اس کا بونگا پن بے حد کھٹکتا تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ ان کی نند دنیا کی چالاکیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو بھی چالاکی وعیاری کے ہتھیاروں سے مسلح کر لے۔ اسی لیے باتوں باتوں میں وہ اسے جاب کرنے کے لیے اُکساتی رہتی تھیں۔

''مجھے نوکری کی اشد ضرورت ہے سر۔'' وہ مجبور و بے بس لہجے میں بولی۔

''آپ ایک ہفتے میں شادی کر سکتی ہیں؟'' ایک اور چٹکلا چھوڑا گیا۔

''نن......نو سر یہ تو بہت تھوڑا ٹائم ہے۔'' وہ ہکلائی۔

''آپ کے خیال میں کتنا ٹائم لگ جائے گا؟ سات دن ٹھیک رہیں گے؟''

''ہاں، سات دن مناسب ہیں۔'' وہ اتنی بے وقوف تھی کہ اسفر کی بات سمجھ ہی نہیں پائی۔

''او کے پھر آپ سات دن بعد اسی جگہ آ جایئے گا۔ آپ کو اپائنٹ منٹ لیٹر مل جائے گا۔''

''آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟'' وہ بے یقین تھی۔

''میں آپ کو شکل سے جھوٹا لگتا ہوں؟'' وہ مصنوعی غصے سے بولا۔

''ن......نو سر۔'' عائشہ ایک دفعہ پھر گڑبڑا سی گئی۔

''اب آپ جایئے اور ایک ہفتہ بعد تشریف لایئے گا۔'' عجب بے نیازی سے کہا گیا عائشہ خوش خوش باہر چلی گئی جیسے کوئی معرکہ مارا ہو۔ اس کے باہر نکلتے ہی اسفر نے ہنسنا شروع کر دیا۔

○......❖......○

''دیکھیں پلیز آپ سمجھنے کی کوشش کریں یہ چندہ ہم اپنے لیے نہیں مانگ رہے بلکہ یہ چندہ غریب، معذور افراد کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کیا جائے گا۔ ثواب کا کام ہے آپ کو تو چاہیے دل کھول کر عطیات دیں۔''

وہ لڑکی شکل سے ہی پُر اعتماد لگ رہی تھی پھر اس کے لہجے نے بھی تصدیق کر دی کہ وہ ''پیشہ ور'' مانگنے والی ہے۔ تیمور نے رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ خاصی کیوٹ سی لڑکی تھی۔ بالوں کو بینڈ میں جکڑے یونیفارم میں ملبوس وہ بظاہر کوئی کیمپین چلاتی ہی لگ رہی تھی۔ تیمور بخوبی واقف تھا کہ اس قسم کے طالب علم چندہ کس غرض سے جمع کرتے ہیں۔ اپنی اسٹوڈنٹ لائف میں وہ اسفر کے ساتھ مل کر خود بھی اکثر لوگوں کو بے وقوف بنا کر چیرٹی کے نام پر رقم اکٹھی کرتا تھا۔ پھر سب دوست مل کر یہ رقم ''بندو خان'' ہوٹل کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا کرتے تھے۔

''بی بی! میں نے آپ کو پہلے بھی کہا ہے کہ مجھے معذور افراد سے کوئی ہمدردی نہیں برائے مہربانی آپ کہیں اور سے امداد طلب کریں۔'' دکاندار خاصے جلے بھنے انداز میں کہہ رہا تھا۔ لڑکی نے ایک دفعہ پھر گھگھیا کر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر دکاندار کے عدم تعاون پر وہ منہ بناتی اور کچھ بڑبڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ دکاندار تیمور سے کہہ رہا تھا۔

''کیا بتاؤں بھائی صاحب کیمپس ایریا میں دکان کھولنے کا یہی نقصان ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ہاتھ پھیلائے کھڑا رہتا ہے۔''

بھائی صاحب نے جواب میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ ویسے بھی وہ خاصا تپا ہوا تھا۔ آسٹریلیا نے پاکستان کو بہت بری طرح شکست دے دی تھی ہمیشہ کی طرح۔ تیمور کو سب سے زیادہ غصہ اپنے آپ پر آ رہا تھا کہ کیوں ضروری کام چھوڑ کر ٹی وی کے آگے بیٹھا رہا۔ اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کے لیے ہی اس نے گھر سے آفس جاتے ہوئے راستے میں گاڑی روک کر سگریٹ طلب کی تھی۔ سگریٹ پینے کے بعد اس نے والٹ سے پانچ روپے نکالے اور کاؤنٹر پر رکھ کر آگے بڑھ گیا۔ وہی لڑکی اب ایک اور دکاندار کے پاس ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔ تیمور نے رک کر اس کی مدد کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

خدمتِ خلق کے مہلک جراثیم اسے کبھی بھی نہیں لگے تھے جو اسے یہ کام کرنے کے لیے مجبور کر سکتے۔ اس لڑکی کی گفتگو جو تیمور نے نادانستگی میں سن لی تھی وہی کافی تھی۔

وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ وہ سگریٹ پینے میں مشغول تھا اگر سگریٹ نہ پی رہا ہوتا تو شاید اتنی بات بھی نہ سن پاتا۔ دراصل گاڑی میں بیٹھ کر وہ سگریٹ پی نہیں سکتا تھا۔ صوفی دادا خطرناک قسم کے اسمیل کانشس انسان تھے۔ انہیں فوراً پتا چلا جاتا کہ تیمور نے اسموکنگ کی ہے۔ پھر وہ اسے روکتے، ٹوکتے نہیں تھے بس خود بھی اسموکنگ شروع کر دیتے اور نہایت دھڑلے سے کرتے جب کہ ڈاکٹر نے انہیں سگریٹ پینے کو سختی سے منع کیا تھا۔ تیمور نے اپنی گاڑی کے پاس آ کر ایک دفعہ پھر والٹ کھولا تھا پھر اس میں رکھی ببل نکال کر منہ میں ڈال لی تھی۔ دو تین مرتبہ اس کو اچھی طرح سے چبانے کے بعد اس نے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر سانس باہر نکال کر تسلی کی تھی پھر ببل کو خوب چبا کر بڑا سا ببل بنایا تھا۔ اس کے بعد اس نے ہوا کے زور سے ببل باہر پھینک دی تھی۔ ٹشو پیپر سے منہ صاف کر کے گویا حفاظتی اقدام مکمل کیے گئے تھے۔

''ایکسکیوزمی سر! چیرٹی کے نام پر کچھ مدد کریں پلیز!'' وہ گاڑی میں بیٹھنے ہی لگا تھا جب پیچھے سے آواز آئی۔ وہ ٹھٹک کر مڑا اور پھر درشتگی سے سوری کہا۔

''پلیز سر! ایک اچھے کاز کے لیے، انسانی ہمدردی کے لیے دل بڑا کیجیے۔''

''دل بڑا ہو جائے تو انسان بیمار پڑ جاتا ہے۔''

''محاورتاً کہہ رہی ہوں سر! اللہ نے آپ کو اتنا دیا ہے۔ گاڑی ہے آپ کے پاس موبائل بھی ہے۔ محتاجوں کی مدد کیجیے، اللہ آپ کی مدد کرے گا۔'' اس لڑکی نے ایک ہی نظر میں تیمور کی شخصیت کو بھی تول لیا تھا اور گاڑی کے اندر پڑا موبائل بھی دیکھ لیا تھا۔

''ٹھیک ہے میرے پاس گاڑی ہے، موبائل ہے مگر حق حلال کی کمائی سے خریدا گیا ہے۔ یہ میں نے اس مقصد کے لیے نہیں رکھے کہ ہر ایرا غیرا مجھے ان چیزوں کا احساس دلا کر مجھ سے چیرٹی کے نام پر رقم بٹور سکے۔'' تب اسے میچ ہارنے کی چڑھی ہوئی تھی نشانہ بے چاری لڑکی بن گئی۔

''اتنا روڈلی بات مت کریں۔ اگر خدا نے دے رکھا ہے تو اس پر مغرور ہونے کی بجائے شکر ادا کریں۔'' اب کی بار لڑکی کا لہجہ بھی سخت ہو گیا تھا۔

''خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے مجھے کسی نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔ برائے مہربانی آپ اپنا مشورہ اپنے پاس رکھیں۔''

''بدتمیز ڈھیٹ شخص۔'' لڑکی آہستگی سے بڑبڑائی تھی مگر تیمور کی تیز سماعت سے کچھ مخفی نہ رہ سکا۔

''ایکسکیوزمی میڈم! بدتمیز اور ڈھیٹ ہوں گی آپ خود۔ جانتا ہوں میں سارے حربے آپ جیسے لوگوں کے، یہاں وہاں سے پیسے اکٹھے کریں گی اور KFC میں جا کر اڑا دیں گی۔ شرم تو نہیں آتی ہو گی اللہ کے نام پر معذوروں کے نام پر پیسے مانگتے ہوئے۔ پہلے اپنی اصلاح کیجیے پھر دوسروں کی طرف توجہ دیجیے گا۔''

اس نے اپنی بات مکمل کر کے گاڑی کا دروازہ کھولا تھا پھر اندر بیٹھ کر گاڑی بھگا لے گیا۔لڑکی کی طرف دوبارہ دیکھنے کی اس نے کوشش بھی نہیں کی تھی۔آفس پہنچ کر گاڑی پارک کی اور اندر کی جانب چل دیا۔غصہ پہلے ہی آیا ہوا تھا۔بے دھیانی میں سامنے سے آنے والی شخصیت سے ٹکرا گیا۔

''سوری سر! آئی ایم سوری۔'' وہ جو کوئی بھی تھی اپنی غلطی نہ ہونے کے باوجود ایکسکیوز کر رہی تھی۔

''اِٹس آل رائٹ۔'' وہ کرٹسی نباہ کر اندر داخل ہوا جہاں اسفر اکیلا بیٹھا جانے کیوں ہنسے چلا جا رہا تھا۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟'' وہ منہ بنا کر بولا۔

''کچھ مت پوچھو یار!'' اسفر ہنسی روک کر بولا۔

''اچھا نہیں پوچھتا۔'' وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

''لیکن تمہیں کیوں اتنا غصہ آ رہا ہے؟'' اسفر نے اس کے موڈ کے پیشِ نظر سنجیدگی سے پوچھا۔پھر یک دم میچ کی بات یاد آئی تو بولا۔

''اس دفعہ ہم سے جیت گئے یا ہمیں ہرا دیا؟''

''ہم ہی ہار گئے یار۔'' وہ پژمردہ لہجے میں بولا۔

''اوہو تو یہ بات ہے۔'' اندر ہی اندر اسفر کو گدگدی ہوئی۔

''نہیں ایک اور بات بھی ہے۔''

''وہ کیا بات ہے؟'' اسفر نے اس کے چہرے کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''بس یار! پتا نہیں کبھی کبھی مجھے کیا ہو جاتا ہے ہر ایک سے بدتمیزی کر بیٹھتا ہوں۔'' اس نے گہری سانس بھری۔

''مجھ سے پاکستان کی ہار برداشت نہیں ہوتی۔''

''مگر صرف کرکٹ میں۔'' اسفر نے ٹانگ اڑا کر درستگی کرنا مناسب سمجھا۔

''میرا بھی یہی مطلب تھا۔''

''اچھا مگر ہوا کیا ہے؟''

''یار وہ بے چاری لڑکی۔'' تیمور اسے تفصیل بتانے لگا۔اس کی بات کو غور سے سننے میں اسفر بھول ہی گیا کہ اسے بھی ایک بے چاری لڑکی کی بات کرنی تھی۔



''مان لیں صوفی دادا! ذہانت میں آپ اپنے پوتے کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔'' وہ کافی چھینٹتے ہوئے بہت مزے سے کہہ رہا تھا۔صوفی دادا کو چڑانے میں اسے کافی مزا آ رہا تھا وہ بہت بری طرح اس سے شطرنج کی بازی میں مات کھا گئے تھے۔اس سے پہلے ہمیشہ تیمور شکست کھاتا آیا تھا اسی لیے آج کی کامیابی اسے بے حد مسرور کر رہی تھی۔وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے دادا جان بوجھ کر ہارے ہیں۔کل پاکستان کی ناکامی کے بعد جانے کیوں تیمور کا موڈ بہت خراب تھا اگرچہ اکثر اوقات کرکٹ میں پاکستان کی ناکامی پر وہ منہ پھلا کر بیٹھ جایا کرتا تھا مگر کل موڈ کچھ زیادہ ہی خراب تھا۔دادا اپنے ستائیس سالہ پوتے کے مزاج سے بخوبی واقف تھے اسی لیے وہ زبردستی اس کے ساتھ شطرنج کی بازی لگا کر بیٹھ گئے تھے اور پھر کھیل کے دوران باتوں ہی باتوں میں انہوں نے اس سے سب کچھ اگلوا لیا تھا نا صرف اگلوا لیا تھا بلکہ اس کے مزاج کو اعتدال پر بھی لے آئے تھے۔

انہیں اپنے پوتے سے بہت محبت تھی۔اگرچہ اس بات کا اظہار انہوں نے کبھی الفاظ کے ذریعے نہیں کیا تھا اور اکثر و بیشتر وہ تیمور کو یہ باور کراتے رہتے تھے کہ تمہاری وجہ سے میں نے اپنی زندگی کے قیمتی سال ضائع کر دیے۔اپنی ساری جوانی تم پر نچھاور کر دی وغیرہ وغیرہ لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ تیمور ان کے لیے سامری جادوگر کے طوطے کی طرح تھا۔ان کی جان تھی تیمور میں۔بہت چھوٹا سا تھا وہ جب اس کے ماں باپ یعنی ان کے بیٹا اور بہو ان کی بیوی سمیت مناسکِ حج کے دوران منیٰ میں خیموں میں آگ لگنے کے باعث فوت ہو گئے تھے۔صوفی دادا اور تیمور کی جان بچ گئی تھی۔بہت عرصہ تک وہ اس حادثے سے سنبھل نہیں پائے تھے۔ان کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ یہ حادثہ ان کی وجہ سے ہوا ہے۔

وہ ریاض میں ایک امریکن فرم میں ملازمت کرتے تھے۔انیس سال اس فرم میں خدمات سرانجام دینے کے عوض بونس کے طور پر انہیں اپنی فیملی کو ایک سال کے لیے سعودی عرب بلانے کی اجازت ملی تھی۔ان کا ایک ہی بیٹا تھا جس کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔انہوں نے بیوی، بیٹا اور بہو کو اپنے پاس ریاض بلا لیا۔تیمور ریاض ہی میں پیدا ہوا تھا۔''ذی الحج'' کا مبارک مہینہ شروع ہوا تو تیمور کی عمر دو ماہ تھی۔انہیں بہت خوشی تھی اس بات کی کہ ان کا پوتا اس ننھی سی عمر میں حج کرے گا اور حج بھی عام حج نہیں بلکہ حج اکبر لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آنے والے دن ان کے لیے کس قسم کی بربادی کا سامان کرنے والے ہیں۔وہی ہوا تھا جو قسمت میں درج تھا اور قسمت وہم و گمان سے ماورا ہوا کرتی ہے۔وہ تیمور کو لے کر پاکستان آ گئے تھے۔ٹھیک ٹھاک آبائی زمین تھی پھر وہ ریاض سے بھی سب کمائی سمیٹ لائے تھے۔انہوں نے اپنی زندگی تیمور کے لیے وقف کر دی تھی۔تیمور ہی کی خاطر انہوں نے اپنے آپ کو مین ٹین کر رکھا تھا۔اپنی عمر سے خاصے کم دکھائی دیتے تھے۔اکثر لوگ انہیں تیمور کے دادا کی بجائے والد سمجھا کرتے تھے۔صحت بھی قابلِ رشک تھی اور وہ خوراک اور مارننگ واک کے ذریعے اس کی (صحت) درازی عمر کے لیے ہمیشہ کوشاں بھی رہتے تھے۔

انہوں نے کتابِ زیست سے پرانے تمام ابواب نکال کر پھاڑ دیے تھے۔خوامخواہ ماضی کو یاد رکھنے کی بجائے وہ اپنے حال میں خوش رہتے تھے اور یہی سبق انہوں نے پوتے کو دیا تھا۔تیمور کی تربیت انہوں نے بے حد شاندار خطوط پر کی تھی۔اچھی تعلیم دلائی تھی۔اب وہ اپنی مرضی سے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔حالانکہ صوفی دادا نے اسے اپنے ذاتی کاروبار کے لیے سرمایہ کی آفر کی تھی مگر فی الحال وہ اس پر تیار نہیں تھا۔وہ اس کے لیے اصرار بھی نہیں کرتے تھے۔اصرار وہ صرف اس بات پر کرتے تھے کہ تیمور کو اب شادی کر لینی چاہیے۔وہ اکثر اسے چھیڑا کرتے کہ ''شادی کر لو برخوردار! ایک ڈیڑھ سال مزید گزر گیا تو تم بڈھے کو کسی نے اپنی بیٹی نہیں دینی۔'' لیکن تیمور ابھی ذمہ داریوں کا یہ طوق گلے میں ڈالنے کو تیار نہیں تھا۔اسے کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی تھی۔اس کا ٹیسٹ خاصا اونچا تھا۔اگر وہ شرٹ بھی خریدنے مارکیٹ جاتا تھا تو گھنٹہ گھنٹہ بھر چوائس کرنے میں ہی لگا دیتا تھا پھر یہ تو زندگی بھر کا معاملہ تھا۔انٹرنیٹ ایج کا یہ بندۂ محبت کے سلسلوں کا سرے سے قائل ہی نہیں تھا۔اس بات پر بھی صوفی دادا اکثر اس کا مذاق اڑاتے وہ کہا کرتے۔

''میں نے تمہاری دادی سے لو میرج کی تھی۔تمہارے باپ نے تمہاری ماں سے لو میرج کی تھی مگر تم۔لگتا ہے ہمارا خاندانی ریکارڈ خراب کر کے ہی چھوڑو گے۔''

اس کے کان پر مگر جوں نہیں رینگتی تھی۔اس کی تو گویا شادی بھی کرکٹ اور کرکٹرز سے ہو گئی تھی۔اس کے موڈز پر بھی کرکٹ بے حد اثر ڈالتی تھی۔اگر پاکستان اچھا میچ کھیل کر جیت جاتا تو تیمور صاحب کا موڈ بھی خوشگوار رہتا لیکن اگر کبھی ہار جاتا تو تیمور کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔اکثر ایسی امیچور حرکتیں کر جاتا اور پھر شرمندہ رہتا۔

اسی شرمندگی کے اثر سے اسے نکالنے کے لیے صوفی دادا جان بوجھ کر ہار گئے تھے اور اب خود جان بوجھ کر منہ لٹکا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

''صوفی دادا! آپ کو فخر تو ہوتا ہوگا ناں میری ذہانت پر؟''

''تم بات مت کرو مجھ سے کیونکہ میں بے ایمان لوگوں کی بات سننا اور ان سے بات کرنا پسند نہیں کرتا۔''

ڈائننگ ٹیبل پر کہنیاں ٹکائے اور سر جھکائے وہ بالکل پانچ سالہ بچے کی طرح لگ رہے تھے جو شرارت پکڑے جانے پر مار کھا کر بیٹھا ہو۔

''کھسیانا بلاّ کھمبا نوچے۔'' تیمور کو مسلسل گدگدی ہو رہی تھی انہیں اس طرح بیٹھا دیکھ کر۔

''تم مجھے بلاّ کہہ رہے ہو؟'' وہ مصنوعی غصے سے بولے۔

''نہیں کھمبا۔'' وہ اب دوسرے مگ میں کافی پھینٹ رہا تھا۔

''شرم تو نہیں آتی۔''

''شرم تو خود مجھ جیسے خوبرو جوان سے شرما جاتی ہے۔'' اس نے فرضی کالر جھاڑے۔

''ڈھیٹ کہو ڈھیٹ۔'' وہ چڑ کر بولے۔

''میں کچھ کہوں گا تو پھر پوچھیں گے بلا کہا ہے یا کھمبا؟'' وہ ان کو کافی کا مگ پکڑاتے ہوئے بولا پھر پین کو سنک میں رکھ کر پلٹا تو کال بیل بج اُٹھی۔

''دیکھو دروازے پر کون ہے؟'' دادا نے حکم دیا۔

''کیوں؟ کیوں؟ آج آپ کی باری ہے۔ میں آج صرف کچن کا کام نبٹاؤں گا۔'' وہ ہٹ دھرمی سے ڈائننگ ٹیبل کی چیئر پر ٹک گیا۔ ان کے یہاں ملازم اور ملازمہ موجود تھے مگر آج کل چھٹی پر تھے جس کی وجہ سے انہوں نے آپس میں کام بانٹ رکھے تھے جب کہ چوکیدار آٹھ بجے کے بعد آتا تھا۔

''بوڑھے دادا سے کام کرواتے ہو، دیکھنا ایک روز تمہارے پوتے بھی تم سے اسی طرح کام کروائیں گے۔'' وہ جانتے تھے تیمور نہیں اُٹھے گا اس لیے جاتے ہوئے بھی طعنہ دینا نہیں بھولے۔

''میں آپ کی طرح سُست نہیں ہوں۔ ان شاء اللہ ان کے کہنے سے پہلے ہی کام کر لیا کروں گا۔'' وہ بھی انہی کا پوتا تھا خاموش کیسے رہتا۔ دادا منہ بناتے باہر نکل گئے کچھ دیر بعد واپس آئے تو منہ مزید پھولا ہوا تھا۔

''خوامخواہ گیا۔ وہ تمہارا پوچھ رہا ہے۔''

''میرا پوچھ رہا ہے؟ کون ہے؟'' تیمور نے کافی کے بڑے بڑے گھونٹ بھرنے شروع کیے۔ ویڈیو سنٹر والا اس کے لیے 92 کے ورلڈ کپ کی ریکارڈنگ لے کر آنے والا تھا۔

''گندے سے حلیے میں ہے لگتا ہے کبھی منہ نہیں دھویا۔ میں نے کہا اندر آ جاؤ تو شرما کر منہ نیچے کر لیا۔''

''ہائیں شرما گیا؟ آپ کو دیکھ کر؟ میرا کوئی واقف کار اتنا بدذوق نہیں ہے صوفی دادا!''

''میں نے بھی پوچھا تھا کہ برخوردار! کہیں تم مجھے اپنی دلہن تو نہیں سمجھ رہے؟ اس بات پر تو وہ بالکل ہی ٹماٹر ہو گیا۔''

''ایسا نادر نمونہ کون آ گیا ہمارے دروازے پر؟'' وہ خالی مگ ٹیبل پر رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور جب کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کا منہ بھی پھولا ہوا تھا۔

''وہ بھکاری میرا پوچھ رہا تھا؟'' اندر آتے ہی غصے سے دریافت کیا، صوفی دادا چپ چاپ کافی کے سپ لیتے رہے۔

''میں کیا پوچھ رہا ہوں؟''

''میں نے اس بھکاری کو دس روپے دیئے تو بولا اللہ آپ کو اتنا دے جتنے آپ کے سر پر بال ہیں۔ میں نے سوچا یہ گھاٹے کا سودا ہے۔ میں تو گنجا ہوں۔ میں نے بھکاری سے روپے واپس لے کر کہا ٹھہرو میاں! میں بالوں والے کو بھیجتا ہوں پھر میں نے تمہیں بھیج دیا۔ فقیروں کی دعائیں جلدی لگتی ہیں یار! اور پھر تمہارے اتنے ڈھیر سارے بالوں کا کچھ تو فائدہ ہو۔''

O......❖......O

''تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا میں۔'' اسفر نے کمپیوٹر اسکرین کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ خاصی دیر سے آن لائن تھا اور ''سحر'' کے نک نیم سے چیٹنگ کرنے والی یا کرنے والے کی میل کا انتظار کر رہا تھا۔ دو دن پہلے اس نے ایک ای میل وصول کی تھی کہ۔

''میں ایک خوب صورت لڑکی ہوں اور تمہاری محبت میں مبتلا ہوں۔ اگر تم میرے بارے میں مزید جاننے کے خواہشمند ہو تو چار بجے آن لائن رہنا۔''

اسی لیے اسفر بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ خود بھی اکثر اوقات لڑکی بن کر نیٹ پر چیٹنگ کیا کرتا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ میل کسی لڑکے نے لڑکی بن کر کی ہے اور وہ اس کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے چند بٹن پش کیے تھے کمپیوٹر کھیل کھیلنے کے لیے تیار تھا۔

''کیا تمہیں میری بات کا یقین ہے اسفر؟'' پہلا سوال موصول ہوا تھا۔

''کس بات کا؟''

''یہی کہ میں تمہاری محبت میں مبتلا ہوں۔''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''تم نے کبھی مجھے نہیں دیکھا پھر تم میری محبت میں کیسے مبتلا ہو گئیں۔''

''میں نے تمہیں دیکھ رکھا ہے۔''

''مگر کہاں۔''

''تمہارا سپر اسٹور ہے ناں لبرٹی میں۔ وہاں دیکھا تھا۔''

''اسٹور پر میں اور میرے ابا دونوں ہی ہوتے ہیں کیا پتا تم نے انہیں دیکھ لیا ہو وہ بھی خاصے ہینڈسم ہیں روز خضاب لگاتے ہیں۔''

''جن کی شکل لنگڑے آم سے ملتی ہے؟''

''میں نے تمہارے نہیں اپنے ابا کی بات کی ہے۔ تمہارے ابا ہوں گے لنگڑے آم جیسے میرے ابا تو تربوز جیسے ہیں۔''

''وہ جو شلوار قمیص پہنتے ہیں؟''

''تو تمہارا کیا خیال ہے میں شلوار قمیص کے بغیر ہوتا ہوں۔ میں نے بھی شلوار قمیص پہن رکھا ہوتا ہے۔''

''وہ جن کی مونچھیں ہیں؟''

''میری بھی مونچھیں ہیں۔''

"وہ جو شکل سے ہی ابا لگتے ہیں؟"

"بالکل ٹھیک پہچانا۔ مجھے یقین آ گیا ہے تم نے اسٹور پر مجھے ہی دیکھا ہوگا۔ لیکن تم میری محبت میں اتنی جلدی کیسے گرفتار ہو گئیں؟"

"دراصل تمہاری شکل میرے مرحوم شوہر سے ملتی ہے۔ میں ان سے بہت محبت کرتی تھی۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں اسفر!"

"کیا؟ کب؟"

"جیسے ہی میرے دوسرے شوہر نے مجھے طلاق دی۔"

"کیا؟ یعنی تم شادی شدہ ہو؟ بچے کتنے ہیں؟"

"بچے نہیں ہیں۔"

"شکر ہے ورنہ میں تو ان کو پالتے پوستے ہی بوڑھا ہو جاتا۔"

"نہیں......نہیں اس کی فکر مت کرو بچے نہیں ہیں میرے بچیاں ہیں چھ۔"

"اچھا اب زیادہ بکواس نہیں کرو اور سچ سچ بتاؤ کون ہو؟ میرا نام کیسے جانتی ہو اور میرا ای میل ایڈریس کہاں سے لیا؟"

اسفر نے ہی ہار مان لی تھی۔ اب وہ "سحر" سے سیریس چیٹنگ کی تیاری کر رہا تھا۔

O......❖......O

"صوفی دادا! آپ یہاں بیٹھے رہیں گے نا؟ میں دس منٹ میں اکاؤنٹینٹ سے مل کر آتا ہوں۔" وہ انہیں اپنے آفس میں بٹھا کر باہر نکل گیا۔ صوفی دادا کو منتھلی چیک اَپ کے لیے فیملی ڈاکٹر کے پاس جانا تھا اور اس کے بعد انہیں کچھ ضروری چیزیں بھی خریدنی تھیں اس لیے وہ اس کے آفس ہی آ گئے تھے۔ تیمور کے کولیگز ان سے متعارف تھے اور ان کی باغ و بہار طبیعت کے باعث انہیں خاصا پسند کرتے تھے۔ تیمور اکاؤنٹینٹ سے مل کر آیا تو اس کی نیو لی اپائنٹڈ سیکرٹری ان کے پاس بیٹھی تھی۔ دادا نے ہتھیلی اس کے آگے پھیلا رکھی تھی اور وہ ان کی ہتھیلی میں کھوئی جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ تیمور قریب آیا تو سمجھ میں آیا کہ وہ پامسٹ بنی ہوئی ہے۔

"یہ جو زندگی کی لکیر کے ساتھ باریک سی لائن ہے یہ بتاتی ہے کہ آپ بہت لکی ہیں ذہانت کی لائن یہ والی ہے۔ پھر یہ لائن بتاتی ہے کہ آپ کی دو شادیاں ہوئی ہیں۔" وہ ایک ایک لائن کو دیکھ کر بتا رہی تھی۔

"بخدا نہیں میری تو ایک ہی شادی ہوئی ہے۔" دادا اس کی بات پر مکمل ایمان لے آئے تھے۔

"لیکن یہ جو لائن تھوڑی سی اوپر جا رہی ہے اس کے مطابق......"

"اس کے مطابق میری دو شادیاں ہوں گی اور میری تو ابھی ایک شادی ہوئی ہے یعنی ایک شادی کی گنجائش مزید ہے۔ سن رہے ہو پوتے! ایک شادی اور......" وہ تیمور کو چڑا رہے تھے پاس بیٹھی سیکرٹری صاحبہ ہنس دیں۔

"صوفی دادا! بڑے ہو جائیں۔ آپ کے دودھ کے دانت ٹوٹ گئے ہیں۔" اپنی سیکرٹری کے سامنے اسے دادا کی چونچلاہٹ پسند نہیں آئی تھی۔ سو دانت پیس کر بولا۔

"میرے تو ٹوٹ گئے ہیں اور تمہارے ابھی اُگے ہی نہیں ہیں بس داڑھی مونچھیں جلدی آ گئیں۔" جواب دینے میں وہ چوکتے نہیں تھے۔

"ہما! آپ پلیز باہر جائیں اور اپنا کام دیکھیں۔" اسے کھلکھلاتے دیکھ کر تیمور نے کھسکنا چاہا۔

"اچھی بچی ہے مخلص اور محبت کرنے والی۔" اس کے جانے کے بعد صوفی دادا ذو معنی لہجے میں بولے۔

"جی اس کے شوہر کا بھی یہی خیال ہے۔"

"لاحول ولا یعنی وہ شوہر والی ہے۔" انہیں دھچکا لگا۔ ہما خاصی کم عمر لگتی تھی۔

"لاحول ولا نہیں ماشاء اللہ کہتے ہیں خیر سے بچوں والی بھی ہے۔"

"مے آئی کم ان سر؟" اسی دوران کسی نے اجازت طلب کی تھی۔ تیمور نے دروازے کی سمت دیکھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی خاصی خوب صورت تھی مگر خاصی گھبرائی ہوئی بھی، عینک ناک کی نوک پر اس طرح سے ٹکی تھی جیسے ابھی اشارہ ملتے ہی سجدہ ریز ہو جائے گی۔ اجازت ملنے پر وہ اندر چلی آئی۔ صوفی دادا نے بے حد دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا تھا جس پر وہ گڑبڑا سی گئی۔ تیمور نے کھنکار کر انہیں الرٹ ہونے کی تاکید کی۔ کھانسی نے گویا کوڈ ورڈ کا کام کیا۔ وہ منہ بناتے سیدھے ہو گئے مگر نظریں سامنے ہی تھیں۔

"میں عائشہ ہوں۔" وہ خود کو پُر اعتماد ظاہر کرنے کے لیے فوراً بولی تھی۔

"میری بلا سے آپ خدیجہ ہو جائیں میں اعتراض کرنے والا کون ہوتا ہوں؟" تیمور چڑ کر بولا اسے دادا پر حیرت ہو رہی تھی جو مسلسل اس لڑکی کو گھور رہے تھے۔

"آپ......آپ تو کرسی پر نہیں بیٹھتے۔" وہ پھر گڑبڑا گئی تھی۔ اعتماد قائم رکھنے کے سارے وظیفے سامنے بیٹھے شخص کے جواب نے بھلا دیئے تھے۔

"تو آپ کا کیا خیال ہے میں پنکھے سے لٹکتا ہوں؟" اسے لگ رہا تھا کہ یہ لڑکی پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔

"ن......نہیں......میرا مطلب تھا کہ یہاں تو کوئی اور......کوئی اور......" اس بے چاری کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس شخص کے لیے کون سا صیغہ استعمال کرے جو مناسب ہو خاصی سوچ بچار کے بعد اسے سمجھ میں آ گیا۔

"یہاں تو کوئی اور بھائی بیٹھا کرتے تھے۔" صوفی دادا جو پانی پینے کے لیے گلاس کو منہ سے لگائے ہوئے تھے اس کی یہ بات سن کر ہنسی کو کنٹرول نہیں کر پائے نتیجتاً ہنسی کے ساتھ پانی بھی منہ سے اُبل پڑا چند چھینٹے تیمور پر بھی پڑے۔ ہنسی تو اسے بھی آ رہی تھی لیکن کھل کر نہیں ہنسا، جانتا تھا آفس میں اس کے مزاج کی ذرا سی نرمی صوفی دادا کو مزید پھیلنے کا موقع فراہم کرے گی سو سابقہ کرختگی کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

"آپ کا مطلب ہے یہاں آپ کے بھائی بیٹھا کرتے تھے؟"

"نہیں میرے بھائی تو نہیں تھے۔"

"پھر کس کے بھائی تھے؟"

"میرا مطلب ہے جس روز میں انٹرویو دینے آئی تھی یہاں کوئی اور آدمی تھے۔" وہ منمنائی۔

"تھے؟" تیمور کو حیرانگی سی ہوئی سمجھ تو اسے آ گئی تھی کہ وہ اسفر کی بات کر رہی ہے لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ وہ تو صرف اسفر کو بٹھا کر گیا تھا پھر وہ آدمی کون تھے جن کا یہ لڑکی ذکر کر رہی تھی۔

"کتنے آدمی تھے؟" وہ پوچھنے لگا۔

"تھے تو ایک ہی۔"

''تو پھر تمے کیوں کہہ رہی ہیں؟ تھا کہیے نا ایک آدمی تھا۔'' ریوالونگ چیئر کو اِدھر سے اُدھر گھماتا وہ بہت مزے سے اسے سمجھا رہا تھا۔

''جی......جی ایک آدمی تھا۔''

''یہ تمہیں آدمی کہہ رہی ہے؟'' صوفی دادا نے بھی ٹانگ اڑائی۔

''ہائیں آپ مجھے آدمی کہہ رہی ہیں؟'' وہ ذرا غصے سے بولا۔ ریوالونگ چیئر کی حرکت بھی رک گئی تھی۔

''ن......نہیں آپ کو تو نہیں کہہ رہی۔ وہ تو کوئی اور تھے......تھا۔'' وہ اپنی اَزلی گڑبڑاہٹ کا شکار ہو چکی تھی۔

''یعنی......یعنی آپ اسفر کو آدمی کہہ رہی ہیں؟ اگر وہ سن لے تو آپ کو شوٹ کر دے۔ ایک ستائیس سالہ جوان جہان لڑکے کو ''آدمی'' کہتے ہوئے ذرا خوف نہیں آیا آپ کو؟''

تیمور فارم میں آچکا تھا سو اب اس لڑکی کا اپنے حواسوں میں واپس آجانا بظاہر ناممکن تھا۔ وہ تو صوفی دادا کو ہی ترس آ گیا۔ لہجے میں مٹھاس پیدا کر کے بولے۔

''عائشہ! بیٹھ جاؤ اور اطمینان سے بات کرو۔ کیا ارادے ہیں تمہارے؟''

''اس کے ارادے نیک بھی ہو سکتے ہیں۔ آپ برائے مہربانی خاموش رہیں۔'' اس نے گھور کر کہا وہ ان کی رنگین مزاجی سے خاصا خائف تھا۔ عائشہ چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گئی۔

''فرمایئے کس مقصد سے تشریف لانا ہوا؟'' اب وہ سنجیدہ قسم کے معزز آفیسر کے روپ میں تھا۔

''وہ مسٹر اسفر نے مجھے سیکرٹری کی جاب کے لیے اپائنٹ کیا تھا۔'' اب کی بار اس نے اسفر کے نام کے ساتھ مسٹر لگانا مناسب سمجھا تھا۔

''آپ کو؟'' تیمور کو جھٹکا لگا۔

''دیکھیں بی بی! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ مسز ہما ارشد کو سیکرٹری اپائنٹ کیا گیا ہے اور وہ پچھلے تین دن سے ہمارے یہاں سروسز فراہم کر رہی ہیں۔''

وہ سمجھ گیا تھا کہ معصوم لڑکی اسفر کی چالاکی کا نشانہ بنی ہے اور ساتھ ہی اسے اسفر پر غصہ آیا جس نے اپنے اس ''کارنامہ'' کی تفصیلات اس سے مخفی رکھی تھیں۔

''لیکن......انہوں نے مجھے کہا تھا کہ اگر میں ایک ہفتہ کے اندر اندر......''

بات مکمل کیے بغیر وہ خاموش ہو گئی اسے یاد آیا تھا کہ اسفر نے سختی سے منع کیا تھا اپنے غیر شادی شدہ ہونے کی بات کسی کو نہ بتانا۔

''کیا کہا تھا اسفر نے؟ ایک ہفتہ کے اندر اندر......'' تیمور کو نامکمل رہ جانے والی بات ایک معمہ معلوم ہوئی۔

''یہ بات میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔ آپ صرف یہ بتا دیں اسفر صاحب کہاں ملیں گے؟'' وہ اب پُراعتماد لہجے میں کہہ رہی تھی۔ اسفر نے اسے جو بھی کہا تھا وہ اس پر مکمل طور پر ایمان لائے بیٹھی تھی۔

''آپ کی مرضی، لبرٹی چلی جائیں ''شیخ سنز'' اسٹور ہے وہاں۔ آج کل اسفر صاحب وہیں ملتے ہیں۔'' وہ کندھے اچکا کر بولا۔ اپنی طرف سے اس نے اسفر اور معزز خاتون کی دوسری ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔

''آپ کا مطلب ہے سپر اسٹور پر؟''

''جی ہاں سپر اسٹور پر [illegible] مگر اللہ بھلا کرے اس کے والد [illegible]''

''تمہیں اسفر سے کیا کام ہے؟'' صوفی [illegible] کی بکواس سن رہے تھے، بات کاٹ کر اس [illegible] دیوی سے پوچھا۔

''جاب کے سلسلے میں ملنا تھا۔'' وہ بہت [illegible] اندازہ ہو گیا تھا کہ اسفر نے اسے بے وقوف بنایا ہے لیکن یہ بات ابھی بھی سمجھ نہیں آئی تھی کہ اگر اس [illegible] کر رہا تھا۔''

''پہلے کہیں جاب کی ہے؟'' تیمور کو بھی ترس آ گیا تھا۔

''جی ہاں ایک کوچنگ سینٹر میں کچھ دن پڑھایا تھا۔'' اس کی آواز یکایک بھیگنے لگی تھی۔

''کتنے دن؟''

''دو دن۔'' ساتھ ہی دو آنسو لپک جھپک کر آنکھوں سے باہر آئے اور گالوں پر پھسلتے چلے گئے۔

''کیا پڑھاتی تھیں؟'' تیمور اور صوفی دادا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر تیمور تو منہ نیچے کر کے مسکرانے لگا جب کہ دادا نے سوال کیا۔

''انگلش اور میتھس۔'' اب وہ مسلسل رو رہی تھی۔

''میتھس اور انگلش؟'' تیمور نے ٹشو پیپر کا ڈبہ اس کے آگے رکھا اور ساتھ ہی شرارت سے دریافت کیا۔ عائشہ سمجھ نہیں پائی۔ ٹشو نکال کر اس نے ناک کے آگے رکھا پھر زور سے ناک صاف کر کے بولی۔

''نہیں انگلش اور میتھس۔''

''یعنی میتھس اور انگلش؟''

''نہی میتھ......آں۔'' اب کی بار وہ شرارت کو سمجھ گئی تھی پھر جو اس نے رونا شروع کیا تو چپ کروانا مشکل ہو گیا۔ تیمور کو ہنسی بھی آ رہی تھی اور غصہ بھی، روتے روتے عائشہ اٹھی تھی پھر بیگ کو بازو میں اڑس کر دروازے کی طرف چل دی۔ دروازے تک پہنچ کر یک دم کچھ یاد آیا تو واپس مڑی۔ اس کے ٹیبل کے قریب آکر بولی۔

''آپ بہت گندے آدمی ہیں۔ اللہ کرے......اللہ کرے آپ گنجے ہو جائیں اور اور آپ کی شادی......آپ کی شادی بو برال سے ہو جائے۔'' غصے میں وہ مردانہ زنانہ سب بھول گئی تھی۔ اس کی بددعا نے صوفی دادا کو کھلکھلانے پر مجبور کر دیا۔ جب کہ تیمور یک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ دروازے تک جاتی عائشہ پھر مڑ آئی تھی۔

''خدا خیر کرے اب کچھ سر میں نہ مار دے۔'' تیمور نے اسے واپس آتا دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔ وہ غصے سے پھر ٹیبل تک آئی ٹشو پیپر کے ڈبے سے چار پانچ ٹشوز ایک ساتھ نکالے اور ناک پر رکھ کر شوں شوں کرتی باہر نکل گئی۔

''آپ اب کہاں جا رہے ہیں۔'' صوفی دادا کو اپنی جگہ سے اٹھتا دیکھ کر تیمور نے کہا۔

''اس کے پیچھے جا رہے ہیں۔'' بہت اطمینان سے کہا گیا۔

''اس کے پیچھے؟'' تیمور نے دروازے کی طرف انگلی کر کے حیرانگی سے استفسار کیا۔

''سنا نہیں تم نے میرے ہاتھ میں شادی کی ایک اور لائن ہے۔'' وہ اسے ہکا بکا چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ ان کے باہر نکلتے ہی اس نے ریسیور اٹھا کر اسفر کی طرف کال ملائی تھی۔

O......❖......O

اسفر کمپیوٹر کے آگے بیٹھا وہی کھیل کھیلنے میں مصروف تھا جس کے پیچھے آج کل ساری پاکستانی قوم پاگل ہوئی، ہوئی ہے۔ جی ہاں وہ چیٹنگ کر رہا تھا۔

آج مسلسل دسواں روز تھا اسے ''سحر'' نامی لڑکی سے چیٹنگ کرتے ہوئے۔ شروع شروع میں اسفر کو شک تھا کہ ''سحر'' کے نک سے چیٹنگ کرنے والی شخصیت لڑکا ہے۔ اسی لیے اسفر اس سے اس قسم کی باتیں کرتا جس سے اس کے کردار کی وضاحت ہو سکے۔ مثلاً کبھی اس سے کبڈی کے متعلق باتیں کرتا یا پھر ریسلنگ اور ریسلرز کے متعلق انفارمیشن اکٹھی کرتا۔ سحر کی ناقص معلومات سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ لڑکی ہی ہے۔

انتھراکس کے متعلق اسے کچھ بھی پتا نہیں تھا مگر بلش آن اور آئی شیڈوز کی تمام اقسام جو مارکیٹ میں دستیاب تھیں وہ بخوبی واقف تھی۔ دس روز گزر جانے کے باوجود اسفر کو اس کے ساتھ چیٹنگ کرنے میں مزا آ رہا تھا۔ لیکن ایک تجسس تھا کہ آخر یہ سحر ہے کون؟ اسے کیسے جانتی ہے۔ سحر نے اپنے متعلق یہ تمام باتیں اسفر کو بتائی تھیں مگر اسے یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

وہ اس کے جھوٹ کو پکڑنے کے لیے بے تاب تھا مگر کامیابی نہیں ہو رہی تھی کیونکہ سحر نے اپنا ای میل ایڈریس بھی نہیں دیا تھا۔

آج بھی وہ اس سے اصرار کر رہا تھا کہ اپنا ای میل ایڈریس دے دو مگر وہ انکار کر رہی تھی۔

''آخر تم اپنا ای میل ایڈریس کیوں نہیں دیتیں مجھے؟''

''میں ہر روز خود تم سے رابطہ کر تو لیتی ہوں پھر بھی تم اس بات پر اصرار کیوں کرتے ہو؟''

''اچھا پھر فون نمبر ہی دے دو۔''

''اب وہ کس لیے؟''

''میں تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں سحر......''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت بے سُری ہوں میں۔''

''اور مجھے نصیبو لعل کے گانے بہت پسند ہیں۔''

''خیر اب اتنی بے سُری بھی نہیں ہوں۔''

''سنو تمہارا دل نہیں کرتا مجھے دیکھنے کو؟''

''نہیں۔''

''نہیں؟ مگر کیوں؟''

''کیونکہ میں نے تمہیں دیکھ رکھا ہے۔''

''کہاں؟ کب؟''

''بچپن میں دیکھا تھا۔''

''بچ...... پن میں، اتنی پرانی بات ہے تم بھول گئی ہو گی۔''

''نہیں میری یادداشت بہت اچھی ہے۔ میں ایک دفعہ جو چیز دیکھ لوں اسے نہیں بھولتی۔''

''تمہیں کیسے پتا کہ تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے؟''

''مجھے اپنی سالگرہ کبھی نہیں بھولتی۔''

''بہت اچھے، پھر تو یقیناً تمہیں اپنی صحیح عمر بھی یاد رہتی ہو گی۔ جلدی سے بتاؤ۔ خیر سے عمرِ عزیز کی کون سی بہار چل رہی

ہے؟''

''اب اتنی اچھی یادداشت بھی نہیں ہے۔''

''تم خواتین اپنی عمر کے بارے میں اتنی کانشس کیوں رہتی ہو؟''

''تم مردوں کی وجہ سے جہاں کوئی لڑکی ایکس کی ہوتی ہے۔ تم لوگ اسے آنٹی کہنا شروع کر دیتے ہو۔ اسی وجہ سے تو خواتین پانچ پانچ چھ چھ مرتبہ بیس کی ہونا پسند کر لیتی ہیں مگر ایکس کی ہونا کوئی پسند نہیں کرتی۔''

''تو میں فرض کر لوں کہ تم بیس کی ہو؟''

''تمہاری مرضی ویسے بیس میں دو تین سال مزید جمع کر لو تو بہتر رہے گا۔''

''ویسے میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں جس لڑکی سے آج کل میرے رشتے کی بات چل رہی ہے وہ بھی تقریباً تمہاری ہی ہم عمر ہو گی۔''

''تم...... تم شادی کر رہے ہو؟''

''نہیں میں...... میں منگنی کر رہا ہوں۔''

''اچھا مجھے کچھ کام ہے پھر بات کریں گے۔''

اسفر نے حیرانگی سے اسکرین کی طرف دیکھا کہ آخر وہ اس بات پر برا کیوں مان گئی۔ وہ بے وقوف نہیں تھا اور خوش فہم تو بالکل بھی نہیں تھا۔ جانتا تھا کہ وہ لڑکی اس سے محبت نہیں کرتی بس مذاق کر رہی ہے اور شغل شغل میں وہ بھی اس سے چیٹنگ کر لیا کرتا تھا مگر ایک دم سے اس کا غائب ہو جانا کچھ حیران کن تھا حالانکہ اس نے اسے پہلی مرتبہ اپنے بارے میں کوئی سچی بات بتائی تھی۔ اس کے ابا اس کے لیے اپنے دوست کی بیٹی کو پسند کر چکے تھے اور دونوں خاندان آج کل اپنے دوستی کے رشتے کو مزید استحکام بخشنے کے لیے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ اسفر نے فائزہ کو ایک تقریب میں دیکھ رکھا تھا اور وہ دل و جان سے اس شادی کے لیے تیار تھا۔

O......❖......O

''کیا کر رہی ہو؟'' آواز پر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ عائزہ بالکل اس کے پاس کھڑی تھی اور شاید خاصی دیر سے کھڑی تھی لیکن وہ چیٹنگ میں اتنی محو تھی کہ احساس ہی نہیں ہو سکا۔ عائزہ اس سے تین سال چھوٹی تھی مگر دوست کی طرح بے تکلف تھی۔

''تم کب سے کھڑی ہو عائزہ؟'' وہ کمپیوٹر سے ہٹ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''جب سے تم ایک معصوم شخص کو بے وقوف بنا رہی ہو تب سے ہی کھڑی ہوں۔'' عائزہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''کیا نام ہے تمہارے نئے نیٹ فرینڈ کا؟''

''اسفر'' اس نے اس طرح سے نام بتایا جس طرح اسفر کو کچا چبانے کا ارادہ ہو۔

''اسفر؟ یہ وہی ہے نا کارڈ والا؟''

''بالکل وہی ہے کارڈ والا۔ نواب زادہ۔''

''یار! میں تمہارا مقصد نہیں سمجھ پائی۔'' وہ کچھ حیرانگی سے کہہ رہی تھی۔

''انتقام عائزہ! انتقام۔ میرا مقصد انتقام ہے۔''

''اچھا مگر کس طرح؟''

’’بس دیکھتی جاؤ......اب یہ بتاؤ تم کس لیے آئی تھیں۔ کیا امی کا کوئی پیغام لائی ہو۔‘‘
’’تمہاری متوقع ساس تشریف لا رہی ہیں یہی بتانے آئی تھی۔‘‘
’’خوامخواہ ساس مت کہو۔ ابھی تو صرف بات چل رہی ہے۔ کیا پتا ایسا نہ ہو جیسا تم سوچ رہی ہو۔‘‘ وہ چڑ کر بولی۔
’’لیکن امی ابو تقریباً راضی ہی ہیں۔‘‘ عائزہ بہن کی بات پر کچھ پریشان ہوگئی۔
’’لیکن میں تو راضی نہیں ہوں ناں اور پھر میں تو ابھی اس پرنس چارمنگ کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی۔‘‘
’’تو میں تمہیں بتاتی ہوں ناں۔‘‘ عائزہ اس کا ہاتھ تھام کر ایک ایک تفصیل بتانے لگی۔



اس نے جھجکتے ہوئے کال بیل پر ہاتھ رکھا۔ وہ پہلی دفعہ اس علاقے میں آئی تھی۔ پرانی انارکلی کے تنگ اور اونچے مکانوں میں سے ایک مکان میں رہنے والی عائشہ کے لیے گلبرگ ایک طلسم کدہ ثابت ہو رہا تھا۔ وہ بہت محدود ذہنی کینوس کی مالک معصوم سی لڑکی تھی۔ جس کی دنیا سکول سے گھر، گھر سے سکول اور پھر گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک تھی۔ مختلف مزاج کے لوگوں سے ملنا انہیں ڈیل کرنا اسے نہیں آتا تھا اور شانِ بے نیازی، لاحظہ ہو، شوق ہوا تھا نوکری کا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اسے پرسنل سیکرٹری کی جاب مل چکی ہے بس ذرا سا غیر شادی شدہ ہونے کا مسئلہ تھا جو اس کے نزدیک بہت بڑا مسئلہ نہیں تھا اور پھر اس کے باس کے دادا صفدر حسن نے اسے یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ اس کا یہ مسئلہ چٹکی بجاتے حل کر دیں گے۔ اسی لیے انہوں نے اسے اپنے گھر بلایا تھا۔ چونکہ آج وہ ان کے گھر آئی تھی اس لیے ظاہری تیاری پہ خاصا دھیان دیا تھا۔ پنک کلر کے اسٹائلش سے سوٹ میں وہ خاصی پیاری لگ رہی تھی۔ میک اپ تو خیر بھابی اسے شاید اپنی شادی پہ بھی نہ کرنے دیتیں۔ انہیں یہی فکر رہتی تھی کہ میک اپ کر کے میری نند کہیں مجھ سے زیادہ خوب صورت نہ لگنے لگے سو میک اپ نہیں کیا ہوا تھا۔ آج عینک کی بجائے کانٹیکٹ لینز استعمال کیے گئے تھے۔ ان سب تیاریوں کی بدولت وہ خاصی پُراعتماد لگ رہی تھی لیکن اگر خاموش رہتی تو۔ اپنے ہی دھیان میں بیل پہ ہاتھ رکھے وہ مگن کھڑی تھی جب گیٹ کھول دیا گیا مگر اس نے اب بھی بیل پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔
’’کیا چاہیے؟‘‘ چیخ کر پوچھا گیا۔
’’تیمور حسن۔‘‘ معصومیت کبھی کبھی ذلیل بھی کروا دیتی ہے لیکن ’’معصوم‘‘ کو اس چیز کا ادراک یا تو ہوتا نہیں ہے یا پھر بہت دیر سے ہوتا ہے
’’جی......ای۔‘‘ اس کے جواب نے تیمور حسن کو خود حیران کر دیا۔ وہ جو کوئی بھی تھی خاصی خوب صورت تھی لیکن خوب صورت ہونے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اس سے خود اس کا ہی مطالبہ کر دیتی۔ تیمور کی حیرانگی نے اس لڑکی کو چونکا دیا۔
’’وہ......میرا مطلب تھا۔‘‘
’’مطلب بعد میں بتایئے گا پہلے بیل پر سے تو ہاتھ اٹھایئے۔‘‘ اب کی بار وہ چیخ کر بولا۔ عائشہ نے گڑبڑا کر بیل سے ہاتھ اٹھا لیا اور دل ہی دل میں خود کو کوسا۔ وہ تہیہ کر کے آئی تھی کہ آج کوئی بے وقوفی نہیں کرنی مگر سامنے کھڑے شخص کی آنکھیں اسے کنفیوژ کر دیتی تھیں۔
’’آئی ایم سوری۔‘‘ وہ شرمندگی سے کہنے لگی۔
’’اوہ......‘‘ تیمور نے سیٹی بجائی اس نے عائشہ کو پہچان لیا تھا۔
’’تو یہ آپ ہیں؟‘‘ وہ پورے کا پورا گیٹ سے باہر آگیا...... عائشہ کا سر مزید جھک گیا۔

’’آج تو آپ پہچانی نہیں جا رہیں۔ جلدی بتائیں ڈپلیکس سے آ رہی ہیں یا نیو لک سے۔‘‘ حالانکہ دیکھ رہا تھا اس کا چہرہ میک اپ سے بے نیاز ہے۔ پھر بھی پوچھ لیا وہ بھی اس انداز میں کہ بے چاری عائشہ ڈر کے کہنے لگی۔
’’قسم اللہ کی کہیں سے نہیں آ رہی۔ سیدھی گھر سے آ رہی ہوں۔‘‘
’’لیکن ہمارے یہاں قدم رنجہ کس لیے فرمایا ہے۔‘‘
’’قدم رنجہ؟ فرمایا؟ یقین کریں جناب میں نے کچھ نہیں فرمایا۔ فرمایا تو قائداعظم کرتے تھے۔‘‘
’’میرا مطلب تھا یہاں کس لیے تشریف لائی ہیں۔‘‘
’’میں تو کچھ بھی نہیں لائی، خالی ہاتھ آئی ہوں۔ آپ مجھے بے وقوف کیوں بنا رہے ہیں؟‘‘ وہ بے چارگی سے کہنے لگی۔
’’خیر بنے بنائے پر تو میں ٹائم ضائع نہیں کیا کرتا۔‘‘ عجب شانِ بے نیازی سے کہا گیا۔
’’دیکھیں پلیز آپ مجھے تنگ نہیں کریں۔ مجھے آپ کے دادا نے بلایا تھا۔ آپ ان کو بلا دیں۔‘‘
’’میرے دادا نے؟‘‘ وہ حیران ہوا۔
’’کس لیے؟‘‘
’’وہ...... مجھے ان سے ضروری بات کرنی ہے۔‘‘ اس نے بات بنائی۔
’’کیا بات کرنی ہے؟‘‘ تیمور سنجیدہ ہو چکا تھا۔
’’یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔‘‘
’’تو میں آپ کو اندر نہیں آنے دے سکتا۔ پہلے وہ بات بتائیں جو آپ کو صوفی دادا سے کرنی ہے۔‘‘ تیمور نے ٹرمپ کارڈ استعمال کیا۔ وہ ساری بات اسی سے اگلوانا چاہتا تھا کیونکہ جانتا تھا صوفی دادا اسے کچھ نہیں بتائیں گے۔
’’وہ......وہ مجھے ان سے شادی کی بات کرنی ہے۔‘‘ وہ اُگل گئی۔
’’شادی کی؟ صوفی دادا سے؟‘‘ تیمور اچھل ہی تو پڑا۔
’’جی ہاں۔‘‘ عائشہ نے سر جھکا کر کہا۔
اتنی دیر میں صوفی دادا خود بنفس نفیس گیٹ تک چلے آئے پھر عائشہ کو دیکھ کر یوں کھل اٹھے جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ تیمور ان دونوں کو حیرانگی اور کسی قدر پریشانی سے اندر کی طرف جاتا دیکھ رہا تھا۔ ذہن کی اسکرین پر فل سائز اخبار جگمگانے لگا تھا جس کی ہیڈ لائن تھی۔
’’ستر سالہ بوڑھے نوجوان کی بائیس سالہ نوجوان لڑکی سے لو میرج۔‘‘

O......❖......O

’’عائزہ! تم سچ کہہ رہی ہو؟‘‘ فائزہ ہکا بکا رہ گئی تھی تمام باتیں سن کر۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جس لڑکے کے ابو اس کے رشتے کی بات چلا رہے ہیں وہ وہی لڑکا ہے جس کے ساتھ چیٹنگ میں وہ کئی کئی گھنٹے صرف کرتی ہے اور جس سے وہ اپنی انسلٹ کا بدلہ لینا چاہتی ہے۔ اسفر کے متعلق اسے اس وزیٹنگ کارڈ سے پتا چلا تھا جو کئی روز پہلے فائزہ نے اسفر کے والٹ سے گر جانے پر اٹھایا تھا۔ ابو کے دوست کے حوالے سے تو وہ اسفر کو بالکل نہیں جانتی تھی نا ہی اس نے اسے دیکھا تھا کہ ابو اپنی دوستیاں گھر سے باہر

رکھنے کے عادی تھے۔ یہ شادی بھی قطعاً ارینجڈ تھی۔ اسفر کو اس نے پہلی دفعہ تب دیکھا تھا جب وہ کیمپس ایریا کی طرف چندہ جمع کرنے کی غرض سے گئی تھی۔ اس نے اپنی فرینڈز کے ساتھ مل کر ایک چھوٹی سی این جی او بنا رکھی تھی جو معذور افراد کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتی تھی۔

این جی او کے اخراجات اِدھر اُدھر سے امداد و عطیات جمع کر کے پورے کیے جاتے تھے۔ اس روز عطیہ نے بیٹھے بیٹھے مشورہ دیا کہ یونیورسٹی چلتے ہیں۔ اسٹوڈنٹ قوم خاصی باشعور واقع ہوتی ہے۔ ٹھیک ٹھاک رقم اکٹھی ہو سکتی ہے۔ عطیہ کے مشورے پر عمل کر کے وہ سب یونیورسٹی چلی آئی تھیں۔ سب ہی نے پرانے کالج کے یونیفارم زیب تن کیے تھے اور خود کو لاہور کالج کا طالب علم ظاہر کیا تھا سوشل ورک کی اسٹوڈنٹس سمجھتے ہوئے بہت سے لوگوں نے ان کی مدد کی تھی۔ وہ سب خاصی خوش تھیں۔ فائزہ کو بھی خوشی ہو رہی تھی اور یہ خوشی قائم رہ سکتی تھی اگر اسفر اسے نہ ملتا۔ اچھا خاصا مہذب، ہینڈسم آدمی تھا۔ ایک کھوکھے پر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا پہلے پہل تو فائزہ نے اہمیت نہیں دی اور کھوکھے کے مالک سے بحث کرتی رہی مگر وہ وہاں سے کچھ نہ ملا تو ایک اور دکان کی طرف ہو گئی۔ عطیہ، سعدیہ اور مائدہ وغیرہ تو یونیورسٹی ڈیپارٹمنٹس کے اندر رہی تھیں مگر باہر آ کر امداد طلب کر رہی تھی۔ اسفر کو کھوکھے پر کھڑے ہو کر سگریٹ پیتا دیکھ کر وہ اسے ''ایویں'' قرار دے کر آگے بڑھ گئی مگر جب اسی کو دوبارہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھتا دیکھا تو لپک کر آ گئی۔ وہ والٹ سے بل نکال رہا تھا۔ فائزہ نے پوری آنکھیں کھول کر اس کے بھرے ہوئے والٹ کو دیکھا تھا۔ بل نکالنے کے دوران اس نے کوئی کارڈ نیچے گرا دیا تھا مگر بے دھیانی میں دیکھ نہیں سکا۔ فائزہ اس کے قریب آ گئی اور پھر ان کی ٹھیک ٹھاک جھڑپ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ وہ تو گاڑی بڑھا لے گیا مگر فائزہ کھڑی اسے خاصی دیر تک بددعائیں دیتی رہی تھی۔ زہر لگتے تھے اسے ایسے لوگ جو انسانیت کی مدد کے لیے تو روپیہ نہیں نکال سکتے تھے اور لاکھوں کی گاڑیوں میں مزے سے گھومتے تھے۔

بددعائیں دے چکنے کے بعد اس کی نگاہ کارڈ پر پڑی تھی جو نیچے گرا ہوا تھا۔ اس نے کارڈ اٹھا لیا کارڈ پر جلی حروف میں ''شیخ سنز'' لکھا تھا۔ کارڈ سے ہی اسے معلوم ہوا تھا کہ یہ لبرٹی کے کسی سپر اسٹور کے مالک کا کارڈ ہے۔ کارڈ کے پیچھے بال پوائنٹ سے ایک ای میل ایڈریس لکھا تھا اور نام بھی لکھا تھا اسفر، فائزہ کو یقین تھا کہ نام انہی حضرت کا ہے۔ وہ کارڈ اس نے بیگ میں رکھ لیا تھا پھر اچھی طرح سے پلان کر کے اس نے اسفر کو پہلی ای میل بھیجی تھی۔ وہ ٹھیک ٹھاک چالاک آدمی تھا اس کی باتوں میں نہیں آیا تھا۔ فائزہ کا خیال تھا چکنی چپڑی باتیں کر کے اسے بے وقوف بنائے گی۔ اسے اپنی محبت کا یقین دلائے گی اور ملنے پر مجبور کرے گی اور جب وہ ملنے آئے گا تو سب سہیلیاں مل کر اس کا ریکارڈ لگائیں گی لیکن اب خود اس کا ریکارڈ لگنے والا تھا۔ اس کی شادی اسی آدمی سے ہونے والی تھی۔

''عائزہ! تم سچ کہہ رہی ہو ناں؟'' ایک دفعہ پھر بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں بابا! بالکل سچ ہے یہ۔ مگر تم اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟''

''عائزہ! عائزہ! یہ وہی اسفر ہے جس سے میں ابھی چیٹنگ کر رہی تھی۔'' وہ سر پکڑ کر کہہ رہی تھی۔

''ہائیں یعنی تمہارا نیٹ فرینڈ؟'' وہ بھی حیران ہوئی۔

''نیٹ فرینڈ مت کہو۔ دشمن ہے وہ میرا۔ سخت نفرت ہے مجھے اس سے.....''

''کیا اتنا بدصورت ہے؟'' عائزہ کی شرارت کو محسوس کر کے وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تصور کی عینک سے اسفر کے وجیہہ سراپے کو دیکھتی وہ عائزہ کے ساتھ والی چیئر پر آ بیٹھی۔

''بات صورت کی نہیں ہوتی۔ بات کردار کی ہوتی ہے۔''

''ہیں؟ تو فائزہ اسفر بھائی بدکردار ہیں؟'' لفظوں کا چناؤ غلط ہو تو معنی اور طرح کے کپڑے پہن لیتے ہیں۔

''افوہ بدکردار نہیں ہے وہ۔ بداخلاق ہے۔ اس کے دل میں انسانیت کے لیے ہمدردی نہیں ہے۔ اسے عورتوں کی...... میرا مطلب ہے لڑکیوں کی عزت نہیں کرنی آتی۔ پلیز عائزہ! تم امی سے کہہ دو میں اس سے شادی نہیں کر سکتی۔'' وہ بہن کی منت کر رہی تھی۔

''امی سے تو کہہ دوں گی مگر ابو سے کون کہے گا۔ جانتی تو ہو ہمارے ابو سونے کے نوالے اور شیر کی نظر والے محاورے کی کتنی بری طرح پیروی کرتے ہیں اور پھر انہیں پتا چل گیا کہ تم نے نیٹ کنکشن اس مقصد کے لیے لیا ہوا ہے تو صرف بے عزتی نہیں ہو گی۔ یوں بھی تمہاری ساس آج مٹھائی لے کر آ رہی ہیں اور ہمارے جیسے گھروں میں مٹھائی لانے کا مطلب آدھی منگنی ہوا کرتا ہے۔'' عائزہ نے بڑی بہن کو ماں بن کر سمجھانے کی کوشش کی۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے مگر اسفر؟'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''فائزی! ہو سکتا ہے یار تمہیں غلط فہمی ہو گئی ہو۔ میں ملی ہوں اسفر بھائی سے اچھے خاصے ہینڈسم ہیں۔ پھر غصے میں تو انسان یوں بھی......'' اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''نہیں عائزہ! مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔'' وہ دوٹوک لہجے میں کہتی اٹھ گئی۔



''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو گی۔'' عائشہ نے شرما کر کہا۔ وہ ایک ہفتہ بعد پھر ان کے گھر تھی۔

''میں نے محسوسات سے پہچانا ہے عائشہ! یہ محبت ہے۔'' صوفی دادا اس کے سامنے بیٹھے کہہ رہے تھے۔ احساسات کو محسوسات کہتے ہوئے انہیں اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ غلط اردو بول رہے ہیں۔

''محبت اتنی جلدی کیسے ہو سکتی ہے؟'' وہ بے چاری یقین اور بے یقینی کے درمیان کھڑی تھی۔

''پہلی نظر کی محبت کے بارے میں کچھ نہیں سنا تم نے؟'' وہ لگاوٹ سے بولے تیمور آفس میں تھا اس لیے وہ کھل کر بات کر رہے تھے۔

''لیکن سر؟''

''اب سر تو مت کہو۔ اتنا بے گانہ سا احساس ہوتا ہے۔''

''پھر کیا کہوں؟''

''صفی دا...... نہیں کچھ مت کہو بس ایسے ہی ٹھیک ہے۔'' تیمور کو آتا دیکھ کر وہ بات پلٹ گئے۔ تیمور ہیلو ہائے کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ دھیان ہی نہیں دے سکا عائشہ اسے دیکھ کر بے وجہ شرما رہی ہے۔ اسے عائشہ کا اپنے یہاں آنا پسند نہیں تھا کجا وہ اسے دادا کو دادا کہنے کی اجازت دیتا۔

''تم نے اپنے گھر میں بات کی ہے؟''

''کس بارے میں؟''

''شادی کے بارے میں؟''

''کس کی شادی کے بارے میں؟'' وہ بھول چکی تھی۔ دادا کا دل چاہا سر پیٹ لیں۔

"اپنی شادی کے بارے میں بے وقوف...... میں نے تم سے کہا تو تھا اس روز۔"

"ہائے اللہ! میں خود کیسے بات کروں اپنی شادی کی۔ بھابی تو میری جان نکال دیں گی۔" وہ ڈر کر کہنے لگی۔ صوفی دادا کو اپنی چوائس پر افسوس ہونے لگا۔

"دیکھو میں اب ڈائریکٹ آ کر تو بات نہیں کر سکتا ناں۔ یہ مناسب نہیں لگتا۔ پہلے تم خود بات کرو۔ اپنے گھر کی رائے عامہ کو ہموار کرو پھر میں بات کروں گا۔" وہ اسے سمجھا رہے تھے۔ مگر اس کے چہرے کے زاویے 36 ڈگری پر ٹھہر گئے تھے۔

"رائے عامہ؟" نا سمجھی سے دریافت کیا گیا ہے۔

"میرا مطلب ہے بھائی بھابی۔"

"نہیں سر بھابی کی تو خیر ہے مگر بھائی بہت ڈانٹیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ ایک جڑ بھی دیں۔ مگر بھائی سے بہت ڈر لگتا ہے۔" معصومیت سے کہتی وہ صوفی دادا کو اور بھی اچھی لگی مگر ذرا سی پریشانی بھی ہوئی۔ جس کام کو وہ آسان سمجھ رہے تھے اتنا آسان نہیں تھا۔

ان کا خیال تھا لڑکی راضی ہو جائے گی تو تیمور سے بات کریں گے۔ لیکن اب لگ رہا تھا تیمور سے پہلے بات کرنی چاہیے انہیں یقین تھا تیمور زیادہ اعتراض نہیں کرے گا مگر ان کا یقین منہ کے بل گرا تھا۔ وہ اچھی طرح سے تیار ہو کر اسفر کی طرف جانے کے لیے نکلا تھا۔ اسفر نے اسے فون پر بتایا تھا کہ وہ آج کل سحر نامی کسی لڑکی کو انٹرنیٹ پر بیوقوف بنا رہا ہے لیکن لڑکی اتنی چالاک ہے کہ بے وقوف نہیں بن رہی۔ اسی لیے تم میری مدد کرو۔ تیمور ہائکنگ ایکسپرٹ تھا۔ ان دونوں نے مل کر پلان کیا تھا کہ اب جب دوبارہ لڑکی آن لائن ہو گی تو اسے وائرس والا فولڈر پارسل کریں گے جو اس لڑکی کو اور اس کے کمپیوٹر کو مزا چکھا دے گا۔ اسی مقصد کے لیے وہ اسفر کی طرف جا رہا تھا صوفی دادا لاؤنج میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ اس کو آتا دیکھ کر اخبار سائیڈ پر رکھ دیا مگر وہ چپ چاپ باہر جانے لگا تو اسے آواز دی۔

"بات سنو برخوردار!" تیمور چپ چاپ پاس آ کھڑا ہوا۔

یونہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر بھی رہا کرو
یہ غزل کی سچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو

دوسرا مصرع خود اپنی طرف اشارہ کر کے کہا گیا۔

"آ تو جاتی ہے وہ غزل کی سچی قاری روز پڑھنے کے لیے۔" جل کر شکوہ کر ہی دیا۔

"عائشہ کی بات کر رہے ہو؟" وہ عینک کے اوپر سے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"اور کون آتا ہے روز یہاں؟"

"تمہیں عائشہ کے آنے پر اعتراض ہے یا پھر اس کے روز آنے پر اعتراض ہے؟"

"ایکسکیوزمی! میں کون ہوتا ہوں اعتراض کرنے والا۔ اگر میری آپ کے نزدیک کوئی اہمیت ہوتی تو آپ یہ سب نہ کرتے۔" وہ بالکل ہی آؤٹ ہو رہا تھا۔ دادا نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔ اتنی بدتمیزی سے وہ کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ مذاق کی بات اور تھی مگر سنجیدگی میں اس نے ایسا رویہ کبھی نہیں اپنایا تھا۔

"میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ اس گھر کو اب ایک عورت کی ضرورت ہے اور اگر تم کوئی فیصلہ نہیں کرو گے تو میں خود......"

"آپ خود...... یعنی آپ خود...... دادا...... صوفی دادا۔" اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کہے۔

"آخر تمہیں کس بات پر اعتراض ہے؟ وہ بہت اچھی لڑکی ہے ہاں تھوڑی معصوم ہے لیکن میں اسے ٹھیک کر لوں گا یقین کرو وہ بدل جائے گی۔"

"یہی تو اعتراض ہے کہ وہ بہت معصوم ہے۔ معصومیت میں ہی ماری جائے گی بے چاری اور آپ بار بار اعتراض کا پہاڑہ کیوں پڑھ رہے ہیں۔ کوئی اعتراض نہیں ہے مجھے۔"

"دیکھو تیمور! میں بہت لبرل آدمی ہوں۔ اپنی غلطی بہت آرام سے مان لیتا ہوں۔ میں نے تم سے پہلے بات کی تھی مگر تم نے سیدھی طرح سے کوئی جواب نہیں دیا۔ چلو یہ بھی میری غلطی ٹھہری۔ لیکن تم صاف صاف بات کرو اگر تمہیں غصہ آ رہا ہے تو میں رہنے دیتا ہوں۔" وہ بہت رسانیت سے کہہ رہے تھے۔ پوتے کا یہ موڈ انہوں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا تیمور کو بھی یک دم احساس ہوا۔ اس لیے ذرا نرمی سے بولا۔

"میں غصہ نہیں کر رہا صوفی دادا! مگر پلیز آپ خود سوچیں لوگ کیا کہیں گے؟"

"کلاس ڈیفرنس کی وجہ سے کہہ رہے ہو؟" وہ پوتے کو نظروں میں تول رہے تھے۔

"نہیں ایج ڈیفرنس کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔" اب کی بار تیمور نے بھی دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"اتنی چھوٹی تو نہیں ہے وہ۔"

"اتنی چھوٹی؟ بہت چھوٹی ہے وہ۔"

"اچھا چلو ٹھیک ہے مگر ایک بات سن لو۔ محبت اور معصومیت دونوں چیزیں انمول ہیں اور ہمیں دونوں چیزیں سمجھو بونس میں مل رہی ہیں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے۔" وہ اب بھی اسے گھور رہے تھے۔

"جائیں پھر وہی کریں جو آپ کا دل چاہے۔" وہ غصے سے تن فن کرتا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ اسفر کی طرف جانے کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔

"یاہو۔" پیچھے انہوں نے نعرہ لگایا تھا۔



"تو آج تمہارے نام کی انگوٹھی میری انگلی میں پہنا دی گئی۔ میری مرضی کے بغیر۔"

اس نے الٹے ہاتھ کی تیسری انگلی میں چمکتی انگوٹھی کی طرف دیکھ کر خود سے کہا۔ آج اسفر کے امی، ابو، بھائی، بھابی اور چند ایک قریبی رشتہ دار بہت سادگی سے اسے انگوٹھی پہنا گئے تھے۔ کتنا روئی تھی وہ۔ امی کو سمجھانے کی کوشش کی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

فنکشن کے وقت میرون کلر کے شلوار سوٹ میں ملبوس متورم آنکھوں کے ساتھ وہ تمام لوگوں کی توجہ کا مرکز تھی۔ اس نے ایک دفعہ بھی مسکرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سب لوگ اس کی خاموشی کو شرم و حیا قرار دے رہے تھے۔

"اچھی لگ رہی ہو خاموش خاموش۔ شرمائی ہوئی دلہن یوں بھی زیادہ اچھی لگتی ہے۔" اسفر کی بھابی نے شگون کے وقت پیار سے اسے گلے لگا کر کہا تھا۔ ان کی بات سن کر اس نے دل میں سوچا تھا۔

"دلہنیں صرف شرم و حیا کی وجہ سے خاموش نہیں رہتیں۔ کچھ اور چیزیں بھی ہو سکتی ہیں جو انہیں خاموش رہنے پر مجبور کر سکتی ہیں۔"

اس نے دوبارہ اسفر سے چیٹنگ کرنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی بلکہ وہ کمپیوٹر کے قریب بھی نہیں گئی تھی اور مسئلہ اسفر کا نہیں تھا اسے تو وہ اہمیت بھی نہیں دیتی تھی۔ مسئلہ اس کے اپنے گھر والوں کا تھا۔ اسے ابو پر حیرت ہوئی تھی جنہوں نے اس کی ناپسندیدگی کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

''یہ وہی ابو ہیں جنہوں نے ڈرائنگ روم کے لیے آف وائٹ کارپٹ صرف اس لیے لے لیا تھا کہ یہ کلر میں نے پسند کیا تھا حالانکہ امی اور عائزہ بار بار اعتراض کر رہی تھیں کہ یہ کلر نہیں ٹھیک، اس پر گرد بہت نمایاں ہوتی ہے۔''

وہ اُٹھ کر کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ سوچیں اسے بے چین کر رہی تھیں۔ اسفر اپنے گھر والوں کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ عائزہ نے خوب جھگڑا کیا کیونکہ اس کے گھر والے تصویر بھی نہیں لائے تھے اور فائزہ کو خوشی تھی کہ ایسا نہیں ہوا وہ اس شخص کی تصویر دیکھنا چاہتی تھی نہ شکل۔

''کیسے عجیب ہوتے ہیں والدین، ساری زندگی بیٹیوں سے محبت کرتے ہیں۔ انہیں بیٹوں کی نسبت اکثر معاملات میں زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی مرضی کے بغیر کھڑکیوں کے پردوں سے لے کر ٹوتھ برش تک، کوئی چیز لینا پسند نہیں کرتے۔ شلجم، کدو، ٹینڈے جتنے مرضی پسند ہوں، اگر بیٹی کو ناپسند ہوں تو گھر میں کبھی نہیں پکتے۔ عید پر قربانی کرنی ہو تو بکرا بھی بیٹی کی پسند سے آتا ہے اور شوہر؟ یعنی جیون ساتھی کو بکرے سے بھی کم اہمیت ملتی ہے کہ ان کو چنتے وقت معاشرے کا بھاری طوق گلے میں ڈال کر کہا جاتا ہے۔'' فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے؟'' اور اچھی بیٹیاں اپنے فیصلے ماں باپ کی آنکھوں کا رنگ دیکھ کر کیا کرتی ہیں۔ فائزہ بھی ایک اچھی بیٹی تھی اور یہ اچھی بیٹی اب کھڑکی کی چوکھٹ سے سر ٹکائے ٹپ ٹپ آنسو بہا رہی تھی۔



''تمہارے بال بہت خوب صورت ہیں۔'' وہ تھکا ہارا آفس سے آیا تھا اور اب اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ آواز کانوں میں پڑی۔ آواز بلاشبہ صوفی دادا کی تھی۔ ان کے کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ ان کے اس طرح سے تعریف کرنے پر ہلکی سی ہنسی کی نسوانی آواز سنائی دی جو عائشہ کی تھی۔ اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی پھر تمام مینرز اور اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، دروازے کے قریب ہو کر اندر سے آنے والی آوازوں پر غور کرنے لگا۔

''تمہارے بال بہت خوبصورت ہیں۔ مجھے لڑکیوں کے لمبے بال بہت پسند ہیں میری مرحومہ وائف کے بال بھی بہت خوب صورت ہوتے تھے۔''

تیمور کو یک دم غصہ آنے لگا۔ صوفی دادا اپنے سامنے بیٹھی خاتون کی زلفوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ چونکہ ان دونوں کی پشت ہی دروازے کی طرف تھی اس لیے تیمور بہت آسانی سے ان کی نظروں میں آئے بغیر ان کی بات سن سکتا تھا۔

''آپ تو یونہی بنا رہے ہیں سر ورنہ میرے بال اتنے بھی خوبصورت نہیں ہیں۔''

وہ کسر نفسی سے کام لے رہی تھی۔ لہجہ بھی آج پُر اعتماد تھا۔ تیمور کو حیرت سی ہوئی پھر خود کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ ''محبتوں کا اعجاز ہے میاں!'' اندر صوفی دادا کہہ رہے تھے۔

''خوش ہو جاؤ عائشہ! میں نے تیمور سے بات کر لی ہے اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' وہ بے یقین تھی۔

''بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا پوتا بہت اچھا انسان ہے آج تک اس نے میری کوئی بات نہیں ٹالی پھر یہ کیسے ٹال دیتا۔''

''مگر مجھے ڈر لگتا ہے سر!'' معصوم حسن خوفزدہ نظر آیا۔

''کس سے؟ مجھ سے؟''

''نہیں...... وہ...... ت مور سے......''

''مجھ سے؟ مگر کیوں؟'' باہر کھڑے تیمور کو جھٹکا لگا اور اندر بیٹھے صوفی دادا نے بھی حیرانی سے یہی پوچھا۔

''وہ...... وہ بہت ڈانٹتے ہیں سر!''

''جھوٹی! میں نے کب ڈانٹا ہے؟'' تیمور دانت پیس کر بڑبڑایا۔

''وہ میرا مذاق بھی تو اڑاتے ہیں۔''

''تمہارا مذاق، کوئی کبوتر یا چڑیا ہے جو میں اڑاؤں گا۔'' تیمور مسلسل حرکت میں تھا۔

''نہیں عائشہ! وہ مذاق نہیں اڑاتا۔ تم معصوم ہو نا بس اس لیے تمہارے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر لیتا ہے۔'' صوفی دادا نے پوتے کی حمایت کی۔

''لیکن......''

''کوئی لیکن ویکن نہیں سنوں گا میں، تم تسلی رکھو میں ہوں ناں، میں سب سنبھال لوں گا اور پھر......''

تیمور سے مزید کچھ نہیں سنا گیا۔ وہ دروازے سے ہٹ گیا خوامخواہ تھکن میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے دادا کی پھرتیوں پر حیرت ہو رہی تھی اور پریشانی بھی کہ آخر اس مسئلے کو کس طرح ہینڈل کرے۔ یہ حقیقت تھی کہ اس کے صوفی دادا اتنے بوڑھے نہیں لگتے تھے جتنے کہ ان کی عمر کے باقی لوگ لگتے تھے مگر اب اتنے جوان بھی نہیں تھے کہ شادی کے متعلق سوچنے لگتے۔ وہ سُست روی سے اپنے کمرے میں آ گیا جب کہ صوفی دادا اپنے کمرے میں بیٹھی عائشہ سے کہہ رہے تھے۔

''اور...... پھر میں نے تمہیں بتایا تو تھا تیمور کی عادت کے متعلق۔ وہ ایک چیز کو جتنا پسند کرتا ہے اتنا ہی اسے تنگ اور اگنور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک بات کا یقین کر لو بیٹا! وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ اس نے خود اپنے منہ سے کہا ہے۔ جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا تب ہی اپنی بہو کے طور پر پسند کیا تھا اور ابھی تیمور سے بات کرنے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی اور اس نے خود مجھے کہا کہ وہ تم میں انٹرسٹڈ ہے۔ بہت اچھا ہے میرا پوتا بس تھوڑا ضدی ہے مگر تم میں صلاحیت ہے تم اسے ٹھیک کر لینا۔ دراصل ماں باپ کی وفات کے بعد......''

وہ اسے ماضی کے نخلستانوں میں گھمانے لگے تھے اور وہ چپ چاپ سر جھکائے ان کے ساتھ تھی۔ اسے ان کی بات کا یقین آتا چلا جا رہا تھا۔ جب وہ پہلی مرتبہ ان کے گھر آئی تھی تب ہی صوفی دادا نے اسے یہ بتا کر حیران پریشان کر دیا تھا۔ کہ ''تیمور حسن تم سے محبت کرتا ہے۔'' پھر وہ اکثر اوقات اسے فون کر کے بصد اصرار گھر بلا لیتے اور تیمور کی باتیں کرتے رہتے۔ وہ خود سے اکثر سوال کرتی کہ ''آخر یہ ہوا کیسے؟'' اور پھر خود ہی جواب دے لیتی۔ کہ شاید یہ اس روز ہوا تھا جس روز وہ آفس سے نکلتے ہوئے تیمور سے بہت زور سے ٹکرا گئی تھی اور اس کے ایکسکیوز کرنے پر تیمور نے اِٹس آل رائٹ کہا تھا۔ کیونکہ فلموں میں تو ایسا ہی ہوتا تھا اور پھر وہ خود بھی تو اسی روز سے تیمور کو پسند کرنے لگی تھی۔



''ہیلو صوفی دادا!'' وہ لان میں بیٹھے تھے جب اسفر نے اندر آتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔ وہ تیمور کا سب سے اچھا دوست تھا اور دادا سے اتنا ہی بے تکلف تھا جتنا تیمور۔

''کیا کر رہے ہیں؟'' وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''نہا رہے ہیں۔'' انہوں نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔

''ہائیں؟ اچھا اچھا پھر یوں کیجیے گا نہا کر کپڑے تبدیل کر لیجیے گا بے حد گندے ہو رہے ہیں۔''

''میری مرضی، میں کپڑے تبدیل کروں یا نہ کروں؟ تم کون ہوتے ہو مجھے مشورہ دینے والے؟'' وہ چڑ کر بولے۔

''صوفی دادا! میں آپ کے عزیز از جان پوتے کا عزیز از جان، ہینڈسم، اسمارٹ دوست ہوں۔'' ایسے کہا گیا جیسے ان کی معلومات پر شک ہو۔

''میرا عزیز از جان پوتا اپنے بیڈروم میں ہے۔ تم اس کے پاس تشریف لے جا سکتے ہو۔ میری جان بخشو۔''

''مگر میں تو خاص طور سے آپ سے ملنے آیا ہوں۔''

''خدا خیر کرے۔ کیوں؟''

''آپ سے حسن کی نگہداشت کے لیے کچھ ٹپس درکار تھیں۔'' وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اطمینان سے بولا۔

''تمہارے حسن کی نگہداشت ممکن نہیں ہے برخوردار! تم یہ خیال ہی دل سے نکال دو۔''

''لیکن میں بنٹی کے لیے پوچھ رہا ہوں۔''

''میری معلومات کے مطابق تو تم اپنے والدین کی واحد کنواری اولاد ہو۔''

''کنواری؟ خدانخواستہ۔'' اس نے پہلو بدلا۔

''کنوارا کہیے دادا! ویسے آپ کی معلومات درست ہیں۔''

''پھر یہ بنٹی کون ہے جس نے حسن نکھارنا ہے۔''

''بنٹی میرا کتا ہے مجھے اس کی تصویر اتروانی ہے۔''

''ویسے یہ زیادتی نہیں ہے اسفر؟''

''کیا؟'' وہ کچھ بھی نہیں سمجھا۔

''ہونے والی بیوی کو کتے کی تصویر بھجوانا، برا امپریشن پڑے گا یار!'' وہ مزے سے کہہ رہے تھے۔ تیمور کے ذریعہ انہیں اسفر کی منگنی کا پتا چل چکا تھا۔

''صوفی دادا! آپ بھی ناں بس......'' وہ چڑ گیا۔ دادا کھلکھلانے لگے تھے۔ تیمور کے اس دوست کو زچ کرنے میں انہیں بے حد مزا آتا تھا۔

''ایک پوائنٹ ہو گیا اسفر!''

''زیادہ خوش مت ہوں۔ میں حساب برابر کر لوں گا۔ میری ذہانت سے آپ بچ نہیں پائیں گے۔'' وہ کھسیاہٹ پر قابو پا چکا تھا۔

''اللہ نے گدھے کو سینگ نہیں دیئے۔''

''سینگ کا ذہانت سے کیا تعلق؟'' وہ ایک دفعہ پھر ٹریپ ہو گیا تھا۔

''وہی جو تمہارا گدھے سے ہے۔'' وہ ایک دفعہ پھر کھلکھلائے۔

''لوگ بڑے ہو کر مہذب ہو جاتے ہیں صوفی دادا! مگر آپ......'' وہ پہلے کی نسبت زیادہ بری طرح کھسیاہٹ کا شکار ہوا تھا۔ دادا مسکراتے رہے چہرے پر فتح کے نشان لیے۔

''میں آپ کو انوائٹ کرنے آیا تھا۔ قضائے الٰہی سے میری منگنی ہو رہی ہے۔'' کام کی بات اسے اب یاد آئی۔

''قضائے الٰہی سے؟ یار! بہو کا نام کچھ نامناسب نہیں ہے۔''

''سدھر جائیں دادا! مجھ معصوم کنوارے کی آہ نہ سمیٹیں۔'' وہ تنگ آ کر ان کے پاس سے اُٹھتے ہوئے بولا۔

''مجھ پہ آہیں اثر نہیں کرتیں برخوردار! میں چاروں قل پڑھ کر اپنے گرد حصار قائم کر کے بیٹھتا ہوں۔'' ان کا اطمینان قابل دید تھا۔

''اللہ کا کلام شیطانوں پر اثر نہیں کرتا اور آپ شیطانوں کے......''

''میں شیطانوں کا دادا ہوں۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولے۔ اسفر شرمندہ ہو کر تیمور کے کمرے کی طرف آ گیا جو اتوار ہونے کی وجہ سے ابھی تک بستر میں گھسا ہوا تھا۔

''اٹھ جا تیمور کے بچے! یہاں تیرا جگری یار اکیلا اکیلا بے عزت ہو رہا ہے۔'' وہ اس کے قریب بیٹھ کر بولا۔

''تنگ نہیں کرو اسفر! میں بڑا اچھا خواب دیکھ رہا ہوں۔''

''اچھا، کیا خواب میں ڈیٹ پر نکلے ہوئے ہو؟'' دلچسپی سے پوچھا گیا۔

''نہیں میری گرل فرینڈ ڈیٹ پر نکلی ہوئی ہے۔''

''تمہارے ساتھ؟''

''نہیں عمران خان کے ساتھ۔''

''بے غیرت آدمی! تم وہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں محبت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہوں۔''

''گرل فرینڈ کی طرف؟'' دلچسپی پھر پیدا ہوئی۔

''نہیں عمران خان کی طرف۔''

''عمران خان وہاں کیا کر رہا ہے؟'' اسفر اُکتا سا گیا۔

''بس گلے لگانے ہی والا ہے۔''

''کس کو؟ گرل فرینڈ کو؟''

''نہیں مجھے۔''

''بڑا بدذوق ہے عمران خان۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔

''کیوں؟'' تیمور نے لحاف سے منہ نکال کر پوچھا۔

''مرد ہو کر مرد کو گلے لگا رہا ہے جب کہ وہاں ایک عدد خاتون موجود ہے۔''

''کون مرد؟'' تیمور کے لہجے میں حیرانگی تھی۔

''گھامڑ! تُو اور کون؟'' ''مگر میں تو خواب میں اپنی گرل فرینڈ کی بہن بنا ہوا ہوں۔''

''اچھا یعنی ریحام خان کا حق مار رہے ہو۔ نہیں تیمور! نہیں میں تمہیں ریحام خان کا حق نہیں مارنے دوں گا۔''

''کچھ خدا کا خوف کرو یار! میں نے آج تک مکھی نہیں ماری میں تمہارا حق کیسے ماروں گا۔''

''میرا یہاں کیا ذکر؟'' اسفر کو پھر حیرانگی ہوئی۔

''میرے خواب میں ریحام تم ہی تو بنے ہوئے ہو۔''

''لعنت ہو تم پر۔''

''سیم ٹو یو۔'' فٹ جواب آیا۔ اسفر نے اس کے اوپر سے لحاف کھینچ کر اتار دیا۔

''اٹھو فضول آدمی! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔''

''کس لیے؟''

''سینما چلتے ہیں۔ انگلش فلم دیکھیں گے۔'' اسفر نے کہا در اصل وہ تیمور سے کچھ پرسنل شیئر کرنا چاہتا تھا۔

''تمہارے ساتھ انگلش فلم؟ اس سے بہتر ہے میں خواب میں عمران خان کو دیکھ لوں۔''

''تمہیں کہاں انگلش فلم اچھی لگے گی اب؟ تم تو خود فلم کی شوٹنگ میں مصروف ہو۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' تیمور نے لیٹے لیٹے کہا۔ اسفر یک دم کھڑا ہو گیا۔

''میں جا رہا ہوں تیمور۔''

''مہربانی شکریہ مگر جانے سے پہلے پلیز لحاف دوبارہ میرے اوپر دے دو میں دوبارہ خواب کی دنیا میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ کہیں میری غیر موجودگی میں عمران خان میری گرل فرینڈ کو ہی پرپوز نہ کر دے۔''

''میں سچ مچ جا رہا ہوں تیمور۔'' وہ دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا مگر تیمور ٹس سے مس نہیں ہوا۔ بے چارے اسفر کو ہی واپس آنا پڑا۔

''تیمور! اے تیمور!'' وہ پکار رہا تھا۔ تیمور جو دوبارہ لحاف کو سر تک تان چکا تھا اس میں سے منہ نکال کر بولا۔

''فرماؤ؟''

''یار! کل فائزہ کے گھر والے آ رہے ہیں مجھے انگوٹھی پہنانے۔''

''تو میں کیا انہیں وارن کر دوں؟''

''تیمور! میں سیریس ہوں۔'' وہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ تھا۔

''اسفر! کیا ہوا ہے؟'' تیمور یک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسفر کے لہجے نے اسے چونکایا تھا۔

''کچھ نہیں یار! بس یونہی۔''

''منہ کیوں اترا ہوا ہے حالانکہ کل تمہاری منگنی ہے پگلے۔'' اس نے ایک مشہور ایڈ کی نقل کی۔

''تیمور! مجھے لگتا ہے فائزہ خوش نہیں ہے اس منگنی پر۔'' اس نے اُگل ہی دیا۔ تیمور کو سمجھ نہیں آئی اس بات پر کیا کہے۔ اس نے فائزہ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہاں اسفر اس لڑکی کو بہت پسند کرتا تھا اور اکثر اوقات اس کی بات بھی کیا کرتا تھا تیمور جانتا تھا اسفر اس لڑکی سے محبت کرتا ہے اس لیے اب اس کی بات سن کر وہ تھوڑا سا دکھی ہو گیا تھا۔

''ان کی طرف سے تصویریں آ گئی ہیں۔ ہم نے بھی ڈویلپ کروالی ہیں۔ مگر ایک بھی تصویر میں وہ خوش نہیں لگ رہی۔ عجیب روئی روئی سی ہے۔'' وہ تیمور سے کچھ نہیں چھپاتا تھا۔

''ارے چغد! شرما رہی ہو گی۔'' تیمور کو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔

''شاید، باقی سب لوگ بھی یہی کہہ رہے ہیں۔'' اسفر کو بھابی اور امی کے بھی اس طرح کے کلمات یاد آئے۔

''اوہ وہ تمہاری سحر کیسی ہے؟'' تیمور کو یک دم یاد آیا۔

''دفع کرو یار اس کو، پتا نہیں کون تھی۔ بہت دن ہو گئے دوبارہ رابطہ نہیں کیا اس نے۔'' اسفر ہر چیز سے اُکتایا ہوا تھا۔

''ویسے حیرت والی بات ہے نا! پتا نہیں کون تھی؟ تمہارا ای میل ایڈریس کہاں سے لیا اس نے؟'' تیمور حیرانگی سے کہہ رہا تھا۔ اسفر نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ پھر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''تیمور کے بچے! کہیں تُو ہی تو نہیں تھا؟''

''شرم کرو میرے پاس تمہارا ای میل ایڈریس سرے سے ہی نہیں۔''

''جھوٹ مت بول! میں نے خود تجھے اپنے وزیٹنگ کارڈ پہ لکھ کر دیا تھا۔'' اسفر کو سب یاد تھا۔

''تم بھول رہے ہو اسفر! تم نے مجھے نہیں دیا۔'' تیمور بضد تھا۔

''نہیں مجھے یاد ہے میں نے تمہیں خود دیا تھا۔ جس روز میں نے تمہارے آفس میں انٹرویوز کیے تھے اس روز۔'' وہ اسے یاد کروا رہا تھا۔

''اچھا ہو سکتا ہے میں نے کہیں گرا دیا ہو مجھے یاد نہیں ہے۔ ویسے تم یقین کرو میں نے تم سے کبھی چیٹنگ نہیں کی کم از کم لڑکی بن کر نہیں کی۔''

''چھوڑو یار! دفع کرو میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔''

''تم فائزہ کی فوٹو گرافس لائے ہو؟'' تیمور نے بھی موضوع بدل دیا۔

''ہاں، ایک لایا ہوں۔'' اسفر نے والٹ نکال کر اس کی طرف اچھال دیا۔ تیمور نے کیچ کر لیا تھا اس کے والٹ کو پھر کھول کر تصویر دیکھنے لگا۔ اچھی خوب صورت لڑکی تھی۔ تیمور نے دیکھ کر دوبارہ والٹ اُسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

''تُو، تو بڑا خوش قسمت نکلا یار!''

''ہاں ٹھیک کہتے ہو۔'' اسفر خوش ہو کر بولا۔

''کاش فائزہ بھی ہوتی۔'' اس نے مذاق میں کہا۔

''خبردار! آہیں بھر کر میری شادی کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش مت کرو۔'' اسفر جون میں واپس آ رہا تھا۔

''میں نے کیا روڑے اٹکانے ہیں؟ میرے تو اپنے دادا شادی کر رہے ہیں؟'' وہ جل کر کہہ رہا تھا۔

''ہائیں..... نہیں یار!'' اسے یقین نہیں آیا۔

''ہاں یار!'' اسی کے انداز میں تیمور نے جواب دیا۔

''کس سے کر رہے ہیں؟''

''عائشہ سے۔''

''عائشہ؟ آئی..... شاہ وہ بونگی؟'' اسفر کو پہلے حیرانگی پھر گدگدی ہوئی، تیمور خاموش رہا تھا۔

''چہ..... چہ چہ تم تو شادی شدہ ہونے سے پہلے بیوہ ہو گئے۔''

''چغد آدمی! بیوہ عورتیں ہوتی ہیں۔'' وہ چڑ کر بولا۔

''ابھی تو تم خود عورت بنے ہوئے تھے۔'' اسفر نے خواب یاد دلایا۔

''اور ایک معزز خاتون کے معزز شوہر پر ڈورے ڈال رہے تھے۔ اب وہ معزز خاتون یعنی ریحام یعنی کہ میں۔'' اس نے سینے پر انگلی رکھ کر اپنی طرف اشارہ کیا۔

''رقابت کی آگ میں جل کر تمام باتیں تمہارے شوہر کو بتا دوں گی جو غیرت میں آ کر یا تو دوسری شادی کرے گا یا پھر خود کو گولی مار لے گا۔ اب تم طلاق یافتہ ہو یا بیوہ ایک ہی بات ہے۔''

''اگر تمہارے خواب میں، تم اپنی گرل فرینڈ کی بہن اور میں ریحام ہو سکتا ہوں تو پھر عائشہ عمران خان اور صوفی دادا تمہاری سوکن بھی ہو سکتے ہیں۔''

''فٹے منہ تمہارا۔''

''شکر الحمدللہ حساب برابر ہو گیا ورنہ آج صبح سے میں ہی بے عزتی کروا رہا تھا۔'' وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''اسفر! میں سیریس ہوں یار!''

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔''

''تمہیں تب یقین آئے گا، جب اس گھر میں میرے ننھے منے آدھا درجن چچا اور پھوپھیاں تشریف لے آئیں گے۔'' وہ جل کر بولا۔

''سبحان اللہ، سبحان اللہ۔'' اسفر کو تیمور کی حالت دیکھ کر مسلسل گدگدی ہو رہی تھی۔

''تو پٹے گا اسفر۔'' تیمور اٹھ کر بیٹھ گیا تمام نیند رخصت ہو گئی تھی۔

''اچھا کچھ سوچتے ہیں۔'' اسفر نے آنکھیں سکیڑیں۔

''یار تیمور! یوں نہ کریں۔'' وہ اس کے قریب ہو کر کان میں کھسر پھسر کرنے لگا۔

○......❖......○

''مجھے آپ سے ایکسکیوز کرنا تھا عائشہ!'' وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ صوفی دادا کی ٹیلی فون انڈیکس سے اس نے عائشہ کا فون نمبر اڑایا تھا اور اب اسے گھر بلا کر تفصیلی بات کرنے کے ارادے سے بیٹھا تھا۔

''مجھ سے؟ کس لیے؟'' وہ اپنی طبیعت کے پیش نظر جلدی گھبرا جاتی تھی۔

''بس یونہی...... میں خوامخواہ آپ کو تنگ کرتا رہا ہوں۔ مجھے احساس......''

''آپ اس طرح مت کہیں پلیز! مجھے پتا ہے آپ مجھے جان بوجھ کر تنگ نہیں کرتے تھے۔ مجھے بتایا تھا صوفی دادا نے۔'' وہ اپنے گلابی ناخنوں کو کھرچتی کہہ رہی تھی۔

''آپ تو صوفی دادا مت کہیں۔'' وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بولا۔

''آپ کے دادا تو میرے بھی دادا۔'' عائشہ شرما سی گئی۔

''سوانوسینٹ۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''آپ بہت اچھی ہیں عائشہ! آپ جیسے لوگ اس معاشرے میں تقریباً پیدا ہونے بند ہو گئے ہیں۔ لیکن...... لیکن آپ کی معصومیت آپ کو کسی عذاب سے بھی دوچار کر سکتی ہے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں۔'' وہ ہونق بنی پوچھ رہی تھی۔ تیمور نے...... مناسب لفظ منتخب کیے۔

''میں جانتا ہوں آپ اس گھر کی فرد بننا چاہتی ہیں۔ لیکن عائشہ! بوڑھے لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آپ ایک اچھی باشعور لڑکی ہیں۔ اپنا برا بھلا سمجھتی ہیں۔ یقیناً آپ نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہو گا مگر میری مانیں ایک دفعہ پھر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں۔''

''بوڑھے لوگ؟'' وہ نا سمجھی کے عالم میں منہ اٹھائے بولی۔

''صوفی دادا۔'' تیمور نے بہت آرام سے کہا۔

''نہیں، نہیں وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ میں انہیں بہت پسند کرتی ہوں۔ میرا خیال ہے میں اس گھر میں بہت خوش رہوں گی۔'' وہ گردن ہلا ہلا کر کہہ رہی تھی۔

''یعنی آپ اس شادی سے خوش ہیں؟'' تیمور پہلو بدل کر کہنے لگا۔

''جی بہت......'' وہ سر جھکائے بولی۔ تیمور نے گہری سانس بھری تھی۔

''چلیں ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی ہم آئیں گے۔ جلد آپ کے گھر۔''

''آپ...... آپ خوش ہیں نا؟'' اس کی بات پر تیمور نے آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایسے ہی ہو رہے تھے جیسے آس و نراش کی عجیب کیفیت کا شکار انسان کے ہو سکتے ہیں۔ تیمور کو اس کی اس معصوم حرکت پر اندر ہی اندر کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ پھر وہ چہرے پر جان بوجھ کر بشاشت پیدا کر کے بولا۔

''ہاں۔''

اس کے جواب نے عائشہ کو بے طرح خوش کیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ شرماہٹ کے رنگ بھی چہرے پر چمکنے لگے۔ تیمور نے اس کے گلابی رنگ میں مزید گلابیوں کو گھلتے دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ حسن کی ایسی ادائیں ان سے ہمیشہ مخفی رہی تھیں۔ یک دم اسے اس معصوم لڑکی میں بے پناہ کشش محسوس ہوئی اور ایسی کشش تو اسے کبھی مارک وا اور ایڈم گلکرسٹ کی بیٹنگ میں بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے فوراً نظریں ہٹالیں آخر سامنے بیٹھی لڑکی اس کی دادی بننے والی تھی۔

○......❖......○

''یقین کرو عائزہ! میں نے تو کبھی بھی فائزہ سے ون ٹو ون ملاقات نہیں کی۔ جس جھڑپ کا تم ذکر کر رہی ہو میں اس سے بالکل بے خبر ہوں۔'' وہ پریشان سا عائزہ کو بتا رہا تھا۔ اس نے خود ان کی طرف فون کیا تھا۔ فائزہ نے تو بات نہیں کی مگر عائزہ نے تفصیلاً بات کی تھی اور فائزہ کے منع کرنے کے باوجود تمام تفصیل اس کے گوش گزار کر دی تھی۔

''مگر اسفر بھائی! فائزہ پُریقین ہے کہ وہ آپ ہی تھے جنہوں نے اس کی انسلٹ کی تھی بلکہ وہ تو سحر بن کر آپ سے چیٹنگ بھی کرتی رہی ہے تاکہ...... تاکہ آپ سے بدلہ لے سکے۔'' ریسیور سے آتی عائزہ کی آواز اسفر کو حیران بھی کر رہی تھی۔

''اس نے میرا ای میل ایڈریس کہاں سے لیا؟'' وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''وہ آپ کا کارڈ گرا تھا ناں والٹ میں سے، جب آپ نے فائزہ کو امداد دینے سے انکار کیا تھا۔''

''افوہ تم، یقین کیوں نہیں کر رہی ہو میری بات کا۔ وہ میں تھا ہی نہیں۔'' اسفر چڑ کر بولا۔ عائزہ بھی اس کی بات سن کر ذرا غصے میں آئی۔

''آپ مجھ پر کیوں غصہ نکال رہے ہیں اسفر بھائی! ٹھہریں میں فائزہ کی منت کر کے لاتی ہوں مگر کارنیٹو پکی ہے نا۔'' وہ رشوت پکی کر رہی تھی پھر وہ ریسیور رکھ کر چلی گئی۔

''امداد، لڑکی، بل اور وزیٹنگ کارڈ۔'' اسفر نے ان سب کو دہرایا تھا۔ یک دم اسے یاد آ گیا کہ غلط فہمی نے کس جگہ کس طرح جنم لیا تھا۔ اس نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا اب وہ فائزہ سے بات کرنے کے لیے تیار تھا کہ وہ میں یعنی اسفر نہیں بلکہ تیمور یعنی میرا دوست تھا۔ اور یہی بات جب کچھ دیر بعد اس نے اپنے منہ سے فائزہ کو بتائی تھی تو اس نے خالصتاً زنانہ شکوہ

کیا۔ ''لیکن میں کیسے مان لوں کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں؟''

''ویسے تو آپ اس لیے بھی مان سکتی ہیں کہ یہ بات میں بذات خود آپ سے کہہ رہا ہوں اور میں آپ کا ہونے والا مجازی خدا ہوں۔ لڑکیوں کو کم ازکم اپنے ہونے والے شوہروں پر ضرور یقین کرنا چاہیے۔'' اس کی آواز نے اسفر کو شوخ کر دیا تھا۔

''پلیز آپ مذاق مت کریں۔ میں سیریس ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''اے عقلمند خاتون! اگر تم ایک دفعہ مجھ سے مل لو۔ مجھے دیکھ لو تو تمہیں خود یقین آجائے گا۔'' اب کی بار وہ خاصی اپنائیت سے بولا۔ انسان اپنی ذاتی چیزوں سے زیادہ دیر تک بیگانگی برت بھی نہیں سکتا۔

''پھر وہ کون تھا جس نے......؟''

''وہ تیمور تھا۔ میرا اچھا دوست ہے۔ مجھ سے مختلف ہے اور میں بھی اس سے مختلف ہوں۔ وہ مجھ سے زیادہ امیر ہے۔ کمبخت زیادہ ہینڈسم بھی ہے لیکن مجھ سے زیادہ سڑیل اور بدمزاج بھی ہے۔'' اسفر نے تیمور کی تعریف کی ہے یا بد تعریفی فائزہ سمجھ نہیں پائی۔ اس لیے کچھ سمجھی نا سمجھی کے عالم میں بولی۔

''خیر آپ کی آخری بات سے میں پوری طرح متفق ہوں کیونکہ مجھے اس کا ایکسپیرینس ہے۔''

''تم اس بات کو بھول نہیں سکتیں؟''

''کوئی اپنی انسلٹ بھی بھولتا ہے کیا؟'' فائزہ نے جیسے شکوہ کیا تھا۔

''وہ میرا اچھا دوست ہے فائزہ! پلیز میری خاطر۔'' اب کی بار فائزہ خاموش رہی۔

''اب کیا ہوا؟ خاموش کیوں ہوگئی ہو؟'' فائزہ کو اس کی آواز میں شرارت سی گھلی محسوس ہوئی۔

''غلطی تیمور کی نہیں تھی۔ غلطی تمہاری بھی نہیں تھی۔ غلطی آسٹریلیا کی تھی۔''

''کیا مطلب؟'' فائزہ سمجھ نہیں سکی۔

''مطلب یہ کہ نہ آسٹریلیا پاکستان کو ہراتا نہ یہ سب ہوتا۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھی۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''اچھا میں سمجھاتا ہوں......ہوا یوں کہ......'' وہ اسے اس دن کے متعلق تفصیل سے بتانے لگا۔

O......❖......O

''عائشہ کے گھر کب چلنا ہے صوفی دادا؟'' تیمور نے ان کے پاس بیٹھ کر پوچھا۔ اس نے ہر چیز کو صوفی دادا کی مرضی کے مطابق کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بہت دن تک وہ خود کو سمجھاتا رہا تھا۔ ایک ایک چیز شمار کی تھی۔ بچپن سے لے کر اب تک ان کی محبتیں، قربانیاں، وہ فرمائشیں جو وہ ان سے کرتا تھا، وہ لاڈ جو انہوں نے اٹھائے تھے، وہ فخر جو اسے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمکنے لگتا تھا۔

''کیا میں ان کی اتنی آزمائشوں کے بدلے میں اتنی سی بات بھی نہیں مان سکتا؟'' اس نے ان سے بات کی تھی۔ صوفی دادا بے حد خوش ہوئے تھے اس کی بات سن کر۔

''جب بھی تم کہو میں چل پڑوں گا۔''

''میں کیا کہوں؟'' اس نے کندھے اچکائے۔

''تمہیں ہی تو کہنا چاہیے۔ عائشہ سے ملو اس سے پوچھو کہ کب ہم رشتہ لے کر باقاعدہ ان کے یہاں آئیں؟'' انہیں اس

کی لاتعلقی بہت محسوس ہوئی تھی۔

''لیکن میں عائشہ سے کیوں پوچھوں؟ آپ خود پوچھیں ناں۔''

''تیمور بچے! یہ تم کیا اٹھارہویں صدی کی عورتوں کی طرح شرمانے لگے ہو۔ سارے معاملات تقریباً میں نے ہی طے کیے ہیں اب کچھ تم بھی کرلو۔ آج کل کے لڑکے کیا کیا نہیں کرتے اور ایک تم ہونرے پھوسڑ۔'' ان کے لہجے میں پوتے کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ تیمور کو ایک دفعہ پھر شرمندگی ہوئی۔

''یہ بتائیں صوفی دادا! ہنی مون کے لیے کہاں جائیں گے؟'' وہ شرمندگی کے یہ اثرات زائل کرنا چاہتا تھا۔ صوفی دادا کا دل چاہا سر پیٹ لیں۔

''مانا برخوردار! ہم آپ کے بچپن سے لے کر اب تک ہر جگہ اکٹھے جاتے رہے ہیں، مگر اب آپ جوان ہو چکے ہیں اور ہنی مون پر آپ کو اکیلے ہی جانا پڑے گا۔'' ان کی بات سن کر تیمور نے حیرانگی سے انہیں دیکھا۔

''مگر میں ہنی مون پر کیوں جاؤں؟''

''تو کیا اپنی نئی نویلی دلہن کو میرے ساتھ ہنی مون پر بھیجو گے؟'' وہ طنزیہ انداز میں بولے۔

''نئی نویلی دلہن؟ کون؟'' وہ منہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھتا ہونق لگ رہا تھا۔

''عائشہ اور کون؟''

''کیا؟ عائشہ؟'' تیمور کی آنکھیں کھل کر پھٹنے کے قریب ہوگئی تھیں۔

''لیکن......لیکن اس سے تو آپ شادی کرنے والے تھے۔''

''ہوش میں تو ہو تم؟ مانا میں ابھی بہت اسمارٹ، ہینڈسم اور ینگ لگتا ہوں لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اپنی پوتی کی عمر کی لڑکی سے بیاہ رچالوں؟'' وہ تنک کر بولے۔

''آپ نے خود مجھ سے کہا تھا صوفی دادا!'' وہ عجب بے چارگی سے بولا۔

''یہ کہ میں عائشہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ بولو یہ کہا تھا میں نے؟'' اب کی بار انہیں غصہ آ گیا۔

''نہیں یوں تو نہیں کہا تھا مگر......''

''نہ یوں نہ ووں۔ میں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ میں تو تمہارے ہی رشتے کی بات چلا رہا تھا۔ تم نے پہلے کہا رضیہ سے شادی نہیں کرنی میں نے مان لیا۔ پھر کہا شرمین نہیں پسند، میں نے کہا جو تمہاری مرضی۔ پھر ثوبیہ کو انکار کیا میں نے کچھ نہیں کہا۔ عائشہ کی بات کی تو تم نے خود کہا تھا جیسے آپ کی مرضی۔''

''لیکن میں سمجھا تھا۔'' تیمور بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہوگیا۔

''یہ تمہاری سمجھ کا قصور ہے۔ یعنی برخوردار یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کا بوڑھا دادا شادی کے چکروں میں ہے۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ آخر صاحبزادے کے مزاج کیوں نہیں مل رہے۔'' انہوں نے لاؤنج میں چکر لگانے شروع کر دیئے تھے۔ یہ ان کے شدید ترین غصے کو ظاہر کر رہا تھا۔

''آئی ایم سوری دادا!'' وہ بھی اٹھ کر ان کے ساتھ ساتھ چکر لگانے لگا۔ یہ اس کا دادا کو منانے کا خاص انداز تھا۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ ساتھ چلتا دیکھا تو منہ پھلا کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ وہ بھی ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔ دادا نے ٹانگ پر ٹانگ رکھی تو اس نے رکھ لی انہوں نے انداز نشست تبدیل کیا تو اس نے بھی کرلیا غرض اگلے دس منٹ تک اگر دادا نے کان میں انگلی گھما

کراسے کھجانا چاہا تو تیمور نے بھی ان کی تقلید میں ایسا ہی کیا۔ پھر دادا نے اپنی داڑھی میں انگلیاں چلانی شروع کر دیں تو تیمور نے خود کو بے بس محسوس کیا وہ کلین شیو تھا اس کی اسی بے بسی نے دادا کو ہنسنے پر مجبور کر دیا اور کھل کر ہنسنے سے دلوں کی کدورتیں صاف ہو جاتی ہیں اور پھر یہ تو کدورت بھی نہیں تھی بس ذرا سی غلط فہمی تھی۔

''آئی ایم سوری دادا!'' تیمور نے کہا۔

''پہلے کان پکڑو۔'' دادا بولے۔ تیمور نے جھٹ ان کے کان پکڑ لیے۔

''میرے نہیں بے وقوف اپنے پکڑو۔'' وہ ڈپٹ کر بولے تو تیمور نے جھٹ سے اپنے کان پکڑے۔

''جانتے ہو تمہاری وجہ سے میں نے کتنے جھوٹ بولے۔ میں نے عائشہ سے کہا کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ اس سے شادی کرنا چاہتے ہو اور وہ معصوم فوراً میری بات پر ایمان لے آئی۔ میں نے تمہارے حوالے سے اتنی جھوٹی سچی باتیں کہیں اور وہ یقین کرتی رہی۔'' دادا نے اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا اور جب نگاہ سامنے پڑی تو ٹھٹک سے گئے۔

''آپ نے جھوٹ بول کر اچھا نہیں کیا میں تو اس سے محبت نہیں کرتا۔'' تیمور نے لاڈ سے ان کے کندھے کے ساتھ سر ٹکایا تھا۔ نظر سامنے کھڑی عائشہ پر پڑی۔ وہ دونوں دادا پوتا اپنی باتوں میں اس طرح محو ہوئے تھے کہ پتا ہی نہیں لگا تھا۔ عائشہ نے شاید ان کی باتیں سن لی تھیں اب پٹر پٹر ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں کے نگر میں سیلاب اترنے کی تیاری کر رہا تھا۔

''آؤ عائشہ! اندر آجاؤ۔'' دادا نے فوراً سیدھے ہو کر کہا۔ وہ ان کے پاس آ گئی۔

''آپ نے کہا تھا تیمور حسن مجھ سے محبت کرتے ہیں۔'' اس نے اپنی طرف اشارہ کر کے کہا۔ دادا خاموش ہو گئے۔

''آپ نے کہا تھا ناں؟'' وہ ایک ٹک ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''تم بیٹھو تو سہی بیٹا! میں تمہیں ساری بات بتاتا ہوں۔''

''کچھ مت بتائیں صوفی دادا! اب آپ کیا بتائیں گے؟ جب میں آپ سے پوچھتی تھی تب آپ نے سب جھوٹ کہا۔ میں نے پوچھا کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ آپ نے کہا ہاں یہ محبت ہی ہے۔ میں نے پوچھا یہ کیسے ممکن ہوا؟ آپ نے کہا یہ پہلی نظر کی محبت ہے۔ آپ مجھے بے وقوف بنا رہے تھے نا؟ سب مجھے ہی بے وقوف بناتے ہیں۔ بھیا بھابی، آپ بھی۔'' وہ اب رونے لگی تھی۔ تیمور اور صوفی دادا کو سمجھ نہیں آئی اسے کس طرح چپ کروائیں اپنی اپنی جگہ دونوں شرمندہ تھے۔

''میں تو صرف نوکری کرنا چاہتی تھی مگر آپ لوگوں نے کہا پہلے شادی کرو۔ میں تیار ہو گئی۔ میرا کیا قصور ہے اس میں؟ مجھے تو اس دنیا میں ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ کیا فائدہ ہے میرا؟ کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ بہت گندے ہیں سب لوگ۔ آپ بھی بہت گندے ہیں صوفی دادا! میں خود تو ایسی نہیں ہوں جس طرح اللہ تعالیٰ نے بنایا میں بن گئی۔ اب میرا کیا قصور کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بے وقوف بنایا۔ میرا...... میرا دل چاہ رہا ہے میں مر جاؤں اور میں مر جاؤں گی۔'' وہ روتے روتے باہر نکل گئی تھی۔ وہ دونوں بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

''ہائے دادا! وہ جا رہی ہے۔'' تیمور کی پریشان کن آواز نکلی۔

''ہاں تیمور! وہ جا رہی ہے۔'' دادا اس سے بھی زیادہ پریشان تھے مگر اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ اسے آواز دے لیتے۔

''دادا اسے روکیں ناں!'' تیمور دونوں ہاتھ لہرا کر بولا۔

''کیسے روکوں؟''

''اُف اللہ! وہ چلی جائے گی۔''

''اچھا، اچھا وہ تمہیں بہت بری لگتی ہے؟'' وہ بے چینی سے پوچھ رہے تھے۔

''نہیں بہت بری تو نہیں لگتی۔''

''اچھی لگتی ہے؟''

''یہ تو نہیں پتا۔''

''پتا کرواؤ ناں پھر۔''

''ہاں شاید، تھوڑی سی لگتی تو ہے۔'' وہ سر جھکا کر بولا۔

''تو پھر گھامڑ اسے روک لو۔'' دادا نے اپنی لاٹھی اس کے کندھے پر مارتے ہوئے کہا۔ تیمور نے باہر نکلنے میں لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔

گیٹ کے باہر وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ دائیں بائیں دیکھتا ہوا تیمور آگے بڑھا وہ اگلی لائن میں چلی جا رہی تھی۔ آنسو اب بھی تواتر سے بہہ رہے تھے اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ تیمور نے بڑے بڑے قدم اٹھا کر درمیانی فاصلہ طے کیا پھر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ روتے روتے کہہ رہی تھی۔

''بھابی بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔''

''کیا کہتی ہیں بھابی؟'' تیمور نے پوچھا۔ عائشہ نے اس کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا بس سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔

''بھابی کہتی ہیں دنیا کے سارے احمقوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے گولی مار دینی چاہیے اور قطار میں سب سے پہلے نمبر پر تمہیں کھڑا کرنا چاہیے۔''

''غلط تو نہیں کہتیں وہ۔'' تیمور نے کہا تو وہ چونک سی گئی پھر اس کی طرف دیکھا تو حیرانگی سے بولی۔

''ہائے اللہ! آپ کہاں سے آ گئے؟''

''عالم بالا سے۔''

''یہ کون سا علاقہ ہے؟''

''میں تمہارے پیچھے لاہور کا جغرافیہ ڈسکس کرنے نہیں آیا۔ صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ میں تم سے سچ مچ بہت محبت کرتا ہوں۔'' وہ مزے سے کہہ رہا تھا۔ عائشہ کو یک دم اپنی ناراضگی یاد آئی۔

''مجھ سے بات مت کریں۔ آپ بہت گند......''

''بس بس میں جانتا ہوں کہ میں بہت گندا ہوں اور تم مجھے ''گندا'' بھی اتنے پیار سے کہتی ہو کہ مجھے خود پہ ہی پیار آنے لگتا ہے۔ میں نہیں چاہتا ارد گرد چلتے لوگ میرے اس پیار بھرے لقب سے آشنا ہوں۔'' وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا کہہ رہا تھا۔ وہ خاموش رہی۔

''اچھا چلو یار! اب معاف کر دو۔ آج کا سارا دن معافیاں مانگتے گزر رہا ہے۔ پہلے اسفر کی منگیتر، فائزہ بھابی سے ایکسکیوز کیا۔ دادا سے کیا اور اب تم......''

''مجھے آپ کی کسی بات کا یقین نہیں ہے۔ آپ ایک دم جھوٹے انسان ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ مجھے کتنے اچھے لگتے ہیں؟'' وہ بات کرتے کرتے کھڑی ہو گئی تھی۔ تیمور بھی سینے پر ہاتھ باندھے دلچسپی سے اس معصوم لڑکی کی باتیں سن رہا تھا۔ آج اسے اس کی معصومیت پر ڈھیروں پیار آ رہا تھا۔

''میں نے آپ کو پہلی دفعہ تب دیکھا تھا جب آپ باہر سے آرہے تھے اور میں آپ کے آفس سے نکلی تھی۔ میری اتنی زور کی ٹکر ہوئی تھی آپ سے۔ آپ نے میرے ایکسکیوز کرنے پر کہا تھا اِٹس آل رائٹ کہا تھا ناں؟ کہا تھا ناں آپ نے؟'' رک کر اس سے پوچھنا مناسب سمجھا۔ تیمور خاموش رہا بس مسکراتی آنکھوں کے ساتھ اس کی سن رہا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر چلنے لگی تھی۔

''میں نے سوچا آپ تو بہت اچھے انسان ہیں۔ اتنی زور کی ٹکر پر بھی غصہ نہیں کرتے ورنہ تو سب مجھے ہی ڈانٹتے ہیں کہ دیکھ کر چلا کرو۔ پھر میں آپ کے آفس دوبارہ گئی تو آپ مجھے اور بھی زیادہ اچھے لگے۔ آپ اس روز بلیک سوٹ میں تھے۔ آپ نے بلوئش گرے ٹائی لگائی تھی۔ لگائی تھی ناں؟ لگائی تھی ناں آپ نے؟'' چلتے چلتے وہ ایک دفعہ پھر رک کر پوچھ رہی تھی۔ اب کی بار تیمور کے چہرے پر بڑی جاندار مسکراہٹ آئی تھی۔

''اتنی محبت کرتی ہو مجھ سے؟'' وہ اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیے پوچھ رہا تھا۔ عائشہ ایک دفعہ پھر چلنے لگی۔

''کیوں کیوں؟ آپ کو کیوں بتاؤں؟ آپ کو تو بالکل بھی نہیں بتاؤں گی آپ کون سا مجھ سے...... مجھ سے......'' لمحہ بھر کو وہ اٹک سی گئی تھی۔

''وہ تو مجھے صوفی دادا نے کہا تھا کہ آپ مجھ سے......'' بات ایک دفعہ پھر یہاں ادھوری چھوڑ دی۔

''مجھ سے......'' اب وہ پھر ایک دفعہ کھڑی ہوگئی تھی۔

''میں نے سوچا تھا کتنا اچھا لگے گا آپ ہمارے گھر آئیں گے۔ بھابی ہمیشہ کہتی ہیں۔ عائشہ سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔ اس کی شادی ہمیں کسی قصاب سے کرنی پڑے گی۔ پھر میں نے سوچا میں بھابی سے کہوں گی دیکھو بھابی! یہ قصاب نہیں یہ تو نواب ہیں۔ لیکن...... لیکن آپ تو مجھ سے...... اب مجھے لگتا ہے مجھے کسی قصاب سے ہی شادی کرنی پڑے گی۔ بھابی تو یہی کریں گی۔ مگر میں بھی ان کی بات نہیں مانوں گی...... میں......''

''تم، کچھ نہیں کرو گی۔'' تیمور نے ٹوک کر کہا۔

''نہیں میں ضرور کروں گی میں آپ۔''

''خاموش! اب ایک لفظ بھی منہ سے نکلا تو الٹے ہاتھ کے دو لگاؤں گا۔'' وہ مصنوعی غصے سے بولا تو عائشہ سچ مچ ڈر کر چپ ہوگئی۔ تیمور نے اس کا ہاتھ پکڑا اور روڈ کراس کر کے دوسری طرف آ گیا۔ ذرا آگے جا کر فلاور شاپ تھی وہ وہیں جا رہا تھا۔ مسلسل اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

''مجھے صوفی دادا نے بہت محبت سے پالا ہے۔ میں مر کر بھی ان کی محبت کا قرض نہیں چکا سکتا۔ ہم ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں گے۔ چاہے وہ تمہیں ڈانٹیں یا ناراض ہوں تم کبھی ان کی کسی بات کا برا نہیں مانو گی۔ شادی پہ تم پنک کلر کا ڈریس پہننا تمہیں بہت سوٹ کرے گا۔ ویسے تو تم پر وائٹ کلر بھی بہت سوٹ کرتا ہے مگر شادی پہ وائٹ کلر کون پہنتا ہے؟ اور ہاں میں بریک فاسٹ میں ہاف فرائڈ کھاتا ہوں۔ تمہیں ہاف فرائڈ بنانا آتا ہے؟ آتا ہے ناں؟ چلو اگر نہیں آتا سیکھ لینا اور چکن کارن سوپ بنانا بھی سیکھ لینا۔ وہ صوفی دادا کو بہت پسند ہے۔ اچھا ادھر منہ کرو تم، نوا پہنتی ہو؟'' تیمور نے دوسرے ہاتھ سے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ اس کے ناک میں ننھی سی لونگ دمک رہی تھی۔

''بالکل ٹھیک یہ تم پر بہت سوٹ کر رہی ہے۔ میں تمہیں منہ دکھائی میں ڈائمنڈ کی لونگ دوں گا۔ وہ اور بھی اچھی لگے گی۔ ڈائمنڈ کی لونگ پہن لو گی ناں...... پہن لو گی ناں؟ یہ عینک میں تمہیں نہیں لگانے دوں گا۔ یہ ہر وقت تمہاری ناک پر سجی رہتی ہے۔ ہم لیزر سرجری کروالیں گے۔ عینک کے جھنجھٹ سے نجات مل جائے گی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟

اچھا اب تم بتاؤ میں شادی پہ کس کلر کا سوٹ پہنوں؟'' فلاور شاپ آ گئی تھی۔ تیمور نے اندر داخل ہوتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس کا ہاتھ اب بھی تیمور کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے سوال پر وہ خاموش رہی تو ایک دفعہ پھر تیمور نے پوچھا۔ مگر وہ پھر بھی خاموش رہی۔

''زندہ ہو ناں؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا اس نے فوراً آنکھیں جھکا لیں۔

''اگر زندہ ہو تو بولتی کیوں نہیں ہو؟'' اس کا ہاتھ تھامے وہ پھول چوائس کر رہا تھا۔

''آپ نے کہا تھا اب ایک لفظ بھی کہا تو الٹے ہاتھ کی دو لگاؤں گا۔'' وہ منمنائی تیمور نے قہقہہ لگایا تھا۔ پھر کہنے لگا۔

''وہ تو میں نے باہر کہا تھا اب تو تمہیں بولنے کی اجازت ہے۔ اچھا خیر چھوڑو یہ بتاؤ پھول کون سا پسند ہے۔ میں نے کبھی پھول نہیں خریدے۔ کبھی کسی کو دینے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اب میں جو پسند کروں گا چپ کر کے لے لینا۔ ویسے آج تم پیاری لگ رہی ہو۔ اب پتا نہیں جن سے محبت کرتے ہوں ان کے لیے کس رنگ کا پھول خریدنا چاہیے۔ میری بڑی خواہش تھی میں عمران خان کو پھول دیتا۔ میں سوچتا ہوں جب میں پہلی دفعہ ان سے ملوں گا تو وائٹ فلاور لے کر جاؤں گا۔ اچھا لگے گا ناں؟ ہے ناں؟''

''عمران خان کون ہے؟'' عائشہ نے حیرانگی سے پوچھا۔

''ہائیں تم...... تم عمران خان کو نہیں جانتیں؟'' تیمور کو دھچکا لگا تھا۔ ''تم سچ مچ نہیں جانتیں عمران خان کون ہے؟''

''نہیں۔'' عائشہ نے اس معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں کہ وہ دیکھتا رہ گیا پھر گہری سانس بھر کر مخمور لہجے میں بولا۔

''ہائے! اب تو لگتا ہے مجھے بھی بھول جائے گا عمران خان کون ہے؟''

عائشہ کی کھلکھلاہٹ کا ساتھ پھول کلیوں کے ساتھ ساتھ خود تیمور نے بھی دیا تھا۔



عشق گزیدہ

محبت کا ہمیشہ سے یہی تو اک وطیرہ ہے
جو اس کو نبھاتا ہے اسے یہ مار دیتی ہے

مجھے یک دم محسوس ہوا میں مر گئی ہوں۔ مجھے بھی محبت نے مار ڈالا تھا۔ محبت نے میری روح پر اتنے گھاؤ لگائے تھے کہ اگر کسی جسم پر لگے ہوتے تو شاید اس جسم سے مچھلیاں پکڑنے والے جال کا کام لیا جاسکتا مگر چھلنی روح انسانی آنکھ سے کہاں دیکھی جاسکتی ہے۔

جنوری کی سرد تاریک رات میرے اندر اتر آئی تھی۔ مجھے محسوس ہوا آس پاس کی تمام آکسیجن کوئی پوٹلی میں باندھ کر لے گیا ہو۔ میں نے چند گہرے گہرے سانس بھرے کہ جینے کا کوئی تو وسیلہ ہو مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ایک دفعہ وحید نے مجھے کہا تھا کہ محبت عجیب بیماری ہے جس میں روح گل سڑ جاتی ہے مگر جسم زندہ رہتا ہے کھاتا پیتا سانس لیتا ہے اور میں نے زور و شور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس سے خوب بحث کی تھی مگر آج۔

آج معرکۂ عشق میں اس بری طرح سے ناکام ہوجانے کے بعد مجھے یقین آگیا تھا کہ وحید نے غلط نہیں کہا تھا۔

پچھلے ڈھائی سالوں کے تیس ماہ میرے اردگرد ناچنے لگے اور ساتھ ہی ساتھ...... میں نے گالوں پر نمی محسوس کی۔ جانے کون نوحہ خواں تھا میں یا محبت بہر حال گال بھیگ رہے تھے مگر دل کی سرزمین بنجر پڑی تھی۔ آنسوؤں کی یہی خامی تو مجھے زہر لگتی تھی۔ چہرے کو جل تھل کر دیتے تھے اور دل کو سیراب نہیں کر پاتے تھے۔ اب بے قیمت آنسوؤں کی بے بسی محسوس کرتے ہوئے میں نے آنکھوں کو بے دردی سے رگڑ ڈالا اور جلتی آنکھوں کے ساتھ رسٹ واچ کی طرف دیکھا ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔

گلشن اقبال پارک کا گیٹ بند ہونے میں صرف آدھا گھنٹہ باقی تھا اور یہ آدھا گھنٹہ میں وہیں بیٹھ کر گزارنا چاہتی تھی۔

''آخر وہ کیوں نہیں آیا؟ اس نے کہا تھا وہ سات بجے آجائے گا۔'' میں نے خود سے کہا اور ساتھ ہی ساتھ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دعا کی۔

''پلیز اللہ میاں جی! اسے بھیج دیں۔''

مجھے نہیں یاد،۔۔لپھکم؛۔،۔۔۔ پڑتا کہ حسین احمد سے ملنے کے بعد میں نے کوئی دعا اپنے لیے بھی کی تھی میری ہر دعا اُس سے شروع ہو کر اُس پر ختم ہو جاتی تھی۔ میں نے ایک دفعہ پھر گھڑی کی طرف دیکھا دو مزید منٹ گزر گئے تھے اب صرف اٹھائیس منٹ تھے۔ میرے اندر اس کے نہ آنے کا یقین جنم لینے لگا اور اس کے آنے کی امید حالتِ نزع میں آخری ہچکیاں

لیتی محسوس ہوئی مگر اس کے باوجود میں اپنی جگہ سے نہیں اٹھی بلکہ سنگی بینچ کی بیک سے کمر ٹکا کر مزید مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔

یہ پارک کا نسبتاً تاریک گوشہ تھا کوئی بھی لڑکی مجھے یہاں نظر نہیں آئی۔ کچھ منچلے شرارتی لڑکے سیٹیاں بجاتے گزرے تھے مگر اب اس بات کو بھی آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ ایک اکیلی لڑکی کے لیے رات کے وقت اس پارک میں بیٹھ کر کسی کا انتظار کرنا کس قدر رسکی تھا۔ حسین کو اس کا اندازہ نہیں تھا اگر ہوتا تو شاید وہ دیئے گئے وقت سے کچھ دیر پہلے ہی آجاتا۔ اسے تو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں اس سے ملنے کی خاطر اپنے تمام اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے یہاں آئی تھی۔

جو ڈریس میں نے پہن رکھا تھا وہ میرا اپنا نہیں تھا بلکہ میں اپنی روم میٹ سے مانگ کر پہن کر آئی تھی۔ جوتے بھی میرے اپنے نہیں تھے۔ یہ مانگنے والا کام مجھے سخت ناپسند تھا مگر حسین کی خاطر میں نے یہ کیا تھا کیونکہ میرا تمام سامان پیک ہو چکا تھا۔ صبح مجھے ہاسٹل چھوڑ دینا تھا اور واہ کینٹ کے لیے روانہ ہو جانا تھا۔ دوبارہ لاہور آنا تھا یا نہیں اس کا دارومدار حسین پر تھا۔

میں نے وارڈن سے جھوٹ بولا تھا کہ میں اپنی فرینڈ کے ساتھ کمبائن اسٹڈی کے لیے جارہی ہوں ورنہ مجھے کبھی بھی اجازت نہ ملتی۔ جھوٹ بولنا بھی مجھے پسند نہیں تھا مگر حسین کے لیے میں نے یہ بھی کیا تھا۔ اس ایک شخص کی خاطر میں نے اتنا کچھ کیا تھا کہ اگر اللہ کے لیے کرتی تو شاید میرا شمار اولیاء میں ہونے لگتا۔ اس کے لیے میں نے رسوائی مول لی تھی۔ میں ''میں'' نہیں رہی تھی کوئی اور ہو گئی تھی۔ میں والدین کی ناراضگی کا باعث بن رہی تھی۔ اس کے لیے میں انا کو سب سے نچلی سیڑھی پر رکھ کر محبت کا چوبارہ چڑھ آئی تھی مگر...... میری یادوں کے گھوڑے ماضی کے نخلستانوں میں دوڑنے لگے۔

میرا تعلق واہ کینٹ سے تھا اور میں تعلیم کی غرض سے لاہور میں مقیم تھی۔ حسین احمد سے میری پہلی ملاقات پوائنٹ (P.U کی طالب علموں کے لیے مخصوص بس) میں ہوئی تھی۔ مجھے برٹش رائٹر کی لکھی فائنانس کی کتاب چاہیے تھی جو ہاسٹل کے نزدیکی شاپنگ سینٹر سے نہیں ملی تھی۔ میں نے سوچا کہ اردو بازار سے لے آؤں۔ ساڑھے دس بجے سر ارشد کی کلاس تھی اور ابھی صرف نو بجے تھے اگر میں ابھی چلی جاتی تو دس بجے والی پوائنٹ سے واپس آسکتی تھی۔ میں نے وحیدہ اور روحینہ سے پوچھا تو انہوں نے انکار کردیا۔ میں اکیلے جانے کا فیصلہ کرکے ڈیپارٹمنٹ سے باہر آگئی۔ ہمارا ڈیپارٹمنٹ دس نمبر اسٹاپ کے نام سے مشہور تھا اور ایک سیاسی جماعت کے بے پناہ تسلط کی وجہ سے کوئی بھی لوکل وین یہاں رکے بغیر آگے نہیں بڑھتی تھی سو مجھے جلد ہی وین مل گئی پھر کیمپس پل سے وین بدل کر میں آدھے گھنٹے میں اردو بازار پہنچ گئی۔

بہت تیز رفتاری دکھانے کے باوجود جب کتاب خرید کر میں فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ کے آگے پہنچی تو پوائنٹ بالکل چلنے کو تھا میں پچھلے حصے سے اس میں سوار ہوگئی جو لڑکوں کے لیے مخصوص تھا۔ بیٹھنے کو بالکل بھی جگہ نہیں تھی ظاہر ہے مجھے کھڑا ہونا پڑا مگر ابھی کھڑے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک لڑکے نے اٹھ کر میرے لیے جگہ خالی کردی۔ فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ میرے جیسی دھان پان سی لڑکی خوامخواہ شرم و حیا کا مظاہرہ کرکے کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ میں شکریہ کہہ کر بیٹھ گئی کھڑکی کے بالکل ساتھ ایک اور لڑکا بیٹھا تھا میں نے بیچ میں اپنا بیگ رکھ لیا اور گود میں فائنانس کی کتاب رکھ کر صفحات پلٹتے ہوئے جائزہ لینے لگی۔ ابھی مکمل طور سے جائزہ بھی نہ لے پائی تھی کہ ساتھ بیٹھے شخص نے مجھے مخاطب کیا۔

''ایکسکیوزمی مس! آپ کس ڈیپارٹمنٹ سے ہیں؟''

میں نے کتاب پر سے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر مسکراتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دے دیا۔ میں ہاسٹل میں رہنے والی کسی قدر کنزرویٹو لڑکیوں سے ذرا مختلف ہی تھی۔ خوامخواہ انا یا شرم و حیا کا مظاہرہ کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اکثر اوقات میں لڑکوں کو خود بھی مخاطب کر لیا کرتی تھی اور مجھے کوئی جھجک بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

''او کے فائن میں بھی M.B.E سے ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''مگر......مگر میں نے آپ کو کبھی ڈیپارٹمنٹ میں نہیں دیکھا۔'' میں کچھ حیران تھی۔

''میں بہت زیادہ ریگولر نہیں ہوں۔'' اس کے جواب نے مجھے مزید حیران کیا کیونکہ ہمارے یہاں سمسٹر سسٹم تھا اور اس میں بہت ریگولر ہونا پڑتا ہے۔ اس نے میری حیرانگی کو ختم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ دراصل اس کتاب میں انٹرسٹڈ تھا جو میں ابھی ابھی خرید کر لائی تھی۔ اس کے مانگنے پر میں نے وہ کتاب اس کو دے دی۔ میرا خیال تھا کہ اترتے وقت اس سے واپس لے لوں گی۔ تیس منٹ کے واپسی کے سفر میں میری کتاب اس کے پاس رہی۔ وہ اتنی خشک کتاب میں سے جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ شاید یہ اس کی وجیہہ پرسنالٹی کا اثر تھا کہ میں سوچتے ہوئے بھی اسے دوبارہ مخاطب نہ کر سکی۔

اسٹاپ آیا تو میں اتر گئی اور میری کتاب اس کے پاس ہی رہ گئی۔ جب میں کلاس میں پہنچی تو سر آچکے تھے اس لیے کتاب میرے ذہن سے نکل گئی مگر کلاس آف ہونے کے بعد جب روحینہ اور وحید نے مجھ سے کتاب کے بابت دریافت کیا تو مجھے یاد آیا کہ میں کتاب اس کے پاس بھول آئی ہوں۔ میرا دل چاہا اپنا سر پیٹ لوں۔ برٹش رائٹر کی لکھی کتاب جس کا پاکستانی ایڈیشن مجھے چار سو روپے میں ملا تھا وہ میں ایک اجنبی کے پاس بھول آئی تھی۔ یک دم مجھے خیال آیا کہ اس لڑکے نے کہا تھا وہ میرے ڈیپارٹمنٹ سے ہی ہے۔ یہ سوچ کر مجھے ذرا تسلی ہوئی کہ چلو ہمارے سینئرز میں سے ہوگا اور میں کلاسز آف ہونے کے بعد وہ کتاب اس سے لے سکتی تھی مگر وہ لڑکا ہمارا سینئر نہیں تھا میں نے پہلے M.B.E پھر سارا I.E.R.I چھان مارا مگر وہ لڑکا نہیں نظر نہیں آیا۔

''میرا خیال ہے اب تم اس کتاب پر فاتحہ پڑھ لو۔'' وحید نے کہا تو مجھے اس کی بات سے اتفاق کرنا پڑا۔

سر مغیث کی کلاس ہونے والی تھی اور کلاس میں بے تحاشا شور تھا۔ کوئی لڑکا کلاس لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وحید میرے پاس کھڑا کہہ رہا تھا۔

''پلیز جی آر (گرلز ریپ) کچھ ایسا کرو کہ سر مغیث کلاس نہ لیں۔ تمہیں کیمپس پل کی چاٹ کھلواؤں گا۔''

دوسری طرف سے ناصر کی آواز آئی۔

''میری طرف سے چار نمبر کے دہی بھلے۔''

''آج کوئی خاص بات ہے کیا؟'' روحینہ نے پوچھا جو پچھلے کچھ دنوں سے غیر حاضر تھی۔

''آج اسائنمنٹ سب مٹ کروانے کی آخری تاریخ ہے اور کسی لڑکے نے اسائنمنٹ مکمل نہیں کی۔'' اسے بتا کر میں دوبارہ نوٹس پر نظر دوڑانے لگی کیونکہ اس کلاس کے بعد مسز شمسہ ہمارا ٹیسٹ لینے والی تھیں۔ میں اپنی کلاس کی ٹاپ اسکورر تھی اور پرسنٹیج کی مجھے ہمیشہ فکر رہتی تھی۔

سر مغیث آئے تو ساری کلاس خاموش ہوگئی کیونکہ وہ اپنے غصے کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ انہوں نے تین نئے لڑکوں کو متعارف کروایا جو ہمارے سینئرز کے بھی سینئرز تھے اور دو سمسٹر ڈراپ کر دینے کی وجہ سے ہمارے ساتھ کلاسز لینا چاہ رہے تھے۔ ان کے تعارف کے دوران بھی میں نوٹس میں کھوئی رہی اور ان کی شکلیں نہ دیکھ سکی پھر سر نے لیکچر شروع کیا۔ اسائنمنٹ مکمل نہ کرنے والے لوگوں کو ڈانٹ کا سامنا کرنا پڑا اور مکمل کرنے والوں کو شاباشی ملی۔ لیکچر کے بعد فیضان جو ہمارا کلاس ریپ تھا میرے پاس آکر کہنے لگا کہ ہمیں ان تین لڑکوں کو باضابطہ طور پر ویلکم کہنا چاہیے اس لیے تم لیکٹرن پر آجاؤ۔

دوسری مرتبہ میں نے حسین احمد کو اپنی کلاس روم میں پچھلی رَو میں بیٹھے دیکھا جب کہ وہ اپنے ساتھ بیٹھے لڑکے کے ساتھ

گفتگو میں مصروف تھا۔ فیضان نے لیکٹرن پر ہاتھ مار کر تمام لوگوں کو خاموش ہونے کے لیے کہا پھر ان لوگوں کو ویلکم کہہ کر وہ میری طرف دیکھنے لگا کہ اب میں کچھ بولوں مگر میں صرف حسین احمد کو دیکھ رہی تھی۔ میں نہیں جانتی اس لمحے مجھے کیا ہوا تھا۔ ساری کلاس مجھے دیکھ رہی تھی اور میں اسے دیکھ رہی تھی۔ فیضان کھانسا، روحینہ چیخی، وحید نے سیٹی بجائی مگر میں شاید اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ میں ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ میری اس حرکت کو دیکھتے ہوئے روحینہ اپنی جگہ سے اٹھی پھر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر لے گئی۔ مجھے نہیں معلوم فیضان نے کلاس کو کیا کہا۔ وحید نے کس طرح میرے بی ہاف پر صفائی پیش کی۔ باہر آکر روحینہ مجھے ڈانٹ رہی تھی جب حسین باہر آیا اور میری کتاب واپس کی۔ روحینہ کو میری غائب دماغی کی واحد وجہ وہ کتاب ہی لگی۔ وہ اپنا نام وغیرہ بتا رہا تھا۔ مجھے پہلی دفعہ اس کا نام تب ہی پتا لگا تھا۔

''ان کو شکریہ تو کہہ دو۔'' وہ میرے کان میں گھسی کہہ رہی تھی۔

میں جو سر جھکا کر اس کے شوز کی طرف دیکھ رہی تھی ایک دفعہ پھر اس کی طرف دیکھنے لگی میرے تھینک یو کے جواب میں وہ پھر کچھ کہہ رہا تھا اور میں پھر کچھ نہیں سن رہی تھی۔

قصور میرا نہیں تھا۔ قصور اس کی آنکھوں کا تھا جو مجھے چاروں طرف سے جکڑ لیتی تھیں۔ میرے اس طرح دیکھنے پر وہ لڑکا ہو کر گڑبڑا گیا اور مزید کچھ کہے بغیر واپس چلا گیا مگر جاتے جاتے مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ روحینہ کے پاس جو کھڑی تھی وہ میں نہیں تھی وہ تو کوئی اور تھا شاید خود حسین احمد۔

''سارے مینوں رانجھا آکھو ہیر نہ آکھو کوئی۔''

کا مطلب مجھے صحیح معنوں میں اس روز سمجھ میں آیا۔ دادی کہا کرتی تھیں مرد کی آنکھ میں براہِ راست نہیں دیکھنا چاہیے۔ یہ گناہِ بےلذت ہے۔ اس رات حسین احمد کے بارے میں سوچتے ہوئے میں اسی گناہِ بےلذت کا ارتکاب کرتی رہی۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں کے آگے سے ہٹتی ہی نہ تھیں۔ بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے میں نے بارہا خود سے پوچھا۔

''کیا یہ محبت ہے؟''

اور ہر مرتبہ اس سوال کے جواب میں میرے اندر خاموشیاں اتر آئیں۔ خاموشی کا مطلب نیم رضامندی ہوتا ہے۔ میں نے نہیں کہا لوگ کہتے ہیں۔



''یہ محبت نہیں ہے۔'' صبح جب میں نے ساری بات سمیعہ کو بتا کر اس سے پوچھا تو اس نے کہا تھا۔

''ہاں صائمہ! یہ محبت نہیں ہے۔ یہ آزمائش ہے ہوس اور نفس کی آزمائش ایسی آزمائش بہت کڑی ہوتی ہے۔ تم خدا سے دعا کرو وہ تمہیں اس آزمائش سے بچالے۔''

اس کی بات پر ایک مردہ سی مسکراہٹ نے میرے چہرے کا احاطہ کیا۔

کاش میں ایک دفعہ اس کی بات مان کر رب سے دعا کر لیتی کہ۔

''اے اللہ میں اس آزمائش کے لیے نااہل ہوں۔ تُو مجھے اس سے بچالے......'' تو شاید آج میرا یہ حال نہ ہوتا۔ میری تقدیر بدل جاتی اور حالات قدرے مختلف ہوتے مگر ایسا ممکن ہی نہیں تھا شاید۔

سب سے پہلے روم میٹس کو، پھر فرینڈز کو، اس کے بعد باقی کلاس فیلوز کو اور پھر آہستہ آہستہ سارے ڈیپارٹمنٹ کو خبر ہو گئی کہ صائمہ نزہت علی اس بیماری کا شکار ہیں عرف عام میں جسے عشق کہتے ہیں اور میں نے کوئی بھی کسر نہیں چھوڑی تھی

لوگوں کو باور کرانے میں کہ میں مبتلائے عشق ہوں۔ اگر چہ میں نے منہ سے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا مگر میری حالت چیخ چیخ کر کہتی تھی۔

بقول وحید۔

''صائمہ! تمہاری روح کے دھانوں پر عشق کا سبز تیلا حملہ آور ہو چکا ہے۔ تمہارا بچنا بے حد مشکل ہے۔''

ڈیپارٹمنٹ میں وحید اور روحینہ ہی میرے سب سے اچھے دوست تھے۔ وہ اکثر مجھے سمجھاتے مذاق اڑاتے، نصیحتیں کرتے مگر مجھ پر کسی چیز کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔

میرا خیال تھا حسین اس بات سے بے خبر ہے مگر جس بات سے سارا ڈیپارٹمنٹ باخبر تھا وہ اس سے کتنی دیر بے خبر رہ سکتا تھا۔ وہ نہ صرف آگاہ تھا بلکہ اس بات پر خاصا ناراض بھی تھا۔

اس روز سب سے پہلی کلاس مسز شمسہ کی تھی۔ وہ بے حد پنکچوئل تھیں اور اپنے اسٹوڈنٹس میں بھی یہ خوبی دیکھنا پسند کرتی تھیں۔ اس لیے سب کی حتی الامکان کوشش ہوتی کہ جس روز پہلی کلاس ان کی ہو اس روز دس منٹ پہلے ہی پہنچ جائیں۔ اتفاق سے اس روز مجھے دیر ہوگئی۔ ہماری یہ کلاس سرسید ہال میں ہوتا تھی جو فرسٹ فلور پر تھا میں بھاگم بھاگ اوپر پہنچی۔ میڈم کلاس میں آچکی تھیں ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں سامنے سے وہ آتا نظر آیا۔ کیسا اتفاق تھا اسے بھی دیر ہوگئی تھی۔

''میڈم کلاس میں ہیں؟'' نزدیک آکر اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں خاموش رہی۔ قصور اب بھی میرا نہیں تھا۔ میں کیا کرتی زبان کی ٹکسال پر لفظوں کے سکے بننا بند ہو گئے تھے۔ مجھے یاد نہیں اس نے مجھے دو مرتبہ مخاطب کیا یا تین مرتبہ ہاں یہ مجھے یاد ہے کہ میں ہر دفعہ خاموش رہی تھی۔ اُکتا کر اس نے دروازہ ناک کیا مسز شمسہ کلاس میں آتے وقت دروازہ بند کر دیا کرتی تھیں اور اس دروازے کو کھلوانا مشکل کام ہوا کرتا تھا۔

اس کے طنزیہ اور غصیلے سوالات کا سامنا کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں حسین کو سمجھانا چاہتی تھی کہ وہ آج کلاس لینے کا خیال دل سے نکال دے مگر آواز بے بس پرندے کی طرح صیاد کی قید میں محسوس ہو رہی تھی۔ حسین کو شاید بھروسہ تھا کہ وہ یہ مشکل جنگ جیت لے گا سو اس نے دوبارہ ناک کیا اور ذرا زور سے کیا۔ دروازہ کھل گیا تھا۔ حسین نے میری طرف دیکھے بغیر قدم اندر رکھ دیئے اور آگے بڑھ کر میڈم سے ایکسکیوز کیا تو ہم دونوں کو اندر آنے کی اجازت مل گئی۔ حسین پچھلی رو میں جا کر بیٹھ گیا اور میں دروازے میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اس شخص کو دیکھ کر عجب سا پاگل پن مجھ پر سوار ہو جاتا تھا۔ میں ہوش و خرد کی دنیا سے بیگانی ہو جاتی تھی۔ اب تک صرف کلاس فیلوز آگاہ تھے مگر اساتذہ کی باری بھی آگئی تھی۔ آخر وہ کب تک بے خبر رہتے جب کہ میں خود ہی چھپانے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ میڈم نے میری حالت دیکھی پھر ایک نظر حسین پر ڈالی جو میری طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''آپ کیا اپنی نشست تک گاڑی میں جانا چاہتی ہیں؟'' وہ خاصی طنزیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔ میں یک دم ہوش کی دنیا میں آئی پھر بجائے اس کے کہ میڈم سے ایکسکیوز کرتے ہوئے کلاس میں چلی جاتی میں وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور لائبریری میں آکر پناہ لی۔

''آئی وانٹ ٹو سی دس لیڈی آفٹر دی کلاس۔''

کلاس کے بعد ان کا یہ پیغام مجھے روحینہ نے دیا تھا۔ میں ان سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ میں جانتی تھی میں ان سے

کچھ بھی چھپا نہیں پاؤں گی۔ سب کچھ میری توقع کے مطابق ہوا تھا۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ میں حسین میں انٹرسٹڈ ہوں۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہاسٹل میں رہتے ہوئے لڑکیاں اتنی شترِ بے مہار کیوں ہو جاتی ہیں؟ آپ لوگ اپنی توانائیوں کو مثبت طریقے سے کام میں کیوں نہیں لاتیں؟''

میری الف لیلہ سن کر انہوں نے تمام ہوسٹلائزڈ لڑکیوں کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا۔

''کیا اس نے خود تم سے کہا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے؟'' میرے خاموش رہنے پر وہ ایک دفعہ پھر پوچھنے لگیں۔ میں اب بھی خاموش رہی تو وہ قدرے غصے سے بولیں۔

''تم نے اس سے کہا کہ تم اس سے محبت کرتی ہو؟'' ظاہر ہے میرا جواب نفی میں ہونا تھا اور نفی میں جواب دینے سے بہتر ہے انسان خاموش رہے۔

''صائمہ! تمہارا اکیڈمک ریکارڈ خاصا بہتر ہے۔ مجھے اسٹڈیز کے سلسلے میں کبھی تم سے کوئی شکایت نہیں رہی لیکن......'' انہوں نے لحہ بھر کو توقف کیا۔

''کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں حسین احمد کو تمہارے سامنے بلا کر بات کروں؟''

ان کے الفاظ سرد تھے مگر لہجے میں جو حدت تھی اس نے میرے اردگرد پھیلی منجمد خاموشی کو پگھلا کر رکھ دیا۔

''نو......نو میم! پلیز ایسا مت کیجئے گا۔'' میں نے گھگھیا کر کہا۔ وہ ذرا کی ذرا پسیجیں مگر ایکسرے مشین جیسی آنکھیں اب بھی مجھ پر مرتکز تھیں۔ پھر میں انہیں بتانے لگی کہ ہمارا لوّ افیئر باقی لو افیئر ز سے مختلف تھا۔ میں نے A سے لے کر Z تک ساری بات بتا دی جسے سن کر انہوں نے بہت شفقت کے ساتھ ون سائیڈڈ لوّ کے نقصانات پر لمبا چوڑا لیکچر دیا ظاہر ہے وہ پہلی خاتون نہیں تھیں جنہوں نے مجھ سے ایسی باتیں کیں میرے تمام فرینڈز مجھے اس قسم کے لیکچرز دیتے ہی رہتے تھے۔ میں نے کوئی کوشش نہیں کی خود بخود ہی ان کا تمام لیکچر بخارات میں ڈھل کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

○......❖......○

''تمہیں میڈم شمسہ کو یہ سب نہیں بتانا چاہیے تھا۔'' اگلے دن روحینہ کو پتا چلا تو وہ کہنے لگی۔

''میں کیا کرتی روحی؟ انہوں نے خود ہی اگلوا لیا سب۔'' میں خود بھی شرمندہ تھی۔

''جانتی ہو اب کیا ہوگا؟'' وہ مجھے مزید ہولانے کے موڈ میں تھی۔

''کچھ نہیں ہوگا روحی! وہ بہت اچھی ٹیچر ہیں اس بات کو کبھی بھی لیک آؤٹ نہیں کریں گی۔'' اس سے زیادہ میں نے خود کو تسلی دی۔

''لیک آؤٹ نہیں کریں گی ساری کلاس کے سامنے تمہیں پوائنٹ آؤٹ کر کے کہا کریں گی کہ لڑکیوں کو محبت کے معاملات میں محتاط رہنا چاہیے اور یہ کہ Dignity is priceless وغیرہ وغیرہ اور پھر اگر وائس چانسلر تک بات پہنچ گئی تو خوامخواہ پیشی بھگتنی پڑے گی۔'' روحینہ کی عادت تھی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑا کر دینے والی اسے چو برجی کے برج بھی مینارِ پاکستان جتنے بڑے لگا کرتے تھے۔

''پلیز روحی! اب تم اسے ڈراؤ مت۔'' وحید نے اس سے کہا پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔

''گڑیا اگر تم کہو تو میں حسین سے بات کروں۔'' وہ میرا سب سے اچھا دوست جب میرا زیادہ احساس کرتا تو یونہی بات کیا کرتا تھا۔

''تم اس سے کہو گے کیا؟'' روحینہ نے سوال کیا۔

''کچھ بھی کہہ دوں گا مگر کم از کم سیمی کو تو اس آر یا پار کی کیفیت سے نجات ملے۔''

''نہیں وحید! پلیز تم اس سے کچھ مت کہنا۔ مجھے ڈر لگتا ہے وہ...... وہ ناراض ہو جائے گا۔'' میں نے کہا تو وہ اور بھی تپ گیا۔

''میں تمہیں سمجھ نہیں پایا گڑیا! ایک طرف تم اس سے محبت کرتی ہو اس کو دیکھ کر ٹن ہو جاتی ہو اور دوسری طرف اس سے خوفزدہ رہتی ہو بات تک نہیں کرنا چاہتیں۔''

''میں بھی سمجھ نہیں پائی وحید! بولو میں کیا کروں؟'' میں رونے لگی۔ وحید نے مجھے چپ نہیں کروایا تھا وہ خاموشی سے میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔

''یہ حسین کا فون نمبر اور ای میل ایڈریس ہے۔ تم جب چاہو اس سے رابطہ کر سکتی ہو بہتر یہ ہے کہ تم اس سے آج ہی بات کرو۔ یہ جاننے کی کوشش کرو وہ کیا چاہتا ہے اگر اس کی بھی یہی مرضی ہے جو تمہاری ہے تو بات کو صحیح طریقے سے آگے بڑھاؤ اور اگر وہ ایسا نہیں چاہتا تو پلیز احمقوں کی جنت سے باہر آ جاؤ۔ ایک سے ایک اچھا لڑکا مل سکتا ہے تمہیں۔''

دو روز بعد وحید نے اس کا کانٹیکٹ نمبر مجھے دیتے ہوئے بہت پیار سے نصیحت کی۔ میں عجب شش و پنج کی کیفیت میں تھی۔ دل کہہ رہا تھا فوراً اس کے ہاتھ سے وہ چٹ پکڑ لوں جس پر حسین کا نمبر لکھا تھا اور دماغ شرم کرو شرم کرو کی تلقین کر رہا تھا۔

''وحید ایک بات پوچھوں؟'' میں نے آنکھیں زمین کی طرف جھکائے ہوئے پوچھا۔

''میں حسین نہیں ہوں گڑیا! مجھ سے بات کرتے ہوئے کبھی جھجکا مت کرو۔'' اپنائیت اس کے لہجے سے ٹپک رہی تھی۔

''وحید اگر میری جگہ روشین ہوتی تو کیا تم...... تو کیا تم اس کو بھی ایسے ہی یہ لا دیتے۔'' میں نے فون نمبر والی چٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی بہن کا نام لیا۔ اپنائیت جو اس کے لہجے سے ٹپک رہی تھی یکا یک ٹپکنا بند ہو گئی بہت ٹھنڈے لہجے میں اس نے کہنا شروع کیا۔

''تم نے کبھی غور سے حسین کو دیکھا ہے؟ اس کی ڈریسنگ پہ کبھی غور کیا ہے؟ اس کی لینڈ کروزر پہ نظر کی ہے کبھی؟ وہ کوئی عام بندہ نہیں ہے اور وہ اپنے آپ کو عام بندہ سمجھتا بھی نہیں ہے۔ وہ آسمانوں پہ رہتا ہے۔ اس کے خاندان کا اونچا نام، اس کا ایم این اے باپ، اس کی یہ بڑی سی گاڑی، اس کی شاندار سی پرسنالٹی سب چیزیں مل جل کر اسے زمین کی طرف دیکھنے بھی نہیں دیتیں۔ گرمیاں اس نے کبھی پاکستان میں نہیں گزاریں ہمیشہ کسی یورپ کے ملک میں گزارتا ہے۔ اس کے کپڑے پیرس سے ڈیزائن ہو کر آتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں اس نے ملک کے مشہور ڈریس ڈیزائنر کا کمرشل ایڈ کیا تو اسے کھدر کے چھ سوٹ ملے اور ان چھ سوٹوں میں سے اس نے ایک بھی اپنے پاس نہیں رکھا بلکہ اپنے دوستوں کو گفٹ کر دیئے۔ فیضان اور عمر کے جن شلوار سوٹ کی پرسوں تم تعریف کر رہی تھیں وہ انہیں حسین نے ہی گفٹ کیے ہیں۔ بلوچستان کے قحط زدگان کے لیے جو چند دن پہلے فنڈ ریزنگ ہوئی ہے اس میں سب سے زیادہ فنڈ اسی نے دیا۔'' وہ چپ ہو گیا تھا میں سمجھی اس کی بات ختم ہو گئی ہے مگر آگے جو اس نے کہا وہ اور بھی انسلٹنگ تھا۔

''میری بہن بے وقوف نہیں ہے گڑیا! لیکن اس کے باوجود اگر وہ ایسی حرکت کرتی تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دیتا۔'' اتنا کہہ

کر وہ رکا نہیں تھا بلکہ چلا گیا تھا اور جاتے جاتے فون نمبر والی چٹ زمین پر پھینک گیا تھا جو میں نے چپ چاپ اٹھا کر بیگ میں رکھ لی۔ یہ سوچتے ہوئے کہ محبت کے یہاں اَنا جیسی اولادِ نرینہ پیدا ہونے سے بہتر ہے محبت بے اولاد رہے۔

میں نے ہاسٹل پہنچتے ہی اس کے گھر فون کیا کیونکہ اس روز وہ غیر حاضر تھا اور میں اس کی غیر حاضری کو اس کے یہاں کال کرنے کی وجہ بنانا چاہتی تھی۔

مجھے وحید کی باتوں پر اتنا یقین نہیں آیا تھا بھلا اگر حسین اتنا ہی امیر تھا تو پوائنٹ سے کیوں آتا جاتا تھا۔ اس کے کپڑے بھی پیرس کے ڈیزائنرز کے ڈیزائن کیے ہوئے تو نہیں لگتے تھے۔ ہاں موبائل اس کے پاس ہوتا تھا گاڑی بھی لینڈ کروزر ہی تھی۔ میں بھول گئی تھی کہ جینٹری کے شوق ایسے ہی ہوتے ہیں دل چاہا تو آسمان پہ اُڑ لیا دل چاہا تو زمین پہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔

''حسین بھائی گھر پر نہیں ہیں، وہ سوئمنگ کے لیے گئے ہیں۔ آپ پانچ بجے کال کیجئے گا۔'' میرے استفسار پر اس کے چھوٹے بھائی نے کہا اور جب میں نے پانچ بجے کال کی وہ تب بھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ پانچ بجے ہاسٹل کا گیٹ بند ہو جاتا تھا میں نے سمیعہ سے کالنگ کارڈ لے کر ساڑھے چھ بجے فون کیا تو وہ شاور لے رہا تھا۔ مجھے ایک دفعہ پھر آٹھ بجے فون کرنے کے لیے کہا گیا اور جب میں نے آٹھ بجے فون کیا تو ریسیور کرنے والا وہ خود ہی تھا۔

''یس حسین اسپیکنگ۔'' اس کی آواز سن کر جب میں نے اسے بتایا کہ میں کون ہوں تو اس کا اچھا بھلا نرم لہجہ درشت ہو گیا۔

''صبح ڈیپارٹمنٹ میں بات کیجئے گا ابھی میں مصروف ہوں۔''

اس نے میری بات سنے بغیر ہی لائن ڈسکنیکٹ کر دی۔

''صائمہ! اگر تمہارا پھر کبھی رونے کا پروگرام ہو تو مجھے انفارم کر دینا میں اس رات کسی اور کے روم میں سو جاؤں گی۔''

میری روم میٹ نے اگلی صبح مجھے کہا تھا۔



''صائمہ نزہت علی! آپ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہیں؟''

میں اگر ذرا بھی منہ پھٹ ہوتی تو فوراً کہہ دیتی شادی مگر میں نہیں تھی سو خاموش بیٹھی رہی پھر حسین کا لہجہ اتنا غصیلا تھا کہ مجھے خاموش رہنے میں ہی عافیت نظر آئی۔ اس نے پہلی کلاس نہیں لی تھی اور مجھے بھی لینے نہیں دی تھی۔ صبح جب میں ڈیپارٹمنٹ پہنچی تو وہ پہلے سے موجود تھا۔

''مجھے، آپ سے بات کرنی ہے ذرا لائبریری میں آئیں۔''

''آپ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہیں؟'' میرے خاموش رہنے پر اس نے ایک دفعہ پھر کہا۔ میں جھکے سر کے ساتھ اسے سن رہی تھی۔

''آپ کو احساس ہے آپ کس قسم کی حرکتیں کر رہی ہیں۔ لڑکیاں تو ایسا نہیں کرتیں لڑکیوں کو تو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ سارا ڈیپارٹمنٹ آپ کو اور مجھے لے کر عجیب عجیب باتیں کر رہا ہے۔ میں لوگوں کو بتا بتا کر تھک گیا ہوں کہ میرا آپ سے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے اور میں...... اور میں ایسا کوئی تعلق بنانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا۔''

میں نے ایک دم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ کچھ تو تھا میری آنکھوں میں ایسا کہ وہ نظریں چرانے پر مجبور ہو گیا۔

''میں نہیں جانتا آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ مجھے فیضان نے بتایا ہے کہ آپ اپنی اسٹڈیز کو لے کر ہمیشہ سیریس رہی ہیں۔ آپ کی پرسنٹیج بھی سب سے زیادہ ہے پھر...... صائمہ! آپ اچھی لڑکی ہیں۔ آپ کے اچھے اکیڈمک ریکارڈ کی وجہ سے میں آپ کو خاصا پسند کرتا ہوں۔ میں نے لڑکیوں میں کبھی اتنی ذہانت نہیں دیکھی جتنی کہ آپ میں مگر......''

اس کی بات سن کر میرا دل چاہا وہ تمام رزلٹ کارڈز جو مجھے جان سے زیادہ عزیز رہے ہیں اکٹھے کروں اور چولہے پر رکھ کر جلا ڈالوں۔ جب کہ وہ کہہ رہا تھا۔

''کل جب آپ نے مجھے کال کیا تو میں ڈنر کر رہا تھا۔ میری تمام فیملی وہاں موجود تھی۔ آپ کی کال کے بعد مجھے ان لوگوں سے جھوٹ بولنا پڑا کہ میرے دوست کا فون تھا۔ ہم پٹھان ہیں ہمارے یہاں لڑکیوں سے فرینڈ شپ کو اتنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔''

وہ اپنے آپ کو ایک سپر یسڈ چائلڈ کے طور پر پیش کر رہا تھا۔

''آپ کچھ نہیں کہیں گی صائمہ؟'' اب کی بار اس کا لہجہ خاصا اُکتایا ہوا تھا میں نے بہت چاہا کہ منہ سے لفظ نکلیں آنکھ سے آنسو نہ نکلیں مگر کامیابی نہ ہوئی لفظ نکل نہ سکے اور آنسوؤں نے ایک کے بعد ایک نکلنا شروع کر دیا۔ کہتے ہیں آنسو عورت کا ہتھیار ہوتے ہیں لیکن ایسے بے بس ہتھیار سے مرد کو قابو نہیں کیا جا سکتا۔ میں بھی حسین کو اس ہتھیار سے کہاں جیت سکتی تھی۔ میرے آنسو دیکھ کر اسے اور بھی غصہ آ گیا۔

''آپ رو کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہیں۔ کیا میں نے آپ سے کچھ وعدے کیے تھے جنہیں نبھانے سے میں نے انکار کر دیا ہے۔ میں نے آپ کے ساتھ اکٹھے جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ تحفے تحائف کا تبادلہ کیا ہے۔ میں نے آپ کے ساتھ؟ پلیز صائمہ! میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ میں زیادہ دیر یہاں نہیں ہوں آپ کے ساتھ یہی ایک سمسٹر ہے میرا آپ کے ساتھ پھر میں چلا جاؤں گا۔ جتنا عرصہ میں یہاں ہوں مجھے عزت سے گزار لینے دیں۔ لوگوں کی جلتی نگاہوں کا سامنا میں نہیں کر سکتا آپ کر سکتی ہوں گی۔ پلیز میری جان بخش دیں۔''

اس کے غصیلے لہجے نے میرے آنسوؤں میں ایک تسلسل پیدا کر دیا۔ روحینہ جو کلاس آف ہونے پر لائبریری میں آئی تھی مجھے روتا دیکھ کر میرے پاس آ گئی۔ آنسوؤں کے لیے ہمدردی Catalyst کا کام کرتی ہے۔ میرے آنسوؤں میں مزید تیزی آئی لیکن اب میں اس شخص کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی سو میں لائبریری سے باہر آ گئی جب کہ روحینہ اس کے پاس کھڑی رہی تھی۔

''وہ انگیجڈ ہے صائمہ! اس کی منگیتر کنگ ایڈورڈ سے ایم بی بی ایس کر رہی ہے۔ تھرڈ پراف چل رہا ہے اس کا۔ فورتھ پراف کے بعد ہاؤس جاب سے پہلے ان دونوں کی شادی ہو جائے گی اور بدلے میں حسین کی بہن کی شادی اس کے سالے سے ہو جائے گی۔ وٹہ سٹہ ہے یہ تم سمجھ رہی ہوناں؟'' روحینہ نے بعد میں مجھے بتایا تھا۔

''مجھے حسین نے کہا ہے کہ میں تمہیں بتا دوں اگر تم نے یہ سب حرکتیں نہ چھوڑیں تو وہ ڈیپارٹمنٹ آنا چھوڑ دے گا۔ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اسے اس چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کی ڈگری نامکمل رہ جائے گی۔''

''نہیں اس سے کہو ڈیپارٹمنٹ آنا نہ چھوڑے میں اسے نہیں دیکھوں گی۔ اس کے راستے میں بھی نہیں آؤں گی۔'' میں نے روحینہ کا ہاتھ پکڑ کر التجا کی۔

''ٹھیک ہے میں اس سے کہہ دوں گی مگر تم اپنا خیال رکھو صائمہ! برسوں کی بیمار لگ رہی ہو۔''

میں نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا بلکہ میں نے اس کے بعد ہر ایک کی بات پر دھیان دینا ہی چھوڑ دیا۔ میں تیے ساری دنیا سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ صبح ڈیپارٹمنٹ جاتی فارغ وقت میں لائبریری۔ البراور سلیم وغیرہ میرا مذاق اڑاتے۔ شائنہ اور ذاکرہ فقرے کستیں مگر میں پرواہ نہ کرتی۔ میں نے ان ہواؤں سے آئین بھی کشید کرنا چھوڑ دی جن کے متعلق مجھے گمان ہوتا کہ یہ حسین کے پاس سے ہو کر آئی ہیں میرا کمپلیکشن ڈارک ہو گیا تھا۔ ہال رف ہو گئے تھے۔ میں جو اپنی ڈریسنگ کی وجہ سے مشہور تھی شکن آلود کپڑوں میں نظر آنے لگی۔

سمسٹر تیزی سے اختتام کی طرف گامزن تھا ٹیچر کے لیکچرز میں تیزی آ گئی تھی۔ میں نے خود اپنے اوپر پہرے لگا رکھے تھے۔ میں حسین کو دیکھتی بھی نہیں تھی۔ اپنی تو مجھے پروا نہیں تھی مگر اس کی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ڈگری نامکمل رہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے پیرنٹس کے پاس اس کا پرپوزل ریجیکٹ کرنے کے لیے کوئی اس قسم کا جواز ہو۔ میں نے اپنے ان خیالات کو وحید سے بھی ڈسکس نہیں کیا تھا ورنہ وہ ایک دفعہ پھر میری دنیا کو احمقوں کی جنت قرار دیتا۔ وہ سمجھتا تھا میں سدھر گئی ہوں حسین کو بھول گئی ہوں۔ حقیقت صرف میں جانتی تھی یا میرا خدا۔

وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے کیونکہ اس کے بہاؤ میں پانی کے بہاؤ سے زیادہ روانی ہے۔ ہم تھرڈ سمسٹر میں آئے تو حسین اور اس کے باقی دو کلاس فیلوز نے ڈیپارٹمنٹ آنا چھوڑ دیا۔ ان لوگوں کی انٹرن شپ چل رہی تھی۔ وحید نے ایک روز باتوں باتوں میں مجھے بتایا تھا کہ حسین آواری میں انٹرن شپ کر رہا ہے۔

دو ماہ ہو گئے تھے میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا ایک دفعہ اسے دیکھوں۔ صرف ایک دفعہ، میری خواہش اتنی بڑی نہیں تھی لیکن اس خواہش کا ذکر میں وحید یا روحینہ سے نہیں کر سکتی تھی کیونکہ ان کے خیال میں میں نے اس پاگل پن سے پیچھا چھڑا لیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میری حالت اب بہت سنبھل گئی تھی۔ میں دھیرے دھیرے پہلے جیسی ہونے لگی تھی۔

ہم نے اپنے جونیئرز کو ویلکم پارٹی دی تھی اس پارٹی میں، مَیں وائٹ رنگ کا ڈریس پہن کر گئی تھی اور تمام لوگوں نے مجھے سراہا تھا۔ میں نے اس روز اتنی دعا مانگی تھی کہ ایک دفعہ حسین آ جائے۔ چاہے وہ مجھے نہ دیکھتا میں تو اسے دیکھ لیتی مگر میری دعائیں میری محنت کی طرح بے ثمر رہتی تھیں۔

انٹرن شپ کے بعد حسین کو رپورٹ لکھنی تھی اسے سب مٹ کرانا تھا پھر اس کا وائیوا ہونا تھا۔ یہ سارے کام ڈیپارٹمنٹ میں ہونے تھے۔ میں انتظار کر رہی تھی کہ وہ دن جلد آئے جب حسین کی رپورٹ مکمل ہو اور وہ وائیوا کے لیے ڈیپارٹمنٹ آئے۔ اسی دوران واہ کینٹ سے امی کا فون آ گیا وہ میرے لیے اداس ہو رہی تھیں۔ میں پچھلے چار ماہ سے گھر نہیں گئی تھی۔ کبھی کبھی مجھے خود پر بھی حیرت ہونے لگتی تھی۔ کیا تھی میری محبت؟ کیا فائدہ تھا ایسی محبت کا جو مجھے اپنے پرائے کی پہچان بھی بھلائے دے رہی تھی۔ میں نے امی کو ٹال دیا کہ میں مصروف ہوں نہیں آ سکتی مگر بھائی کو نہ ٹال سکی جو بہاولپور کے قائداعظم میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھا۔ وہ خود لاہور مجھے لینے کے لیے آیا تھا ارادہ تھا دو دن رہ کر آ جاؤں گی مگر امی ابو نے ایک ہفتے بعد مجھے آنے دیا۔ اس دوران حسین نا صرف رپورٹ سمٹ کروا چکا تھا بلکہ اس کا وائیوا بھی ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ پھر میرے پاس بہانے کے لیے آنسو اور کرنے کے لیے دعا رہ گئی تھی۔



''السلام علیکم! کیا میں حسین صاحب سے بات کر سکتی ہوں؟'' میں نے ان سے کہا۔ وہ آواز سے حسین کی امی لگ رہی تھیں۔ پورے پانچ ماہ بعد میں ایک دفعہ پھر اس کے یہاں فون کر رہی تھی۔ مجھے اس سے ملنے کی ایک یہی راہ سمجھ میں آئی۔

اس کی امی نے بہت شفقت سے بات کی اور مجھے بتایا کہ حسین گھر پر نہیں ہے کنگ ایڈورڈ میں کوئی میوزیکل کنسرٹ ہو رہا تھا وہ وہاں گیا ہوا تھا۔ میں نے جب ان سے پوچھا کہ وہ اکیلا گیا ہے یا اس کی منگیتر بھی ساتھ ہے تو وہ بہت ہنسیں اور کہنے لگیں۔

''کون سی منگیتر؟ بیٹا! ہم نے ابھی حسین کی کہیں منگنی نہیں کی اس نے آپ سے مذاق کیا ہوگا؟''

''آنٹی آپ اس کا موبائل نمبر دے سکتی ہیں مجھے؟'' میں نے ان سے کہا۔ انہوں نے چند لمحوں بعد موبائل نمبر مجھے نوٹ کروا دیا۔ حسین نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس جھوٹ پر کس قسم کے ردِعمل کا مظاہرہ کروں۔ یہ بات سن کر میرے اندر اطمینان اتر آیا تھا کہ وہ انگیجڈ نہیں ہے مگر یہ بات دکھ دے رہی تھی کہ اس نے مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جھوٹ موٹ کی منگیتر پیدا کرنا بھی گوارا کر لیا تھا۔

میں نے اسی وقت اس کے موبائل پر رِنگ کیا۔ کال ریسیو کرنے والی کوئی لڑکی تھی۔

''آپ کون ہیں؟ کیا آپ اس کی نئی گرل فرینڈ ہیں؟'' حسین کے متعلق استفسار کرنے پر اس نے مجھے بتایا۔ حسین کی امی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کنسرٹ اٹینڈ کرنے گیا ہے مگر بیک گراؤنڈ سے بے ہنگم شور نہیں آ رہا تھا بلکہ دبی دبی سی ہنسی کی آوازیں آ رہی تھیں اس کا مطلب یہ تھا کہ حسین نے اپنی امی سے بھی مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا۔ ابھی میں کچھ کہہ نہیں پائی تھی کہ حسین کی آواز سنائی دی۔

''کون ہے شینا؟''

''تمہاری نئی گرل فرینڈ ہے؟'' شینا نامی لڑکی نے کہا۔

''بکواس نہیں کرو تمہارے علاوہ میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔'' حسین کی آواز آئی۔

''دیکھیں مس! اگر آپ حسین سے فرینڈ شپ میں انٹرسٹڈ ہیں تو میں آپ کو بتا دوں یہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ بے حد کنجوس اور بور شخص ہے یہ بہتر ہے آپ کوئی اور......'' وہ لڑکی کہہ رہی تھی مگر ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اس سے موبائل چھین لیا گیا۔

''ہیلو کون بات کر رہا ہے؟'' یہ آواز حسین کی تھی۔ میرے حسین کی۔ وہ مسلسل ہیلو ہیلو کہہ رہا تھا مگر میں خاموش رہی۔ اس کی آواز مجھے اتنی اچھی لگ رہی تھی دل چاہ رہا تھا وہ بولتا رہے میں سنتی رہوں مگر اس نے خاموشی سے اُکتا کر موبائل آف کر دیا۔

پھر یہ میری ریگولر روٹین بن گئی۔ مجھے جب وقت ملتا میں اس کے موبائل پر رِنگ کر دیتی وہ بولتا میں سن لیتی۔ دو ایک مرتبہ اس نے مجھے انگلش میں گالیاں بھی دیں مگر میں ایسی ڈھیٹ تھی کہ گالیاں سن کر بھی بے مزہ نہیں ہوئی۔ لیکن یہ سلسلہ کب تک چل سکتا تھا آخر اسے ایک روز پتا چل گیا کہ یہ میں ہوں۔

○......❖......○

''صائمہ! حسین آیا ہوا ہے۔'' روحینہ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ سر مغیث مارکیٹنگ کے اصولوں اور قوانین پر بحث کر رہے تھے۔ فیضان تابڑ توڑ سوالات کر رہا تھا۔ کیوں؟ کیسے؟ کس لیے؟ اس کے پسندیدہ الفاظ تھے۔ میری ساری توجہ لیکچر ہی کی طرف تھی مگر جب تک روحینہ نے اس کی آمد کے متعلق نہیں بتایا تھا۔

''میں نے ابھی ابھی اسے کلاس روم کے دروازے کے آگے سے گزرتے دیکھا ہے؟'' روحینہ جو بیٹھی تو میرے ساتھ تھی مگر مسلسل باہر دیکھ رہی تھی ایک دفعہ پھر میرے کان میں گھس کر بولی۔ اب کی بار وہ سر مغیث کی زیرک نگاہوں سے چھپ نہ

سکی۔ سر نے اسے کلاس روم سے باہر جانے کے لیے کہا کیونکہ وہ بول رہی تھی۔ میرے ساتھ بول رہی تھی اس لیے مجھے بھی باہر بھیج دیا گیا۔ وحید ہمارے بغیر کلاس اٹینڈ نہیں کرتا تھا۔ اس لیے وہ بھی مصنوعی کھانسی کھانستا ہوا اٹھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہم سے پہلے باہر آ گیا۔

''اب کیا پروگرام ہے لیڈیز؟'' وحید بولا۔

''ماس کمیونیکیشن والوں کی کینٹین پر آئس کریم ملتی ہے۔ وہاں چلیں۔''

روحینہ کو کھانے پینے کا بہت شوق تھا۔

''کیوں پرنسس چلیں پھر۔'' وحید نے میری طرف دیکھا۔

''ہاں چلتے ہیں مگر تھوڑی دیر بعد۔'' میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ اگر حسین سچ مچ ڈیپارٹمنٹ آیا ہوا تھا تو میرا اس سے ملنا زیادہ ضروری تھا۔ لیکن میں یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ آیا ہی خاص طور پر مجھ سے ملنے ہے۔ میں اور روحینہ گراؤنڈ میں بیٹھ گئے۔ جب کہ وحید دس منٹ بعد ملنے کا کہہ کر باہر چلا گیا۔ میں جانتی تھی وہ سگریٹ پینے باہر گیا ہے۔ ابھی دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ حسین غصے سے لال پیلا ہوتا ہوا میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''تم نے میرے گھر فون کیا تھا؟'' آتے ہی جو پہلا جملہ اس نے کہا وہ یہ تھا میں جھوٹ بول دینا چاہتی تھی مگر میرے منہ سے سچ نکل گیا جسے سن کر اس کے غصے میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''تمہیں شرم نہیں آتی؟ ہو کیا چیز تم؟ عورت ذات کے نام پر دھبا، کیسی تربیت کی ہے تمہارے والدین نے؟ تمہیں ذرا احساس نہیں کیا کرتی پھر رہی ہو تم؟ کیسی آگ دہک رہی ہے تمہارے اندر جو تمہیں سکون نہیں لینے دے رہی۔''

وہ خاموش نہیں ہوا تھا مسلسل بول رہا تھا۔ اردگرد سے لوگ اکٹھے ہونے لگے تھے۔ دور سے وحید بھاگتا ہوا نظر آیا۔ میرے قریب آ کر اس نے صورتِ حال کو سمجھنے میں لمحہ لگایا تھا۔

''تم نے میری زندگی کو عذاب بنا دیا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں تمہیں شوٹ کر دوں۔ میں......''

''صائمہ تم گھر جاؤ۔'' وحید نے مجھ سے کہا جب کہ میں خاموش کھڑی حسین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''صائمہ تم نے سنا نہیں؟ میں کہہ رہا ہوں جاؤ یہاں سے۔'' وہ چلایا میں ابھی بھی ساکت کھڑی تھی۔ روحینہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے وہاں سے کھینچ کر باہر لے آئی۔

○......❖......○

''وہ کہہ رہا تھا تم اس کو پچھلے پندرہ دن سے مسلسل فون کر رہی ہو۔'' وحید بولا وہ خاصے غصے میں تھا۔ ہم S.T.C کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ وہ ہاسٹل میں مجھ سے ملنے آیا تھا لیکن چونکہ وزیٹنگ ڈے نہیں تھا اس لیے ہم ہاسٹل میں نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

''کیا تم سچ مچ اس کو پچھلے پندرہ دن سے فون کر رہی ہو؟'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

''تم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا صائمہ۔'' میرے چہرے سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ حسین نے غلط نہیں کہا۔

''وہ اتنے غصے میں تھا کہ اگر ڈیپارٹمنٹ میں لوگ جمع نہ ہوتے تو شاید ایک آدھ ہاتھ تو وہ جڑ ہی دیتا تمہیں۔ میں نے اتنی مشکل سے اس کے غصے کو ٹھنڈا کیا۔''

''جوس پیو گے وحید؟'' میں نے اس کی توجہ ہٹانی چاہی۔

''صائمہ! یار اس کا فائدہ ہے کچھ؟ تم اس بندے کو حاصل کر ہی نہیں سکتیں۔ تم نے جان بوجھ کر اپنی اہمیت کم کر لی۔ مرد کو وہ عورت کبھی بھی اچھی نہیں لگتی جو بار بار اس کی راہ میں آ کر اسے خود اس کی اہمیت کا احساس دلائے۔ تم نے اس کو انسان رہنے ہی نہیں دیا۔ اس کی پرستش کر کر کے اسے دیوتا بنا دیا ہے۔ وہ کبھی تمہیں اپنے برابر نہیں سمجھے گا کبھی بھی نہیں۔'' وہ بولتے بولتے یک دم خاموش ہوا پھر بولا۔

''وہ تمہیں بہت اچھا لگتا ہے؟'' وہ میرا دوست نہیں تھا میری سہیلی تھی۔ میں اس سے چاہتے ہوئے بھی کچھ چھپا نہیں پاتی تھی۔

''ہاں وحید! وہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ دنیا کے سارے مردوں سے زیادہ اچھا اپنے ابو سے، اپنے اکلوتے بھائی سے، تم سے بھی زیادہ اچھا میں کیا کروں؟ میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی خود بخود ایسا ہو جاتا ہے۔ میں رات کو عہد کر کے سوتی ہوں کہ اس کے متعلق نہیں سوچوں گی مگر جب صبح اٹھتی ہوں تو آنکھ کھلنے کے ساتھ پہلا خیال جس شخص کا آتا ہے وہ حسین احمد ہے۔ لوگ صبح اٹھ کر نماز پڑھتے ہیں کلمے اور درود کی تسبیح کرتے ہیں اور میں حسین احمد، حسین احمد کا ورد کرتی ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے مجھے یہ سب اچھا لگتا ہے۔ بار بار اس سے بے عزتی کروانا، کلاس کے سامنے ذلیل ورسوا ہونا، سب کے سامنے اس کے لیے رونا۔ نہیں وحید مجھے بھی بہت برا لگتا ہے۔ بہت برا لگتا ہے مگر......'' میں رونے لگی تھی۔

''میں نہیں جانتی میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ میں کبھی اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہیں کرتی۔ ہمہ وقت وہ میرے ساتھ ہوتا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے سوتے ہوئے میں اس کو، اس کی موجودگی کو محسوس کرتی ہوں۔ میرے خوابوں میں وہ میرے ساتھ ہوتا ہے ہنستا مسکراتا ہوا مگر جب...... مگر جب حقیقت میں سامنے آتا ہے تو اس کی آنکھوں میں میرے لیے موجود نفرت مجھے اندر تک جھلسا دیتی ہے اور یہ جھلساہٹ اس محبت کو اور بڑھا دیتی ہے جو میرے دل میں اس کے لیے موجود ہے۔ تم بتاؤ وحید اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

آنسوؤں نے پھر ایک دفعہ بے وفائی کی اور اپنا مسکن چھوڑ کر ہوا کے ساتھ ملنے لگے۔

''جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے اور اللہ ہمیشہ بہتر کرتا ہے۔ یہ بات تم نے بتائی تھی نا مجھے ایک کتاب سے پڑھ کر۔'' میں نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ وحید کی طرف دیکھا جو میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلا رہا تھا۔

''اللہ کا قصور ہے سب۔ اس نے میرے دل میں لگن پیدا کی ہے اس کے لیے، خود سے کچھ بھی نہیں ہوا اللہ نے کیا ہے۔ اللہ ہمیشہ میرے ساتھ برا کرتا ہے۔ میں ہمیشہ سے بدنصیب رہی ہوں ہمیشہ سے۔ وہ چاہتا تو میرے دل میں اپنے لیے محبت پیدا کر دیتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ جب ہم اللہ سے محبت کرتے ہیں تو ہمیں دکھ نہیں ہوتا کیونکہ ہمیں احساس ہوتا ہے ہم اس ذات سے محبت کر رہے ہیں جو ہم سے برتر ہے اعلیٰ ہے۔ لیکن جب ہم اپنے جیسے انسانوں سے محبت کرتے ہیں اور وہ بھی یکطرفہ محبت تو یہ ہمیں اندر سے ختم کر دیتی ہے۔ اس سے زیادہ ذلت اور کوئی نہیں۔ انسان دنیا میں سب سے زیادہ کس چیز سے ڈرتا ہے؟ ذلت سے اور میرے مقدر میں ذلت لکھ دی گئی ہے۔ مگر یہ میں نے نہیں کیا اللہ نے کیا ہے؟ اللہ ایسے لوگوں کو دنیا میں پیدا کیوں کرتا ہے جن سے اسے نفرت ہوتی ہے؟''

میں اب خاموش تھی آنسو بول رہے تھے۔

''صائمہ! گڑیا ایسا مت سوچو اللہ کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ وہ کسی کے مقدر میں ذلت نہیں لکھتا۔ ایسے مت کہو گڑیا۔'' میں نے وحید کے گالوں پر کسی چیز کو پھسلتے دیکھا۔ روتی آنکھوں اور گم ہوتے حواسوں کے باوجود میں دیکھ سکتی تھی وہ بھی رو رہا

تھا۔

''حسین مجھ سے نفرت کیوں کرتا ہے؟ اسے میں اتنی بری کیوں لگتی ہوں؟'' میں ایک دفعہ پھر بڑبڑائی۔

''تم یہاں سے اٹھو۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں جانتا ہوں تمہارا علاج کس کے پاس ہے؟'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھڑا کیا پھر ہم S.T.C سے باہر گئے جہاں وحید کی بائیک کھڑی تھی۔ خدا جانے وہ کن کن راستوں سے گزرا اور کتنی دیر میں گزرا۔ جب وہ رکا تو میں نے دیکھا کہ ہم جس جگہ رکے وہاں بے پناہ رش تھا لاتعداد لوگ، امیر غریب کی تخصیص کے بغیر اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ میں اس جگہ کبھی نہیں آئی تھی مگر میں نے اس جگہ کو کئی کئی مرتبہ ٹی وی پر دیکھا تھا۔ ہم 'داتا دربار' کے باہر کھڑے تھے۔

''کیا چاہتی ہو بی بی؟ محبت چاہیے یا عزت؟ زمین پر رینگنا چاہتی ہو یا آسمان پر اُڑنے کی خواہش ہے؟ آدم مانگتی ہو یا اللہ؟'' میں اور وحید اس شخص کے سامنے بیٹھے تھے۔ عجب خوابناک سا ماحول تھا۔ وہ سیاہ ملگجے کرتے میں ملبوس شخص اپنے پُرنور چہرے کے ساتھ بغیر پلکیں جھپکے میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''بولو بی بی! آدم مانگتی ہو یا اللہ؟'' اس نے ایک دفعہ پھر پوچھا ایسے جیسے میں جو مانگوں گی مجھے مٹھی میں پکڑا دے گا۔

''بولتی کیوں نہیں ہو؟ آدم یا اللہ؟'' ایک مرتبہ پھر پوچھا گیا۔

''حسین احمد۔'' مجھے جو چاہیے تھا میں نے کہہ دیا۔ میری خواہش موسموں کا سا وصف نہیں رکھتی تھی کہ دو دو مہینے بعد بدل جاتی۔

''اللہ نہیں چاہیے تمہیں؟'' وہ بولا۔

''اللہ چاہنے سے ملتا ہے؟'' اب کی بار میں نے سوال کیا۔ شاید یہ ماحول کا اثر تھا میری گفتگو میں روانی آ گئی تھی۔

''پھر کیسے ملتا ہے؟''

''اپنی مرضی سے۔ وہ جسے چاہتا ہے اسے ملتا ہے۔ ہماری تمہاری مرضی تو نہیں چلتی اس پر۔ وہ چاہے گا تو یہاں قیام کرے گا۔'' میں نے اپنے دل کی طرف اشارہ کیا پھر اس کے دل کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

''چاہے گا تو یہاں''

میری بات پر وہ جھوم کر بولا۔

''واہ! کیا سچی بات کی ہے۔''

اس کے بعد اس نے منہ ہی منہ میں آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ چند لمحے پڑھتا رہا پھر آنکھیں کھول کر میرے منہ پر پھونک مار کر بولا۔

''تمہاری پرواز نیچی ہے مگر......'' ایک لمحہ کو توقف کیا گیا۔

''بہت اونچی جاؤ گی تم...... راہِ ہدایت تمہیں خود بخود اپنی طرف کھینچ لے گی۔'' جیسے میں راہ ہدایت سے بھٹکی ہوئی کوئی گمراہ لڑکی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''جب اللہ کسی کے دل میں قیام کرنا چاہتا ہے تو پہلے وہاں کسی اور کو ٹھہرا کر دیکھتا ہے کہ وہ زمین اس کی محبت کی فصل کے لیے کس قدر زرخیز ہے۔ پھر وہ وہاں خود قیام کرتا ہے۔ میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے جو اپنے جیسے انسانوں کی محبت

میں پاگل ہوکر اللہ کو پالیتے ہیں۔ عشقِ حقیقی کی چھت پر چڑھنے کے لیے عشقِ مجازی کی سیڑھی استعمال ہوا کرتی ہے۔''

مجھے اس شخص کی باتوں میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں جانتی تھی میرے عشق کا معاملہ وہ ہے ہی نہیں۔ یہ عشقِ حقیقی یا عشقِ حقیقی کی طرف کا راستہ تھا ہی نہیں۔ یہ میرا اور اللہ کا نہیں بلکہ میرا اور حسین احمد کا معاملہ تھا۔ میں بہت اچھی مسلمان نہیں تھی مگر میں جانتی تھی کہ جہاں اللہ ہوتا ہے وہاں سکون ہوتا ہے جہاں اللہ نہیں ہوتا وہاں بے سکونی ہوتی ہے اور میرے پاس بے سکونی ہوتی ہے اور مجھے اس کی پہلی بات سے بھی اتفاق نہیں تھا، بھلا اللہ ایسا کیوں کرے گا کہ کسی شخص کو کسی کے دل میں مقیم کر کے اس دل کی مہمان نوازی کو جانچے۔ اللہ کو تھرو پراپر چینل کام کرنا اچھا لگتا ہے۔ ''اسے'' سہارے اچھے نہیں لگتے کیوں کہ ''وہ'' خود سہارا ہے۔

''یہ پانی ہے میں نے اس میں تعویذ گھولا ہے۔ تم اس کو ہر روز صبح اٹھ کر پیا کرنا۔ خدا تمہارے دل کو سکون دے گا۔'' وہ ایک بوتل میری طرف بڑھا کر بولا۔ میں نے بوتل نہیں پکڑی مگر وحید نے پکڑ لی۔

میری اس حرکت پر وہ جز بز نہیں ہوا تھا بلکہ مسکرا کر بولا۔

''نمازیں پڑھتی ہو؟''

''نہیں.....'' میں نے سچ بولا۔

''اگر میں تمہیں کہوں کہ نمازیں پڑھا کرو تو کیا تم میری بات مان لوگی؟'' وہ پھر پوچھ رہا تھا۔

''نہیں۔'' میں نے اب بھی سچ بولا۔ وہ شخص اب کھل کے مسکرایا اور کہنے لگا۔

''آج.....صرف آج نمازِ عشاء ادا کرنا یہ سوچ کر کہ اس نماز کو پڑھنے سے تمہیں حسین احمد ملے گا۔ بولو پڑھو گی نا؟''

''ہاں.....'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا پھر سچ مچ اس روز میں نے نمازِ عشاء ادا کی اور دعا کرتے ہوئے گڑگڑا کر رب سے صرف حسین احمد کو مانگا تھا۔

ظاہر ہے مجھے حسین احمد نہیں ملا مگر اس رات بہت عرصے بعد میں سکون کی نیند سوئی۔ پھر اس کے بعد پتا نہیں کیسے خود بخود میری عادت بن گئی۔ میں پانچوں نمازیں پڑھنے لگی۔ میں خود نہیں کرتی تھی ہو جاتا تھا اور ہر نماز کے بعد دعا میں حسین احمد کا نام بھی میں نہیں لیتی تھی خود بخود لیا جاتا تھا۔



''کیسی ہو صائمہ؟'' آواز پر میں نے مڑ کر دیکھا وہ مقدس تھی۔ مقدس مجھ سے سینئر تھی اور فرسٹ سمسٹر میں میری روم میٹ ہوا کرتی تھی پھر اس کی ڈگری کمپلیٹ ہوئی تو وہ واپس اپنے شہر نارووال چلی گئی تھی۔ میں اسے دیکھ کر قدرے حیران ہوئی پھر گلے مل کر اپنے روم میں لے آئی۔

''میں لائبریری سکیورٹی واپس لینے آئی ہوں۔'' میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ وہ بہت عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی جس سے خائف ہو کر میں نے کہا۔

''مجھے ایسے کیوں دیکھ رہی ہو مقدس؟''

''مجھے کسی نے بتایا تھا تم بہت بدل گئی ہو اور آج دیکھ کر مجھے یقین آگیا ہے تم بہت بدل گئی ہو۔''

''تمہیں غلط فہمی ہوگئی ہے کوئی۔'' میں نے ہنس کر ٹالنا چاہا مگر وہ آسانی سے ٹلنے والوں میں سے نہیں تھی۔ وہ مجھ سے اِدھر اُدھر کے سوالات کرتی رہی پھر یک دم بولی۔

''کتنے عرصہ سے مبتلائے عشق ہو؟''

اس سوال پر میں کچھ بھی چھپا نہ پائی۔ میں کیا کرتی مجھ میں اپنا آپ چھپا لینے والی لڑکیوں والی خصوصیت تھی ہی نہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں کھلی کتاب تھی۔

''مجھے معاف کردو صائمہ پلیز مجھے معاف کردو۔'' میری ساری بات سن کر مقدس میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

مجھے اس کی بات سن کر حیرت ہوئی۔

''تم نے کیا کیا ہے مقدس؟''

''صائمہ میں نے تمہیں بددعا دی تھی۔ میں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ وہ تمہارے دل میں کسی کے لیے اتنی لگن ڈال دے اتنی لگن دے کہ تم اس کے پیچھے پاگل ہو جاؤ اور اس شخص کے دل میں تمہارے لیے اتنی نفرت ڈال دے کہ وہ تمہیں دیکھنا بھی پسند نہ کرے۔ میں نے گڑگڑا کر خدا سے تمہارے لیے یہ سب مانگا تھا۔''

''مگر کیوں مقدس؟ میں نے تو کبھی تمہارے ساتھ برا نہیں کیا۔ کبھی بھی نہیں۔'' اس کی بات سن کر مجھے دکھ ہوا تھا۔

''تم نے برا نہیں کیا تھا۔ بلکہ تم نے اچھا کیا تھا مگر تمہارا اچھا کرنا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ تم نے میرے ساتھ بھلائی کی تھی جو مجھے پسند نہیں آئی تھی۔''

''تم کب کی بات کر رہی ہو مقدس؟''

''تمہیں یاد ہے وہ واصف بٹ۔ مجھے اس شخص سے کتنی محبت تھی۔ میں تقریباً ہر روز اس سے ملنے جایا کرتی تھی اور تم مجھے روکا کرتی تھیں۔ میرے پیرنٹس میری شادی کہیں اور کرنا چاہتے تھے مگر میں واصف کے سوا کسی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ پھر جب ایک روز میرے منگیتر نے مجھے بائیک پر واصف کے ساتھ بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ تمہیں یاد ہے نا جب میری باجی میرے متعلق پولیس آفیسر کی طرح تفتیش کرنے آئی تھیں۔ تو سب سے پہلے تم نے انہیں میرے متعلق بتایا تھا۔ وہ بھی پُرتحقیر انداز میں، تب تمہیں بہت فخر ہوتا تھا اس بات پر کہ تم دوسری لڑکیوں سے مختلف ہو جو لڑکوں کے پیچھے نہیں بھاگتیں جو کسی لڑکے میں انٹرسٹڈ نہیں ہے جو محبت کو کاربکراں قرار دیتی ہے۔ میرا واصف سے ملنا جلنا بند کر دیا گیا تھا اور میری کڑی نگرانی ہوتی تھی۔'' وہ ایک ایک واقعہ دہرا رہی تھی اور میں شرمندگی سے سن رہی تھی۔

''تب ایک روز جب میں نے بہ آواز بلند روتے ہوئے اس کمرے میں خدا سے واصف کو مانگا تھا تو یاد ہے تم نے کیا کہا تھا؟'' وہ لمحہ بھر کو رکی۔ میرا سر مزید جھک گیا۔

''تم نے کہا تھا صائمہ! کہ''

''مقدس بی بی خدا تم پر کبھی کرم نہیں کرے گا اس کے پاس فرصت نہیں کہ ٹکے ٹکے کے لوگوں کے ٹکے ٹکے مول بکتے عشقیہ مسائل کو سلجھاتا پھرے۔''

تمہارا لہجہ اس قدر طنزیہ تھا، اتنی تحقیر سے کہا تھا تم نے۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی صائمہ۔''

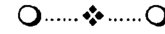
وہ رو رہی تھی۔ مجھے سب یاد آگیا ایک ایک لفظ۔ مجھے یاد آگیا مقدس نے کہا تھا۔

''اللہ کرے صائمہ تمہیں کسی سے محبت ہو جائے تب تمہیں احساس ہوگا کہ یہ کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اللہ کرے کبھی تم کو بھی رب سے کسی انسان کو گڑگڑا کر مانگنا پڑے اور رب تمہیں ساری دنیا دیتا ہو مگر وہ شخص نہ دیتا ہو۔ تب صائمہ! تب تمہارا دل اس کیفیت کو محسوس کرے گا جو میرے دل کی ہے۔''

اور میں نے مقدس کی بات سن کر نخوت سے سر جھٹک کر قہقہہ لگایا تھا۔ مجھے آج احساس ہوا تھا کہ میں اس لمحے کی قید میں تھی۔ خدا نے اپنے کسی خاص کیمرے سے وہی لمحہ قید کرلیا تھا جس میں، مَیں قہقہہ لگا رہی تھی اور میرا سر غرور سے تنا ہوا تھا جب کہ مقدس رو رہی تھی اور اس کا سر اللہ کے آگے جھکا ہوا تھا۔ مجھے پتا لگا تھا کہ رب اپنے بندوں کی دلیلوں کی سچائی کو پرکھنے کے لیے کبھی کبھی اس قسم کی کیفیات کا نزول کر ہی دیا کرتا ہے اور پھر انسان کو وہ کام بھی کرنے پڑتے ہیں جن کے متعلق اس نے کبھی دعوے سے کہا ہوتا ہے کہ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ پھر اس کے بعد شمار کرنے کے لیے صرف پچھتاوے رہ جاتے ہیں۔

میرے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ داتا دربار پر اس شخص نے میری حالت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ یہ عشقِ حقیقی نہیں تھا، عشق مجازی نہیں تھا۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے یہ کیا تھا؟ میں نے مقدس کو ساتھ لگایا اور ہم مل کر آنسو بہانے لگے۔

''میں خدا سے دعا کروں گی کہ وہ تمہیں اس لمحہ کی قید سے آزاد کردے۔'' اگلی صبح جاتے ہوئے مقدس نے کہا تھا۔



میں نے گاڑی پارک کر کے گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ نو بجنے میں صرف اٹھائیس منٹ رہ گئے تھے۔ خدا جانے وہ کس طرف بیٹھی تھی کہ نظر ہی نہیں آ رہی تھی حالانکہ میں نے اس کو تاکید کی تھی کہ پچھلے گیٹ کی طرف ملنا۔ وہ پچھلے گیٹ پر نہیں ملی تو میں مین گیٹ کی طرف آ گیا۔ گیٹ بند ہونے میں صرف اٹھائیس منٹ تھے اور مجھے ابھی اسے تلاش کرنا تھا۔ پچھلے دو سالوں کا حساب دینا تھا اسے۔ اس سے معافی مانگنی تھی اور اسے بتانا تھا کہ میں بدل گیا ہوں۔

میں نہیں جانتا تھا یہ تبدیلی مجھ میں کیسے آئی؟ مجھے تو اس لڑکی سے چڑ ہوتی تھی بیزار رہتا تھا میں اس سے پھر آخر ایسا کیا ہوا کہ میں نے خود اس سے ملنے کے لیے کہا۔ کتنا حیران ہوئی تھی وہ میرا فون سن کر اور خوش بھی شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ میں ہوں حسین احمد جو اس کی انسلٹ کرتا رہا ہے دل دکھاتا رہا ہے۔ پتا نہیں اسے میری بات کا یقین بھی آیا تھا کہ نہیں۔ میں نے اسے فون پر کچھ بتایا بھی تو نہیں تھا سوائے اس کے کہ شرمندہ ہوں اور اس سے ملنا چاہتا ہوں وہ فوراً تیار ہو گئی تھی۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ اب بھی میرے لیے اتنی ہی پاگل تھی جتنی کہ دو سال پہلے۔ لیکن دو سال پہلے کم از کم مجھے اس سے بہت چڑ محسوس ہوتی تھی۔

میں گیٹ سے اندر داخل ہو کر تاریکی میں اسے ڈھونڈنے لگا۔ پچھلے دو سال بہت تیزی سے مجھے یاد آنے لگے تھے۔

میری اس سے پہلی ملاقات پوائنٹ میں ہوئی تھی۔ وہ اپنی کتاب میرے پاس بھول گئی تھی۔ میرا سیکنڈ سمسٹر ڈراپ ہو گیا تھا اور میں اسی سلسلے میں سر مغیث سے بات کرنے جا رہا تھا۔ گاڑی ورکشاپ میں تھی سو میں نے پوائنٹ سے جانے کا فیصلہ کیا۔ اصغر بھی میرے ساتھ تھا۔ وہ بہت نیکوکار بیبا قسم کا بچہ تھا۔ صائمہ کو کھڑا دیکھ کر وہ فوراً میری ساتھ والی سیٹ سے اٹھا اور اس کے لیے جگہ خالی کر دی۔

وہ اچھی پُراعتماد لڑکی تھی شکریہ یہ کہہ کر بیٹھ گئی۔ دس نمبر کے آگے وہ تو اُتر گئی اور میں اور اصغر انگلش ڈیپارٹمنٹ آ گئے جہاں سے اصغر کو اپنی بہن کے لیے Linguistic کے شارٹ کورس کے متعلق معلومات چاہیے تھیں ہمیں وہاں دیر ہو گئی۔ سو ہم نے سر مغیث سے کچھ دن بعد ملنے کا پروگرام بنایا اور گھروں کو واپس آ گئے۔ ظاہر ہے کتاب میرے پاس ہی تھی۔ صائمہ کے ساتھ یہ پہلی ملاقات بے حد سرسری تھی مگر وہ مجھے پُراعتماد لڑکی لگی تھی۔ دوسری ملاقات میں خدا جانے کیا ہوا اچھی بھلی لڑکی ایک ابنارمل طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتی محسوس ہوئی۔

سر مغیث ہمیں کلاس میں لے کر آئے تو میری سب سے پہلی نگاہ اس پر پڑی کیونکہ وہ خاص لڑکیوں والے انداز میں ہل ہل کر اپنی گود میں پڑے نوٹس کا رٹا لگا رہی تھی۔ اس نے ایک دفعہ بھی سر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اس کے اس طرح ملنے پر ہنسی آئی مگر میں نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم تینوں پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئے۔ کلاس آف ہوئی تو وہ اور ایک لڑکا لیکٹرن کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ تب مجھے سمجھ آئی وہ دونوں کلاس ریپ تھے اور ہم لوگوں کو ویلکم کہہ رہے تھے۔

فیضان نے ہم تینوں کے نام لے کر ساری کلاس سے متعارف کروایا مگر صائمہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے احساس ہوا وہ اپنی کتاب کو لے کر پریشان ہو گی۔ اس کے دیکھنے کا انداز بے حد عجیب تھا۔ اس کے اس طرح دیکھنے پر ساری کلاس شور مچانے لگی تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی پھر باہر نکل گئی۔ مجھے ابھی بھی یہ حرکت بری نہیں لگی بلکہ میں مسکرایا تھا۔ لیکن جب باہر جا کر میں نے اس کی کتاب اسے دی تو جانے کیا ہوا مجھے اس سے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی۔ وہ عجیب طرح سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بالکل پتھرائی ہوئی تھیں جیسے کسی نے اسے مسمرائز کر دیا ہو۔ اس کے ساتھ کھڑی لڑکی نے دو تین بار اسے ٹوکا مگر وہ اسی۔ ''ٹن'' کیفیت میں کھڑی رہی۔ اس کے اس طرح دیکھنے پر میں ہی شرمندہ ہو کر واپس چلا آیا۔

میں کوئی نیک پارسا انسان نہیں تھا۔ میری ایک وقت میں چار چار لڑکیوں سے چکر بازی چلا کرتی تھی۔ میں لڑکیوں سے الرجک بھی نہیں تھا لیکن پتا نہیں کیوں مجھے صائمہ نزہت علی اچھی نہیں لگتی تھی حالاکہ وہ خاصی خوب صورت تھی۔ اسٹائلش تھی کانفیڈینٹ تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود مجھے اس سے نفرت محسوس ہوتی تھی۔ شاید یہ اس وجہ سے تھا کہ وہ مجھے دیوانوں کی طرح تکا کرتی تھی۔ میں نے اپنے تمام افیئرز ڈیپارٹمنٹ سے ہمیشہ دور رکھے تھے کیونکہ مجھے ریپوٹیشن کی بہت پروا رہتی تھی مگر اس لڑکی کی ان حرکتوں کی وجہ سے مجھے اور اس لے کر عجب سی چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ تب ہی مجھے اس لڑکی سے اور بھی نفرت محسوس ہوئی۔

اس روز مسز شمسہ کی کلاس میں اس نے اتنی مضحکہ خیز حرکت کی۔ اس لمحے جب میڈم نے مجھے اپنی طنزیہ نگاہوں سے گھور کر دیکھا تو میرا دل چاہا صائمہ نزہت علی کو کچا چبا جاؤں۔ میڈم نے مجھے اپنے آفس میں بلا کر میری ٹھیک ٹھاک کلاس لی۔ وہ میرے بارے میں پہلے ہی کچھ مشکوک رہا کرتی تھیں اس لڑکی نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ اس کے کچھ دن بعد اس نے میرے یہاں کال کیا۔ گھر والوں نے مجھے بتایا کہ ایک لڑکی دو تین مرتبہ فون کر چکی ہے۔ میری تمام فرینڈز میرے موبائل پر کال کیا کرتی تھیں اس لیے مجھے حیرت سی ہوئی مگر جب ڈنر کے وقت اس نے دوبارہ کال کیا تو مجھے پتا چلا کہ یہ صائمہ صاحبہ ہیں۔ میں نے غصے سے اسے صبح ڈیپارٹمنٹ میں بات کرنے کے لیے کہا اور لائن ڈسکنیکٹ کر دی۔

''آپ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہیں؟'' میں نے اسے خاصے غصے سے کہا مگر وہ سر جھکا کر بیٹھی رہی۔ اس لمحے وہ مجھے بہت معصوم لگی۔ فیضان نے مجھے بہت تفصیل سے اس کے متعلق بتایا تھا۔ میں نے سوچا پاگل سی لڑکی ہے شاید میری نصیحت سے سنبھل جائے اسی لیے میں نے اسے سمجھانا چاہا لیکن میری باتوں پر وہ سر جھکا کر بیٹھی رہی۔ مجھے عجیب سی کوفت ہو رہی تھی۔ اس دوران جب اس نے ایک دفعہ نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا تو پھر مجھے کچھ ہو گیا۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں کچھ عجیب سی بات تھی جو مجھے غصہ دلا دیتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی بدولت مجھے اس سے نفرت سی محسوس ہوتی تھی اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں دیوانگی سی جھانکتی تھی۔ جب وہ مجھے دیکھتی تھی تو مجھے لگتا تھا میں کوئی مٹھائی کی ڈلی ہوں جسے وہ ندیدوں کی طرح دیکھ رہی ہے۔ بس یہی چیز مجھے مزید تاؤ دلا دیتی۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

میں نے اسے خوب خوب سنائیں پھر اس کی سہیلی اسے وہاں سے لے گئی۔ جب وہ میری نظروں کے سامنے سے ہٹ گئی

تو مجھے لگا جیسے میں خود کسی چیز کے زیر اثر تھا اور اس کے جاتے ہی وہ اثر ختم ہو گیا ہو۔

گریجویشن کے دوران میں نے انگلش کی ایک کہانی پڑھی تھی جس میں کہانی بیان کرنے والے کو اپنے ایک دوست کی آنکھوں سے بے پناہ نفرت محسوس ہوتی تھی اور کہانی کے آخر میں وہ اپنے دوست کو اسی وجہ سے قتل کر دیتا ہے۔ مجھے لگا اگر میں نے دوبارہ اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو شاید میں بھی اسے قتل کر دوں گا۔

اس کے بعد وہ ذرا سدھر ہی گئی۔ میرے راستے میں آنا، تنگ کرنا اس نے تقریباً ترک ہی کر دیا تھا۔ ہم سب پڑھائی میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کی کلاس میں میری فیضان سے بہت بنتی تھی وہ صائمہ میں انٹرسٹڈ تھا۔ ظاہر ہے صائمہ کی حرکتوں سے اسے بھی خبر ہو گئی تھی کہ وہ مجھ میں انٹرسٹڈ ہے۔ کلاس کے بعد ہم سب M.T.E کی طرف نکل جاتے اور صائمہ کا خوب خوب مذاق اڑاتے۔ سب سے آگے فیضان ہوتا۔ اس میں ہمارا قصور تھا ہی نہیں۔ مرد کبھی اس عورت کی عزت نہیں کر پاتا جو اس طرح سے اپنا آپ ہمہ وقت عیاں کرتی رہتی ہو۔ مجھے تو اس سے اتنی نفرت ہوتی تھی کہ دل چاہتا اس کی شکل ہی نہ دیکھوں۔

میں نے سارے ڈیپارٹمنٹ میں مشہور کر دیا تھا کہ میں انگیجڈ ہوں اور اس خبر کے اڑنے کے بعد صائمہ نزہت علی جب نظر آئی اس نے میری طرف دیکھنے سے احتراز کیا۔ یہ اس کے لیے ہی بہتر ثابت ہوا کیونکہ کم از کم میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر دوبارہ وہ کوئی ایسی حرکت کرے گی تو میں اس پر ہاتھ اٹھا بیٹھوں گا۔ مجھے خود بھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ مجھے اس سے اتنی نفرت کیوں ہے۔ حالانکہ وہ تو میرے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کر سکتی تھی شاید......شاید عزت بھی اور اسی بات نے مجھے اس سے متنفر کر دیا تھا۔ مرد کی فطرت عقابی ہوتی ہے اسے چھین جھپٹ کر کھانا اچھا لگتا ہے پلیٹ میں پڑی چیز کھانا کوّے کی عادت ہوتی ہے عقاب کی نہیں۔

لیکن ایک اور وجہ بھی تھی اس کی طرف مائل نہ ہونے کی اور وہ وجہ تھی شینا۔ وہ میری محبت تھی۔ میری خالہ کی بیٹی شینا اور میں بچپن سے انگیجڈ تھے لیکن اس فیصلے پر عملدر آمد کرنا یا نہ کرنا ہم پر منحصر تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اپنے اپنے دائروں میں اپنے اپنے طریقے سے انجوائے کرنے کے باوجود ہم شادی ایک دوسرے سے ہی کرنا چاہتے تھے۔ میرا خیال ہے لوگ اس جذبے کو ہی محبت کہتے ہیں یعنی میں شینا سے محبت کرتا تھا مگر مجھے اس چیز کا زیادہ احساس صائمہ سے مل کر ہوا تھا۔

سمسٹر آف ہوا، ایگزامز ختم ہوئے پھر انٹرن شپ اسٹارٹ ہو گئی۔ ابو جان کی وجہ سے اور کچھ ڈائریکٹر صاحبہ کی وجہ سے میں آواری میں انٹرن شپ کر رہا تھا۔ ابو چاہتے تھے کہ انٹرن شپ کے فوراً بعد میں بڑے بھیا کے پاس ناروے چلا جاؤں۔ ہمارا بزنس روز بروز زوال کا شکار ہو رہا تھا۔ ابو کا خیال تھا میں اور بڑے بھیا مل کر اپنے کاروبار کی طرف دھیان دیں اگرچہ ہم خاصی زرعی اراضی کے مالک تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ میرے والد ایک مخصوص پولیٹیکل اسٹیٹس رکھنے کے باوجود بزنس ٹائیکون کا ٹائٹل کھونا نہیں چاہتے تھے۔ انٹرن شپ کے بعد رپورٹ اور وائیو کے ختم ہوتے ہی میں ناروے چلا گیا۔

دو ماہ بعد ہی میں ناروے سے لوٹ آیا۔ ابو کی اور شینا کے پاپا کی زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ مسئلہ شاید جائیداد کا ہی تھا۔ دونوں خاندانوں کے سفارتی تعلقات ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ اب میں شینا سے آزادانہ نہیں مل سکتا تھا۔ اس سے ملنے کے لیے مجھے جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ ایک روز میں امی سے جھوٹ بول کر شینا کے یہاں گیا ہوا تھا۔ میرا موبائل شینا کے پاس تھا جب اس کی بیپ بجنے لگی۔ کسی لڑکی کا فون تھا شینا کی عادت تھی وہ میری گرل فرینڈز سے کبھی کبھی چڑ جاتی تھی۔ وہ اس لڑکی کو میری کوئی نئی گرل فرینڈ ہی سمجھی مگر جب میں نے موبائل پکڑ کر اس سے بات کرنا چاہی تو وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے بھی چند

منٹ انتظار کرنے کے بعد اُکتا کر موبائل آف کر دیا مگر پھر یہ روز کی روٹین بن گئی۔ میں دن میں کتنی ہی مرتبہ اپنے موبائل پر ایسی خاموش کالیں ریسیو کرنے لگا جو پی سی او سے کی جاتی تھیں۔ میں خود حیران ہوتا تھا کہ ایسا میرا کون سا مہربان پیدا ہو گیا جو صبح و شام اتنی باقاعدگی سے مجھے یاد کرتا ہے۔

جب میں نے گھر میں سرسری سا ذکر کیا تو امی نے بتایا کہ انہوں نے ایک لڑکی کو میرا موبائل نمبر دیا تھا۔ امی ہنستے ہوئے کہنے لگیں۔

''وہ لڑکی کہہ رہی تھی کہ تم اپنی منگیتر کے ساتھ ہو یا اکیلے ہی کنسرٹ میں گئے ہو؟''

ظاہر ہے شینا لوگوں کے ساتھ لڑائی کے بعد یہ سلسلہ تو ختم ہو کر رہ گیا تھا امی کا دھیان اس طرف کیسے جا سکتا تھا۔ میرے ذہن میں امی کی بات سن کر جو پہلا نام آیا وہ صائمہ نزہت علی کا ہی تھا کیونکہ اس نے ایک مرتبہ پہلے بھی میرے یہاں کال کرنے کی کوشش کی تھی جب کہ کوئی اور لڑکی اتنی جراٗت نہیں کر سکتی تھی کہ میرے گھر فون کرلے۔ موبائل کی بات دوسری تھی اس کی اجازت میں نے اپنے فرینڈز کو خود دے رکھی تھی۔

اس روز میں نے پھر ایک خاموش کال ریسیو کی، میں بے انتہا غصے میں تھا۔ میری شینا کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی۔ شینا کے تیور بدلے بدلے سے نظر آنے لگے تھے وہ اپنے ایک اور کزن کو مجھ سے زیادہ اہمیت دینے لگی تھی۔ اس کا وہ کزن قومی کرکٹ ٹیم میں سلیکٹ ہوا تھا اس چیز نے شینا کے دل میں اس کی اہمیت کو بہت بڑھا دیا تھا۔ میں اس سے ملنے گیا تو وہ اسی کے ساتھ بیٹھی بہت بے تکلفی سے قہقہے لگا رہی تھی۔ ہم لوگ خود جو مرضی کریں مگر اپنی عورتوں کے معاملے میں انتہا کے غیرت مند ہوتے ہیں۔

میں نے شینا کو تو کچھ نہیں کہا مگر جب اس کے کزن نے خوامخواہ فری ہونے کی کوشش کی تو میں نے اس کی ٹھیک ٹھاک انسلٹ کر دی جس پر شینا کو غصہ آ گیا اور اس نے مجھے اپنے گھر سے نکل جانے کے لیے کہا۔ اسی دوران موبائل کی بیپ گنگنائی تھی۔ میں شینا کے گھر سے نکل آیا اور اب میرا رخ نیو کیمپس کی طرف تھا۔ ان دنوں فورتھ سمسٹر والوں کی ایک اسپیشل کلاس ہوتی تھی جو شام میں ہوتی تھی۔ میں بہت غصے میں کیمپس گیا تھا۔ صائمہ مجھے گراؤنڈ میں بیٹھی نظر آئی اپنی غلیظ پتھرائی ہوئی ندیدی آنکھوں کے ساتھ، میرا غصہ مزید بڑھ گیا۔ مجھے یاد نہیں میں نے اسے کیا کہا مگر جو بھی کہا تھا بے حد تلخ تھا۔ شینا کا غصہ کسی اور پر برس گیا تھا۔

''تم میرے سامنے نہ آیا کرو حسین مجھے تم سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔'' اسی شام میں دوبارہ شینا سے ملنے اور ایکسکیوز کرنے گیا تو اس نے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو شینا؟'' میں نے بہت جذب سے کہا تھا۔

''پلیز حسین! میری طرف ایسے مت دیکھو۔ مجھے تمہاری آنکھوں سے الجھن ہوتی ہے تمہاری آنکھوں میں عجیب سی بے حسی نظر آتی ہے مجھے پلیز تم چلے جاؤ یہاں سے۔'' وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ میں اس کی بات سن کر ششدر رہ گیا۔

''تمہیں میری آنکھیں کیسی لگ رہی ہیں شینا؟'' میں جیسے کراہا تھا۔

''غلیظ پتھرائی ہوئی، خوفناک جیسے...... جیسے پلیز حسین مجھ سے مت پوچھو بس تم یہاں سے چلے جاؤ۔'' وہ خود بھی کچھ تاسف زدہ دکھائی دیتی تھی۔ میں تھکے تھکے قدموں سے باہر آ گیا۔ گھر آ کر میں نے کتنی دیر باتھ روم کے آئینے میں اپنی

آنکھوں کو جانچا تھا۔ وہ بالکل بھی ویسی نہیں لگ رہی تھیں جیسی شینا نے کہا تھا بلکہ میری آنکھیں تو ٹھیک ٹھاک تھیں بالکل فریش پہلے جیسی، مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا شینا نے ایسا کیوں کہا۔ اس رات پہلی مرتبہ میں بے سکونی کی نیند سویا۔ ساری رات وقفے وقفے سے میری آنکھ کھلتی رہی اور جتنی دیر میں سویا خواب میں دو خوفناک آنکھوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔

پھر اس کے بعد میں حسین احمد نہیں رہا سرتا پا بدل گیا۔ میں نے دیوانوں کی طرح شینا کا پیچھا لے لیا لیکن وہ مجھ سے اتنی ہی الرجک رہنے لگی تھی۔ پہلے مجھے شینا سے اتنی محبت نہیں تھی ہاں میں اسے چاہتا تھا اس سے شادی کرنا میری اولین خواہشوں میں سے ایک خواہش تھی مگر ایسی صورتِ حال بھی نہ تھی کہ میں اس کے پیچھے مجنوں ہو جاتا لیکن اب مجھے لگتا کہ میں اس کے بغیر مر جاؤں گا۔ اندر ہی اندر اس سے بچھڑنے کا خیال مجھے آری کی طرح کاٹتا رہتا۔ امی ابو میری حالت دیکھ کر پریشان رہنے لگے تھے۔ پھر میں نے ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لیے شینا کے گھر گئے مگر وہاں ان کی خوب تذلیل ہوئی۔ اس تذلیل نے بھی میرے اندر شینا کے لیے بھڑکتی آگ کو سرد نہیں ہونے دیا۔ میں مسلسل اس کے گھر جاتا اور بے عزتی کروا کر مردہ قدموں سے واپس آ جاتا حتیٰ کہ ایک روز خود شینا نے میرے منہ پر کہا۔

''حسین احمد جب تم اپنی ان آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہو تو میرا دل چاہتا ہے تمہارے چہرے پر تھوک دوں۔''

یہی آنکھیں کبھی اسے بہت پسند تھیں۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا وہ اتنی کیسے بدل گئی ہے۔ مگر یہ سچ تھا وہ بدل گئی تھی۔ اس کی بات سن کر یک دم مجھے یاد آیا کہ یہ بات میں نے بھی ایک دفعہ کسی کو کہی تھی۔ مجھے یہ یاد نہیں آیا کہ یہ بات میں نے کبھی کس کو کہی تھی۔ اس رات میں ایک دفعہ پھر بے سکون تھا۔ میری آنکھوں سے بے وجہ آنسو بہہ رہے تھے اور میں خود کو یقین دلا رہا تھا۔

''نہیں یہ آنسو نہیں ہیں مجھے زکام ہو گیا ہے۔''

''کیسے ہو حسین؟'' آواز پر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ فیضان تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران ہو گیا۔

''یہ تم نے اپنی حالت کیا بنالی ہے؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

''کچھ نہیں کچھ بھی تو نہیں۔'' اس کی بات پر میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ مگر وہ بضد رہا کہ میں اسے اپنی ٹینشن کی وجہ بتاؤں۔ مجھے بھی ایک رازداں کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے اپنے اور شینا کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔

''تمہیں صائمہ نزہت یاد ہے حسین؟'' ساری بات سننے کے بعد اس نے پوچھا بھی تو کیا۔ میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

''وہ بھی تو یہی کہتی تھی۔ ایسی ہی حرکتیں کرتی تھی جیسی تم کر رہے ہو اور تم بھی اس کی آنکھوں کے متعلق ایسے ہی کہتے تھے جیسے شینا تمہاری آنکھوں کے متعلق کہتی ہے۔''

اس کی بات پر مجھے سچ مچ وہ لڑکی یاد آ گئی۔ مجھے احساس ہوا لڑکی میرے لیے ایسی ہی دیوانی تھی جیسا میں شینا کے لیے تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں چپ چاپ فیضان کے پاس سے اٹھا اور گھر آ گیا۔ اس کے بعد میری یہی روٹین بن کر رہ گئی۔ میں صبح کو گاڑی لے کر نکلتا شہر کی خاک چھانتا، مارا مارا پھرتا اور رات کو گھر آ کر بستر میں گھس کر آہیں بھرتا رہتا۔ اسی طرح چھ ماہ گزر گئے۔

شینا کی شادی کا کارڈ میرے ہاتھوں میں تھا اور میں اپنے کمرے میں بیٹھا زار زار رو رہا تھا۔ پچھلے کچھ ماہ میں مجھ میں بے شمار تبدیلیاں آئی تھیں۔ میں چاہتے ہوئے بھی زندگی کے معمولات میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ میری امی دن میں کتنی مرتبہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر شینا اور اس کی فیملی کو بددعائیں دیتی تھیں لیکن مجھے شینا یا اس کی فیملی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ مجھے احساس ہو گیا تھا

کہ بغیر کسی سبب کے یہ سب نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس روز صائمہ نزہت علی بہت یاد آئی۔ میں نے اصغر سے بات کی جس کی منگنی صائمہ کی دوست روحینہ سے ہوئی تھی۔ روحینہ کی انٹرن شپ چل رہی تھی اور اس کے بعد اس کی شادی متوقع تھی۔ اصغر نے روحینہ سے مجھے صائمہ کا نمبر لے کر دیا اور اس روز پہلی مرتبہ میں نے صائمہ کو خود فون کیا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ میں ہوں۔

''یقین کریں صائمہ! یہ میں ہی ہوں حسین احمد۔'' میں نے مردہ لہجے میں کہا۔

''کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہوں آپ کی مہربانی سے۔'' اس نے کہا۔ میں نہیں جانتا یہ طنز کرنا اس نے اب سیکھا تھا یا پہلے سے اس فن سے آشنا تھی۔

''کیا کر رہی ہیں آج کل؟'' میں نے پوچھا۔ مجھے لگا جواب میں اس نے کہا ہے ''دعائیں'' مگر یہ میری غلط فہمی تھی وہ کہہ رہی تھی۔

''انٹرن شپ کر رہی ہوں۔''

''کہاں سے؟''

''پی سی سے۔'' اس نے مشہور ہوٹل کا نام لیا۔

''Stipends دے رہے ہیں؟'' میں نے ایک اور سوال کیا میں اس سے بے تکلفی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ہاں تھوڑا بہت دے دیتے ہیں۔''

''صائمہ! میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے ایک دم سے کہہ دیا۔ پتا نہیں اسے برا لگا تھا یا اچھا مگر میں نے کہہ دیا۔

وہ چند لمحے بعد بولی۔

''کہاں؟'' میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ اس نے ''کیوں'' نہیں کہا تھا۔

''وہ آپ خود ڈیسائیڈ کر لیں۔'' میری بات سن کر وہ کہنے لگی۔

''برکت مارکیٹ کی K.F.C والی برانچ میں آ جائیں یا پھر مون مارکیٹ میں میکڈونلڈز ہے یا پھر شریف پارک میں مل لیتے ہیں۔''

''گلشن اقبال پارک کیسا رہے گا؟'' میں نے کہا تو وہ بولی۔

''ٹھیک ہے۔''

''میں سات بجے آ جاؤں گا پچھلے گیٹ کی طرف......'' وہ اثبات میں جواب دے کر فون بند کر کے چلی گئی تھی۔ مجھے چند ضروری کام نمٹانے تھے۔ میں نے ساڑھے چھ بجے تک وہ کام نمٹائے لیکن اس کے بعد گلشن اقبال پارک تک پہنچنے میں ٹریفک کا ایک جمِ غفیر تھا جس کا سامنا مجھے کرنا پڑا۔ سوا سات کے قریب میں پچھلے گیٹ پر تھا مگر وہ نہیں تھی میں خاصی دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ سوا آٹھ بجے کے قریب میں نے سوچا کہ ایک دفعہ مین گیٹ کی طرف بھی دیکھ لوں لیکن وہ یہاں بھی نظر نہیں آئی تھی۔ میں اس سے شکایت بھی نہیں کر سکتا تھا میں نے اس کے ساتھ جتنا برا کیا تھا اس کے جواب میں مجھے اس سے یہی توقع کرنی چاہیے تھی۔ میں نو بجے تک انتظار کرنا چاہتا تھا شاید وہ آ جاتی۔ نو بجنے میں دس منٹ رہ گئے تھے۔ میں نے آگے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

○.....❖.....○

نو بجنے میں دس منٹ رہ گئے تھے۔ میں ماضی کا سفر کرتی تھک گئی تھی سو حال میں پلٹ آئی۔ آج جب حسین نے خود مجھے فون کیا تو مجھے یقین ہی نہیں آیا تھا میری حالت بے قابو ہو گئی تھی مگر اس کے باوجود میں نے خاصا سنبھل کر اس سے بات کی میں فارغ ہو چکی تھی۔ مجھے سب کچھ چھوڑ کر چلے جانا تھا مگر میں نے اس سے کہا کہ میری انٹرن شپ چل رہی ہے اگر میں یہ کہہ دیتی کہ میں فارغ ہو چکی ہوں تو شاید وہ مجھ سے کبھی ملنے کی بات نہ کرتا۔ مقدس سے ملنے کے بعد مجھے بھی اپنی حالت کی بنیادی وجہ وہی سمجھ میں آئی تھی جو مقدس نے بیان کی تھی۔

اس نے مجھ سے جدا ہوتے وقت کہا تھا کہ۔

''صائمہ میں دعا کروں گی کہ خدا تمہیں اس لمحہ کی قید سے آزاد کر دے۔''

مگر شاید اس کی دعا قبول ہی نہیں ہوئی تھی کیونکہ میں ابھی تک اسی لمحہ کی قید میں تھی آزادی میرے مقدر میں لکھی ہی نہیں گئی تھی شاید۔ حسین احمد پہ مجھے کبھی غصہ نہیں آتا تھا، آج بھی نہیں آرہا تھا حالانکہ میرا دل کہہ رہا تھا اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا حالانکہ میں نے پچھلے چھ ماہ سے اسے کبھی فون کال تک نہیں کی تھی۔ دن رات اس سے ملنے کی دعا کی تھی مگر ایک دفعہ بھی اس کے راستے میں نہیں آئی تھی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور گیٹ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ میں مایوس ہو گئی تھی۔ جب میں چلتے ہوئے گیٹ کی طرف آئی تو وہاں مجھے ایک ہیولا نظر آیا۔ لمحہ لگا تھا پہچاننے میں وہ حسین تھا۔ میں نے اسے آواز دی۔ وہ ایک دم مڑا اور تاریکی اور زیادہ فاصلے کے باوجود میں نے اس کی آنکھوں میں بجلیاں کوندتے دیکھیں۔

ان بجلیوں نے مجھے اپنے حصار میں لیا تھا اور ایک دم...... ایک دم وہ ہوا جس کی دعا میں نے کی تھی۔ جس کی دعا مقدس نے کی تھی جس کی دعا میرے ہر خیر خواہ نے کی تھی۔ مجھے اپنا آپ بے حد ہلکا لگا۔ میں...... میں آزاد ہو گئی تھی۔

وہ میرے پاس آ گیا۔ اس کے قدموں میں لرزش اور چال میں شکستگی تھی۔ وہ میرے پاس آ کر کہنے لگا۔

''میں سمجھا تھا آپ نہیں آئیں؟''

''میں بھی یہی سمجھی تھی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور میری مسکراہٹ نے اسے حیران کیا۔

''میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔'' وہ زمین پر بیٹھ گیا میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ گیٹ بند ہونے میں صرف نو منٹ تھے۔ اس نے کہنا شروع کیا وہ مجھ سے نفرت کرتا تھا اسے کسی اور سے محبت تھی کسی اور کو اس سے نفرت ہو گئی اور اب وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ اسے میری آنکھوں سے نفرت تھی کسی اور کو اس کی آنکھوں سے نفرت ہو گئی اور اب اسے میری آنکھیں اچھی لگ رہی تھیں۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔

''مرد روتے ہوئے کتنا گندا لگتا ہے۔'' میں نے سوچا اس کے آنسوؤں نے مجھے سکون بھی دیا تھا۔ مجھے اس کے آنسوؤں میں اور اپنے اب تک کے بہائے گئے آنسوؤں میں بے حد مماثلت محسوس ہوئی۔ میں اس کے لیے روئی تھی وہ کسی اور کے لیے رو رہا تھا۔ میرے قدموں میں اس کی وجہ سے لرزش تھی اور اس کے قدموں میں کسی اور کی وجہ سے۔

وہ کہتے کہتے روتے روتے خاموش ہو گیا۔ اس کے محبت کا کشکول خالی تھا اور میرے پاس دینے کے لیے ہمدردی کا ایک سکہ بھی نہیں تھا۔

''صائمہ! مجھ سے شادی کریں گی۔ میں اپنے ناروا سلوک کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔''

مجھے اس سوال کی ہمیشہ سے آرزو رہی تھی لیکن آج جب اس نے یہ سوال کیا تو مجھے خود بھی پتا نہیں لگا اور میں نے انکار کر دیا۔

''میں نے کبھی آپ سے شادی نہیں کرنا چاہی حسین...... آج بھی میں آپ سے اس لیے ملنے آئی ہوں کہ آپ کی کچھ چیزیں مجھے واپس کرنی ہیں۔''

میں نے بہت اطمینان سے کہا پھر اس کی ایک فوٹو گراف جو میں نے بہت مشکل سے حاصل کی تھی اور وہ تمام کارڈز جو میں نے مختلف ایونٹس پر اس کے لیے خریدے تھے اس کے آگے رکھ دیئے۔ وہ حیران حیران میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''آپ نمازیں پڑھتے ہیں؟'' میں نے پوچھا تو اس نے نفی میں جواب دیا۔

''آج گھر جا کر نماز عشاء ادا کیجئے گا اور اپنے لیے سکون کی دعا مانگئے گا۔''

''آپ ایسا کریں گے نا؟'' میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر میں وہاں ایک لمحہ بھی نہیں رکی۔ گیٹ بند ہونے میں صرف چند سیکنڈ رہ گئے تھے میں تیزی سے گیٹ سے باہر آ گئی جب کہ وہ وہیں بیٹھا تھا۔ تھکا ہوا شکست خوردہ میں جانتی تھی وہ جلد سنبھل جائے گا کیونکہ اس کے چاہنے والے مجھ سے زیادہ تھے اور پھر وہ کسی بد دعا کے زیر اثر تو نہیں تھا۔

چلتے چلتے ایک شخص میرے پاس سے گزرا۔

''آپ کی آنکھیں بہت خوب صورت ہیں۔''

اس کی بات پر میں کھلکھلائی تھی اور میں نے آگے بڑھتے ہوئے دل میں تہیہ کیا تھا کہ اب میں کسی کا مذاق نہیں اڑاؤں گی اور خاص طور پر محبت کرنے والوں کا مذاق تو کبھی نہیں اڑاؤں گی کیونکہ ایسے لوگوں کے دل میں سچ مچ خدا رہتا ہے۔ یہ لوگ بہت خالص ہوتے ہیں ان کا مذاق کبھی نہیں اڑانا چاہیے۔ آپ بھی ایسا مت کیجئے گا۔

○......ختم شد......○